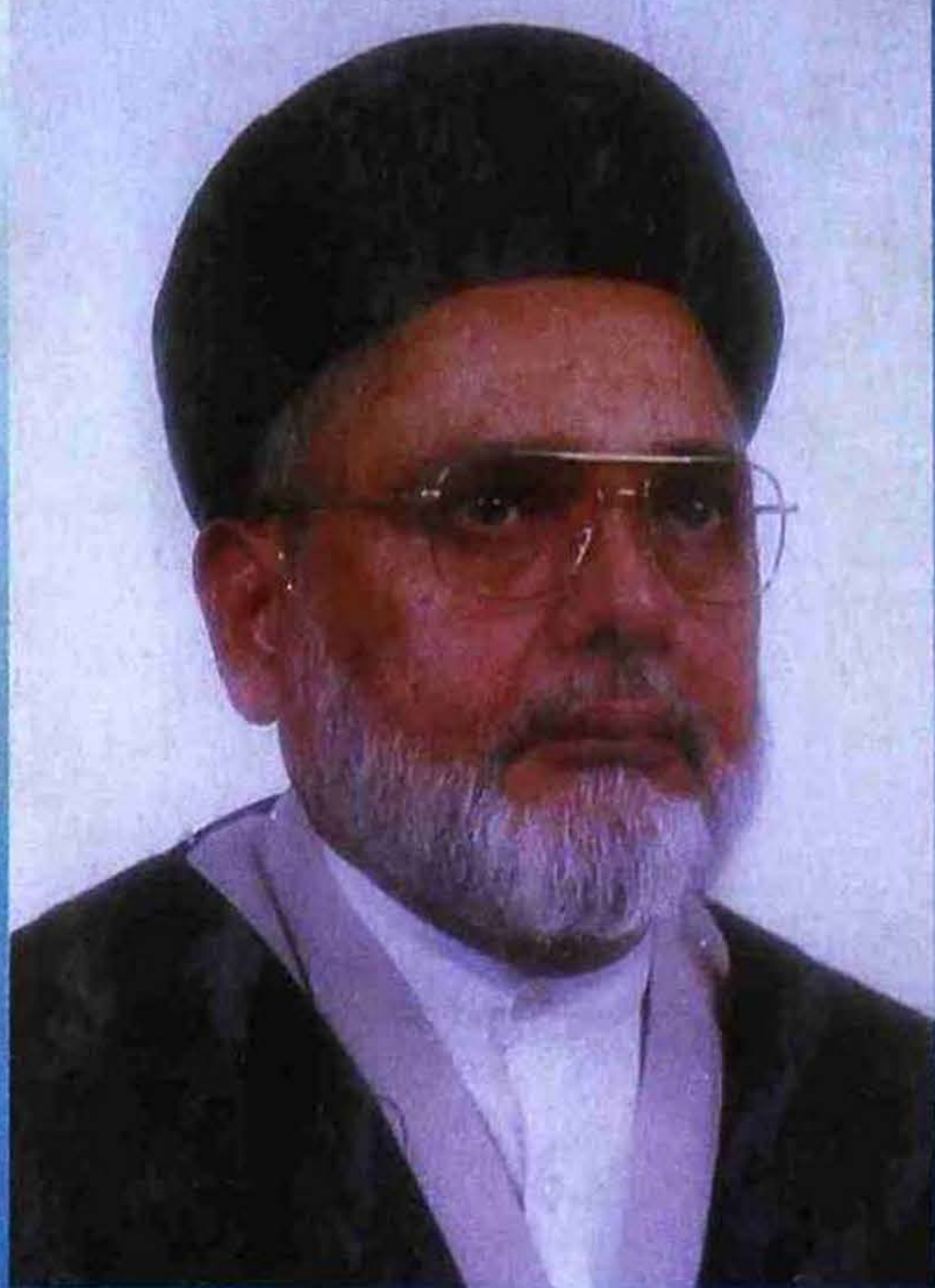
خُلقِ عظیم

ذیشان مجالس



علامہ السید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ

خُلقِ عظیم

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ



نام کتاب : خلقِ عظیم
مؤلف : علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
ناشر : عصمہ پبلیکیشنز کراچی
تعداد اشاعت : 500
تاریخ اشاعت : اگست ۲۰۰۲ء
طباعت : عاصم پرنٹنگ، ناظم آباد نمبر ۲ کراچی
سپر ڈیلکس ایڈیشن : پہلا ایڈیشن
ھدیہ : 100 روپیہ
مشیر قانون : پروفیسر سید سبطِ جعفر زیدی ایڈوکیٹ
جناب شبّر رضوی ایڈوکیٹ، (ہائی کورٹ)
سرورق (ٹائٹل ڈیزائننگ) : سید امتیاز عباس



افتخار بک ڈپو۔ اسلام پورہ کرشن نگر۔ لاہور
مکتبہ الرضا۔ ۸ بیسمنٹ میاں مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
رحمت اللہ بک ایجنسی کھارادر۔ کراچی
حسن علی بک ڈپو۔ کھارادر۔ کراچی
محفوظ بک ایجنسی۔ مارٹن روڈ۔ کراچی
عباس بک ایجنسی۔ رستم نگر۔ لکھنؤ
خراسان بک سینٹر بریٹو روڈ۔ کراچی
احمد بک ڈپو۔ رضویہ سوسائٹی۔ کراچی
زیدی بک اسٹال۔ خراسان کراچی
سید محمد ثقلین کاظمی جی 6/2۔ اسلام آباد
محمد علی بک ڈپو دھمیال کیمپ، راولپنڈی
سودے بکس لائبریری اینڈ اسٹیشنرز۔ سکردو۔ بلتستان
مکتبہ علویہ مرکز تبرکات وتحائف رضویہ سوسائٹی۔ کراچی

فہرست مجالس

سید جواد حیدر رضوی
مدیر جامعہ امامیہ انوار العلوم
۳۹۔ مرزا غالب روڈ۔ الہ آباد۔

S. Jawad Haider Rizvi
Principal
JAMIA IMANIA ANWARUL ULOOM
39, Mirza Ghalib Road, Allahabad - 211 003 • Ph.
Residence : D-19, Kareli Colony, Allahabad - 211 016 • Ph.

اجازت نامہ

جناب محترم سید ایوب نقوی صاحب

مدیر عصر پبلیکیشنز کراچی پاکستان

سلام علیکم

امید ہیکہ بفضلہ تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔

والدعلام سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ سے انکی تصنیفات و تالیفات کو شائع کرنے کیلئے مولانا سید ظفر عباس صاحب قبلہ کی موجودگی میں انکی حیات میں گفتگو ہوئی تھی اس گفتگو کے پس منظر میں آپ کو اجازت دی جاتی ہے کہ والدعلام طاب ثراہ کی جملہ تصنیفات و تالیفات کو پاکستان میں شائع کر سکتے ہیں یہ اجازت آپ کے ادارہ عصر پبلیکیشنز کیلئے مخصوص و محدود ہے۔

جناب ایوب نقوی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص انفرادی طور پر یا کوئی ادارہ آپ کی اجازت کے بغیر والدعلام سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ کی تصنیفات و تالیفات کو شائع نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی صاحب یا ادارہ اسکی خلاف ورزی کرتا ہے تو عنداللہ مسئول ہوگا اور جناب ایوب نقوی صاحب کو قانونی چارہ جوئی کرنے کا مکمل حق حاصل ہوگا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ
سید جواد حیدر رضوی
ابن علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
۲۴ر دسمبر سنہ ۲۰۰۰ء

S.J.H. Rizvi

افتتاحی مجلس

اہمیتِ قلم

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔

نٓ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے یہ لوگ لکھ رہے ہیں۔ پیغمبر آپ اپنے پروردگار کی نعمت کی بنا پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپ کے لیے وہ اجر رکھا گیا ہے جس کا سلسلہ منقطع ہونے والا نہیں ہے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی آپ دیکھ لیں گے اور یہ الزام لگانے والے بھی دیکھ لیں گے کہ دونوں میں کون مجنون ہے اور کون صاحبِ عقل۔

بعد مرکز کے افتتاح کے ساتھ جو سلسلۂ بیانات آج سے شروع ہو رہا ہے ان بیانات کا عنوان "فضائل اور رذائل" ہے۔

انسانی زندگی کے لیے وہ کون سی خوبیاں ہیں جنھیں انسان کو اختیار کرنا چاہئے اور کون سی برائیاں ہیں جن سے انسان کو پرہیز کرنا چاہئے۔ انھیں دونوں کا مجموعہ ہے جسے اخلاق کہا جاتا ہے۔

اخلاق ان صفتوں کا نام ہے جو انسان کے نفس کی گہرائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہی صفتیں اگر بہترین اور قابل تعریف ہیں تو انھیں فضائل کہا جاتا ہے اور یہی صفتیں اگر بدترین اور قابل مذمت ہیں تو انھیں کو رذائل سے یاد کیا جاتا ہے۔

میں اس سلسلہ میں اپنے معروضات آئندہ بیانات میں آپ کے سامنے گذارش کروں گا آج تمہیدی طور پر قرآن مجید کی ان آیاتِ کریمہ کے بارے میں چند باتیں گذارش کرنا چاہتا ہوں جو سورہ قلم کی آیتیں ہیں اور بعض اقوال کی بنا پر سورۂ نون یا سورہ نون والقلم کی آیات ہیں۔

اس سورہ کو تین ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض افراد نے اس کا نام سورہ نون رکھا ہے اس لیے کہ سورہ کا پہلا حرف نون ہے۔ بعض حضرات نے اس کا نام سورۂ قلم رکھا ہے اور بعض روایات میں اس کا نام سورہ نون والقلم ہے۔

اس سورہ میں جن باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سات قسم کے مسائل ہیں اور سارے مسائل وہ ہیں جن کا تعلق سرکارِ دو عالمؐ کی مکّی زندگی سے ہے اس لیے کہ بہرحال اتنا آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ سرکارِ دو عالمؐ نے اپنے دورِ تبلیغ میں تیرہ سال کی زندگی مکہ مکرمہ میں گذاری ہے اور ہجرت کے بعد دس سال مدینہ منورہ میں گذارے ہیں۔ حضرت کی زندگی کے پہلے حصہ کا نام مکی زندگی ہے اور دوسرے حصہ کا نام مدنی زندگی ہے۔ حضور کی حیاتِ طیبہ کی تقسیم کے اعتبار سے قرآن مجید کی آیات اور قرآن مجید کے سورے بھی تقسیم ہو گئے۔ وہ سورے اور آیات جو حضور کی مکی زندگی میں نازل ہوئیں ان آیات کا نام مکّی آیات اور سوروں کا نام مکی سورہ ہے اور وہ آیات یا سورہ جو سرکار کی مدنی زندگی میں نازل ہوئے ہیں ان سوروں کو مدنی سورہ کہا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض روایات میں مکی سورتوں میں بعض مدنی آیتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور مدنی سوروں میں بعض مکی آیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی علمائے تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ یہ سورہ مکی ہے مگر اس میں بعض آیتیں وہ ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں یا یہ سورہ اگرچہ مدنی ہے مگر اس میں بعض آیات وہ ہیں جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کا راز آپ حضرات میری گذشتہ تقاریر سے محسوس کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کی ترتیب کا انتظام سرکارِ دو عالمؐ نے یہ قرار دیا تھا کہ حضور نے پہلے امتِ اسلامیہ کو باخبر کیا کہ یہ کتاب الٰہی جو مجھ پر دھیرے دھیرے نازل ہونے والی ہے تم تک پہنچانے کے لیے اور اس کا نزول ایک شب مبارک قدر میں ہو چکا ہے اِنَّا اَنزَلنَاہُ فِی لَیلَةِ القَدرِ پروردگار نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے

مگر یہ نزول امّت کے لیے نہیں تھا یہ نزول سرکارِ دو عالم کے لیے تھا یعنی لوح محفوظ سے قلب مبارک پیغمبرؐ پر جس کے بعد آیات کا سلسلہ نزول ہوتا رہا اور سرکارِ دو عالم ان آیات کی تبلیغ کرتے رہے اور قوم کو سناتے رہے۔

ان دونوں نزولوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ قرآن مجید نازل ہوا تو وہ نزول سرکارِ دو عالم کی ذمّہ دارانہ حیثیت کا اعلان تھا جو پروردگار نے حضورؐ کو روزِ اول سے عنایت فرمائی تھی۔ کیونکہ پیغمبرؐ کو اللہ نے عالم کتاب اور عالم قرآن بنا دیا تھا لہٰذا سرکارِ دو عالم کو یہ معلوم تھا کہ آج جو آیۂ کریمہ نازل ہوئی ہے اس آیت کے پیچھے مزید کتنی آیات اور آنے والی ہیں کہ اگر پیغمبرؐ کی جگہ پر ہم آپ جیسا کوئی انسان ہوتا یا جو انسان تھے ان کے سامنے جب آیۂ کریمہ پڑھی گئی۔ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ تو انھوں نے یہ چند آیاتِ مبارکہ سن لیں مگر انھیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ آیات کس سورہ کا حصّہ ہیں اور نہ یہ معلوم تھا کہ اس کے بعد کتنی آیتیں اور آنے والی ہیں جن کے مجموعہ کا نام سورہ رکھا جائے گا مگر چوں کہ پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب کو اس نزول سے پہلے اپنی کتاب کا مکمل علم عطا کر دیا تھا لہٰذا دنیا میں کسی کو معلوم ہو یا نہ معلوم ہو حضور کو یہ معلوم تھا کہ الٓمّٓ سے جو سلسلۂ آیات شروع ہوا ہے۔ یہ دو سو چھیاسی آیتوں تک قائم رہے گا یا دوسرے سورہ کی پہلی آیت جو نازل ہوئی ہے اس کا سلسلہ مثلاً دو سو آیات تک رہے گا۔ فلاں کا سلسلہ چالیس آیات تک رہے گا۔ فلاں سورہ کا سلسلہ پچاس آیات تک رہے گا۔ یہ دنیا میں کسی کو معلوم نہیں تھا اگر معلوم تھا تو اس پیغمبرؐ کو معلوم تھا جس کے قلب پر مالکِ کائنات نے قرآن مجید نازل کیا اور اسی علم کی بنیاد پر سرکارِ دو عالم نے ترتیب قرآن کا ایک نظام معین کر دیا تھا کہ جب کوئی آیت کسی سورہ کی ابتدائی آیت نازل ہوئی تو حضور نے قوم کو آگاہ کر دیا۔ کہ ایک آیت ہے یا دو آیتیں ہیں یا چار آیتیں ہیں مگر بات یہیں پر تمام نہیں ہوتی ہے۔ یہ سورۂ توحید نہیں ہے۔ یہ سورۂ کوثر نہیں ہے۔ یہ سورۂ نصر نہیں ہے جو چند آیتوں پر تمام ہو جائے۔ اس کے بعد آیات کا ایک سلسلہ ہے۔ لہٰذا اپنے ذہن میں ایک

خانہ بنا کر رکھ لو۔ میں دھیرے دھیرے آیتیں تمہیں بتاتا رہوں گا۔ اور ان آیتوں کو انھیں خانوں کے اندر لکھتے رہنا یا محفوظ کرتے رہنا جس دن وہ ساری آیتیں مکمل ہو جائیں گی میں تمہیں بتا دوں گا کہ آج یہ سورہ مکمل ہو گیا۔ اب اس کے بعد کوئی آیت آئے گی تو اس کی جگہ کسی اور سورہ میں ہوگی۔

اسی لیے علمائے تفسیر اور علمائے قرآن نے اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ آیات کے نزول کے بعد کاتبانِ وحی کو یہ بتایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں رکھنا ہے۔ اس آیت کو فلاں مقام پر رکھنا ہے اس لیے کہ دنیا میں کسی کو آیت کا مقام نہیں معلوم تھا صرف صاحبِ قرآن کو یہ مقام معلوم تھا اس لیے اگر کسی وقت مصلحتِ الٰہی یہ ہوئی کہ وہ سورہ جو مجموعی طور سے مکی سورہ بنا ہے اس میں کوئی ایک آیت موضوع کی مناسبت سے یا حالات کی مناسبت سے مدینہ میں نازل ہونے والی رکھ دی جائے تو سرکارِ دو عالمؐ نے کاتبانِ وحی کو ہوشیار کر دیا کہ اب تک جو آیتیں تم نے جمع کی ہیں یہ آیتیں اگرچہ مکہ کی ہیں اور یہ ایک آیت آج مدینہ میں نازل ہوئی ہے مگر اس کو اسی مقام پر رکھنا ہے جہاں مکی آیتیں رکھی گئی ہیں یا کوئی آیت مکہ میں نازل ہوئی تو حضورؐ ان سب آیات کو اسی آیت کے ساتھ لکھواتے رہے یہاں تک کہ ایک آیت مکہ کی تھی اور باقی ساری آیتیں مدینہ کی تھیں لہٰذا سورہ کا نام مدنی ہو گیا۔ آیت اس کے اندر بہر حال مکہ والی بھی ہے۔ یہ ایک پورا سلسلۂ کلام ہو جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ ان حقائق کو آپ نگاہ میں رکھیں تاکہ بہت سی غلط فہمیاں جو پیدا ہو گئی ہیں یا شاید آئندہ پیدا ہونے والی ہیں۔ ان کا آج ہی تدارک اور علاج ہو جائے۔

تو ایسے امکانات واقعاً پائے جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر سورہ میں اکثر و بیشتر آیات مدینہ والی ہوں اور دو چار آیات مکہ والی ہوں ——— تو آیتیں مکی ہی رہیں گی اگرچہ سورہ کا نام مدنی ہی ہوگا۔ اس لیے آپ جب بھی پڑھیں گے تو قرآن مجید کے بارے میں یہ تفصیل آپ کو قرآن میں بھی مل جائے گی اور تفاسیر میں بھی مل جائے گی کہ یہ سورہ مکی ہے اگرچہ ایک آیت اس میں مدنی ہے یا یہ سورہ مدنی ہے اگرچہ اس میں چار آیتیں مدنی بھی پائی جاتی ہیں۔

اس نکتہ کو آپ ذہن میں رکھیں یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جو اسی مقام پر حل ہو جائے گا۔

یہ سورۂ مبارکہ جس کی آیات کی میں نے تلاوت کی ہے اور جس کو آئندہ گفتگو کے لیے عنوان کلام قرار دیا ہے یہ سورۂ مبارکہ مکی سورہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا ہے مگر میری گفتگو سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بعض آیات وہ ہوں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور یہ بھی امکان ہے کہ سورہ بھی مکی ہو آیتیں بھی سب مکی ہوں مگر پروردگار عالم نے اکثر اوقات ان مضامین کا اعلان کر دیا ہے جو اس وقت پیش نہیں آئے تھے مگر بعد میں پیش آنے والے تھے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں ایسے مضامین رہیں اور جب وہ صورتحال پیش آجائے تو قوم کے لیے واقعہ اجنبی نہ رہے اور صورتحال نئی نہ ہو۔ قوم پریشان نہ ہو جائے۔

یہ بھی ایک مصلحت الٰہی تھی جس کا جا بجا پتہ قرآن مجید کی آیات سے ملتا ہے اور وہ لوگ جانتے ہیں جو ان مسائل کے پڑھنے کے عادی ہیں یا ان مسائل کے بارے میں تحقیق کرتے رہتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد آیئے قرآن مجید کی ان آیات اور ان الفاظ کا جائزہ لیں۔

قسم ہے قلم کی اور اس تحریر کی جو یہ لوگ لکھتے ہیں اور لکھا کرتے ہیں۔

سورہ نازل ہوا مکہ میں اور جس زمانہ میں سرکارِ دو عالمؐ مکہ میں ان آیات کی تلاوت کر رہے تھے تو مکہ کی علمی صلاحیتوں کا کل عالم یہ تھا کہ سارے مکہ میں کل ملا کر بیس آدمی بھی پڑھے لکھے نہیں تھے۔ شہر چھوٹا نہیں تھا۔ علاقہ مختصر نہیں تھا۔ دس پانچ آدمیوں کی بستی نہیں تھی۔ سو پچاس آدمیوں کا گاؤں نہیں تھا۔ مکہ اس دور میں بھی اتنی بڑی بستی کا نام تھا کہ اس کو ام القریٰ کہا جاتا تھا۔ مگر اتنی بڑی بستی میں اتنی بڑی آبادی میں سرکارِ دو عالمؐ کے دور میں جو لکھنا جانتے تھے پڑھنا جانتے تھے۔ ان کا کل عدد بیس کے برابر بھی نہیں تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ جس قوم میں بیس پڑھے لکھے نہ پائے جاتے ہوں جس قوم میں دس پانچ قلم اٹھانا نہ جانتے ہوں جس قوم کے بازار میں قلم کا وجود نہ ہو جس قوم کے انسانوں کے پاس قلم نہ ہو۔ اس قوم کے سامنے پروردگار قلم کی قسم کھائے اور کثرت سے لکھنے کی اور کتابت کی قسم کھائے۔ یہ قوم کیا جانے

کہ قلم کیا ہے؟ یہ قوم کیا جانے کہ کتابت کیا ہے؟ یہ قوم کیا جانے کہ نوشتہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے تو کھجور کی قسم کھائی جا سکتی تھی اس کے سامنے اونٹ کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ اس کے سامنے گھوڑے کی قسم کھائی جا سکتی تھی کہ یہ کھجوروں کی قدر جانتے تھے۔ یہ اونٹوں کی قیمت جانتے تھے یہ گھوڑوں کی اہمیت جانتے تھے یہ کیا جانیں کہ قلم کی قیمت کیا ہے انھیں کیا معلوم کہ کتابت کا وزن کیا ہوتا ہے مگر ایسے اجنبی جاہل اور جاہلیت زدہ ماحول میں پروردگار عالم نے قلم کی قسم کھا کر ذہنوں کو جھنجوڑ دیا مزاجوں کو چونکا دیا۔ آج تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ قلم کیا ہے۔ کل آنے والی قومیں، آنے والی نسلوں کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کی نگاہ میں ہر چیز کی کتنی ہی اہمیت ہو ہماری نگاہ میں اگر کوئی چیز قسم کھانے کے قابل ہے تو وہ قلم ہے۔ صلوات۔

یہ قلم جسے تم نے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ قلم جسے تم چلانا نہیں جانتے ہو۔ یہ قلم جس کی قدر و قیمت سے تم ناآشنا ہو۔ یہ قلم جس کی اہمیت کو تم نہیں جانتے ہو آج نہیں تو کل تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہ قلم کس قیمتی شے کا نام ہے۔ یہ قلم کتنی اہم چیز ہے اور یہ قلم اس امتِ اسلامیہ کے لیے یا ان لوگوں کے واسطے کوئی نئی شے نہیں ہے جس کا لوگوں کو اندازہ نہ ہو سکے۔

میں اس سلسلہ کو چند لفظوں میں آپ کے سامنے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ اصل موضوع کی وضاحت انشاء اللہ آئندہ کروں گا۔

آپ بہچانیں آج دوسری مرتبہ زبانِ قدرت پر یہ لفظ قلم آیا ہے نٓ وَالْقَلَمِ قسم ہے قلم کی قسم ہے تحریر کی قسم ہے کتابت کی، قسم ہے ان چیزوں کی جنھیں یہ لوگ لکھ رہے ہیں۔ یہ پہلا واقعہ نہیں ہے جب پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ جب پہلی مرتبہ نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور پہلا سورہ سورہ اقراء کی شکل میں نازل ہوا تھا اقراء باسم ربک الذی خلق - خلق الانسان من علق اقراء وربک الاکرم الذی علّم بالقلم علّم الانسان مالم یعلم سرکارِ دوعالم محو عبادت ہیں۔ سرکار ذکر و فکر کی منزلوں سے گذر رہے ہیں۔ حضور اپنے مالک سے مناجات کر رہے ہیں کہ ایک مرتبہ ملک وحی اوّل لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا اقراء باسم ربک الذی خلق اس پروردگار کا نام لیکر

جو پیدا کرنے والا ہے۔ میرے حبیب پڑھو، کون پروردگار خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ جس نے انسان کو علق سے پیدا کیا ہو۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ آپ کا پروردگار اکرم ہے بزرگ ہے، اجلہ ہے ارفع و اعلیٰ ہے۔ کون پروردگار ہے اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ وہ خدا جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے (وحی اول میں دو باتیں ہی نظر آئیں) اِقْرَاْ اور بِالْقَلَمِ انسانی زندگی میں علم کا دارومدار انھیں دو لفظوں پر ہے۔ آج جو بھی عالم ہے۔ آپ کی زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی پڑھا لکھا ہے اور یہی اس کے عالم ہونے کا معیار ہو۔ یہی اس کے کمال کا معیار ہے۔ ساری صفتوں میں سب سے بڑی صفت کا نام ہے علم اور اس علم کی تعبیر ہمیشہ ان دو لفظوں سے کی جاتی ہے۔ پڑھا لکھا یعنی علم کے دو شعبے ہیں۔ ایک کا نام ہے پڑھنا اور ایک کا نام ہے لکھنا۔ اسلام دین علم تھا لہٰذا پہلے ہی ان دو لفظوں کی تعلیم دے دی اقراء کہہ کر بتایا کہ یہ پڑھنے کا علم ہو اور بالقلم کہہ کر بتایا کہ یہ لکھنے کا علم ہے (صلواۃ)

وحی اول میں اقراء اور بالقلم استعمال کر کے پروردگار عالم نے سارے مکہ اور سارے معاشرہ کے ذہنوں کو چونکا دیا کہ اب جو پیغام آیا ہے یہ لکھنے پڑھنے والا ہے یہ جاہلوں کا پیغام نہیں ہے۔ یہ جاہلوں کا پیغام نہیں ہے۔ یہ پڑھے لکھوں کے واسطے ہے یہ دنیا کو پڑھانے لکھانے کے لیے آیا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ پروردگار نے انسان کو وہ سب کچھ بتا دیا جو انسان کو نہیں معلوم تھا مگر کیسے بتا دیا اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ پروردگار عالم نے تعلیم کا ذریعہ قلم کو قرار دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نگاہ قدرت میں روز اول سے جتنی اہمیت قرأت اور پڑھنے کی ہے۔ پڑھو اس پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس پروردگار عالم نے علم دیا ہے اور قلم کے ذریعہ دیا ہو۔ گویا ایک مسئلہ ہے قرأت کا اور ایک مسئلہ ہے کتابت کا۔ ایک مسئلہ ہے پڑھنے کا اور ایک مسئلہ ہے لکھنے کا۔ پڑھنے کا کوئی ذریعہ بیان نہیں کیا ہے لیکن لکھنے کے ذریعہ کا ذکر آگیا ہے اس لیے کہ پڑھنے کا نام سب جانتے تھے۔ لکھنے سے دنیا آشنا نہیں تھی لہٰذا پروردگار نے کہا کہ ہم نے اپنے بندۂ خاص کو جو علم دیا ہے وہ علم قلم کے ذریعہ دیا ہے۔ نہیں معلوم تھا دنیا کو کہ علم میں قلم کا کیا دخل ہے۔ میں تقریر کر رہا ہوں۔ آپ سن رہے ہیں۔ میں بیان کر رہا ہوں

آپ متوجہ ہیں اور آپ کے سامنے یہ ساری باتیں پہنچ رہی ہیں مگر مسئلہ پڑھنے کا ہے اور سننے کا ہے یہاں درمیان میں تکلم کا کیا کام ہے۔ مگر عزیزو سب جانتے ہیں کہ پرانے زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ جو بات کہی جاتی تھی وہ فضا میں اڑ جاتی ہے مگر جو بات لکھی جاتی ہے وہ باقی رہتی ہے مگر اس بیسویں صدی میں یہ محاورہ بھی غلط ہے۔ اس بیسویں صدی کے دور میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ اڑ جاتی ہے بلکہ جو بات کہی جاتی ہے وہ بھی محفوظ رہتی ہے یہ ٹیپ ریکارڈ گواہ ہیں، یہ ریڈیو گواہ ہیں۔ یہ ٹی وی گواہ ہیں۔ یہ آلات گواہ ہیں کہ جو بات زبان سے نکلتی ہے وہ کہیں اڑ جاتی ہے نہ کہیں ضائع ہوتی ہے نہ کہیں برباد ہو جاتی ہے بلکہ یہ بھی محفوظ ہو جاتی ہے یہ بھی اپنے مقام پر رہتی ہے آلات کے ذریعہ، اسباب کے ذریعہ، وسائل کے ذریعہ مگر اس کے بعد بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ ان آلات کے ایجاد سے پہلے جتنی آوازیں تھیں سب فضا میں اڑ گئیں۔ اگر یہ وسائل کل پیدا ہو گئے ہوتے تو کیا آج سرکار دو عالم کی زبان سے قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہم نہ سن لیتے اگر مکہ میں یہ وسائل موجود ہوتے جو آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں تو آج ہمارے کانوں میں سرکار دو عالم کی آواز گونجتی قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ میں آپ کے سامنے ایک انتہائی جذباتی فقرہ کہنے جا رہا ہوں کاش اس دور میں دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہوتی اور یہ وسائل جو آج پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ٹی وی اس دن پیدا ہو گیا ہوتا ٹیپ ریکارڈ اس دن پیدا ہو گیا ہوتا تو ہم اپنے کانوں سے سن بھی لیتے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیتے اور ہم ان کے جیسے نہ ہوتے جنھوں نے سنا بھی اور دیکھا بھی لیکن آج جب ہم پیغام سنا رہے ہیں نہ تو کسی کی سمجھ میں آتا ہے اور نہ کوئی ماننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ کل اگر کوئی ویڈیو بن گیا ہوتا تو ہم دنیا کے سامنے منظر عام پر لا کر رکھ دیتے۔ اگر آنکھیں ہیں تو اب دیکھ لو سرکار کے ہاتھوں پر کون ہے۔ اگر کان ہیں تو اب سن لو حضور کیا نعرہ دے رہے ہیں مَن کُنتُ مَولَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَولَاہُ مگر کل یہ وسائل نہیں تھے۔ یعنی کل کے اعتبار سے آوازیں فضا میں منتشر ہو گئیں اور محفوظ نہ ہو سکیں مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ جس دور میں آوازیں اڑ رہی تھیں فضا میں منتشر ہو رہی تھیں، ضائع ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کا محفوظ کرنے والا کوئی نہیں تھا

لیکن وہ پیغام ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا مَن کنتُ مولاہ فھٰذا علی مولاہ۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضور مکہ کی گلیوں میں کہہ رہے تھے قولوا لا الہ الا اللہ لیکن یہ سب ہم تک کیسے پہنچا۔ اگر خالی آواز ہوتی فقط قرأت ہوتی پڑھنا ہوتا، بولنا ہوتا اور درمیان میں قلم نہ آیا ہوتا تو ساری تعلیمات منتشر ہو کے رہ جاتیں۔ یہ فقط ایک قلم کی برکت تھی کہ سارا قرآن محفوظ رہ گیا۔ ساری حدیثیں محفوظ رہ گئیں۔ ساری تاریخ محفوظ رہ گئی۔ سارے واقعات محفوظ رہ گئے۔ کل والوں نے اندازہ نہیں کیا تھا کہ قلم کی اہمیت کیا ہے؟ اگلی نسلوں نے محسوس کیا کہ اگر کل قلم نہ ہوتا تو آج کے حال کا ماضی سے کوئی رابطہ نہ ہوتا۔ ہم کو ماضی سے کس نے جوڑا؟ ہم کو ماضی کے سو سال پرانے واقعات سے کس نے جوڑا؟ ہم کو پچاس ہزار سال پرانے واقعات کس نے جوڑا؟ فقط ایک قلم ہے۔ یہ اگر درمیان میں نہ ہوتا تو حال کا ماضی سے کوئی رشتہ نہ ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ آج اس دنیا میں تاریخ لکھی جاتی ہے تو واقعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

یہ ماقبل تاریخ کا واقعہ ہے۔ یہ تاریخ کا واقعہ ہے

ماقبل تاریخ کے معنی کیا ہیں۔ کون سا دن تھا جب تاریخ نہیں تھی۔ اگر دن تھا تو تاریخ بھی تھی۔ پروردگار نے جس دن آسمان و زمین کو بنایا اسی دن کہہ دیا کہ ہم نے بارہ مہینے بنائے ہیں یعنی مہینے موجود، تاریخ موجود، ہفتے موجود، دن موجود، رات موجود تو پھر یہ ماقبل تاریخ کے کیا معنی ہیں ؟ ۔

بات یہ ہے کہ جب تک قلم میدان میں نہیں آیا تھا جب تک قلم نے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اس وقت تک کے واقعات کا نام ہے ماقبل تاریخ۔ اس لیے کہ تاریخ لکھتا کون ؟ مرتب کرتا کون ؟ یہ کام تو قلم ہی کو انجام دینا تھا۔ تو جب تک قلم میدان میں نہیں آیا ماضی کا حال سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ وہ عالم الگ ہو گیا یہ عالم الگ ہو گیا۔ یہ فقط ایک قلم کا کارنامہ ہے جس نے حال کو ماضی سے جوڑ رکھا ہے جہاں تک قلم نے لکھ لیا وہ سب ہم سے متعلق ہے جہاں قلم نہیں چلا اس کا ہم سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا (میں بڑی قیمتی بات کہہ رہا ہوں عزیزو) اللہ نے کیوں کہا پیغمبر

ہم نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ پروردگار قلم کی عظمت کو سمجھانا چاہتا ہے کہ یہ قلم وہ ہے جس نے انسان کو اس کے ماضی سے جوڑا ہے تو پہلے دن جو وحی آئی تو خدا نے قلم کی اہمیت کا اعلان کر کے یہ سمجھایا کہ یہ قلم وہ ہے جو حال کو ماضی سے جوڑتا ہے اور آخری دن پیغمبرؐ نے قلم کا نام لے کر بتایا کہ یہ قلم وہ ہے جو حال کو مستقبل سے جوڑتا ہے۔ میں وہ لکھ دوں گا جب تک اس سے وابستہ رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ قلم نے ماضی کو بھی سنبھالا ہے اور قلم ہی نے مستقبل کو بھی سنبھالا ہے۔ نعرۂ حیدری۔

اگر قلم درمیان میں نہ آیا ہوتا تو انسانی حیات، انسانی تاریخ نہ اپنے ماضی سے وابستہ ہوتی اور نہ اپنے مستقبل سے وابستہ ہوتی۔ قدرت نے ماضی کے واقعات اور ماضی کے حقائق کو سمجھایا تو قلم کے ذریعہ پیغمبرؐ نے امتِ اسلامیہ کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہا تو اسی قلم کے ذریعہ ورنہ حضورؐ اعلان تو صبح و شام کر ہی رہے تھے۔ بیان تو برابر فرما ہی رہے تھے۔ ذوالعشیرہ میں کیا بیان نہیں فرمایا کہ یہ میرا وزیر ہے۔ کس موقع پر حضورؐ نے اعلان نہیں کیا برابر اعلان ہو رہا تھا مگر چلتے چلتے پیغمبرؐ یہ چاہتے تھے کہ جو آج تک کہہ رہا تھا وہ لکھ کے جاؤں اس لیے کہ آوازیں محفوظ رہیں یا نہ رہیں مگر قلم کا نوشتہ محفوظ رہ جائے گا۔ قلم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ قلم ہر دور کو اس کے ماضی سے بھی ملا دیتا ہے اور اس کے مستقبل سے بھی ملا دیتا ہے۔ تاریخ مکمل نہ ہوگی اگر قلم درمیان میں نہ آیا۔

یہ پہلا کارنامہ ہے قلم کا

دوسرا کارنامہ اگر قلم درمیان میں نہ ہوتا تو ساری تحقیقات یا فضا میں ہوتیں یا محققین کے دماغوں کے اندر رہ جاتیں۔ میں نے جو کچھ سوچا اگر آپ سے کہہ دیا تو یہ آپ کے کانوں تک آواز آئی اور فضا میں اڑ گئی۔

اور اگر نہ کہہ سکا تو میرے دماغ ہی میں بات رہ گئی اور میرے ساتھ قبر میں چلی گئی۔ سارے انسانی کمالات یا فضا میں منتشر ہو جائیں گے یا قبروں میں چلے جائیں گے۔ یہ اگر فضا میں اڑنے نہیں پائے یا قبروں میں جانے نہیں پائے تو بچا کے کس نے رکھا ہے کبھی ان موضوعات پر بھی

غور کریں جو میں گذارش کر رہا ہوں) فلاں نے ہزار سال پہلے کیا کہا تھا، ارسطو نے کیا کہا، افلاطون نے کیا کہا، جالینوس نے کیا کہا، سقراط کا فلسفہ کیا تھا۔ معصومین علیہم السّلام کے ارشادات کیا تھے انبیاء نے کیا فرمایا تھا یہ آپ تک کیسے پہنچا۔ یہ ساری باتیں کیسے آئیں کل تو کوئی ٹیپ ریکارڈ بھی بھی نہیں تھا جس کے ذریعہ آپ تک آگئی ہوں۔ یہ سارے پیغامات، یہ سارے بیانات؛ چاہے حکماء کے بیانات ہوں چاہے علماء کے بیانات ہوں، چاہے اولیا کے ارشادات ہوں، چاہے انبیاء کے فرمودات ہوں یہ سب آج ہمارے پاس محفوظ رہ گئے تو صرف قلم کی بدولت، ورنہ سارے افکار، سارے خیالات، سارے تحقیقات، سارے بیانات یا فضاؤں میں اڑ جاتے یا قبروں میں چلے جاتے۔ انھیں نہ فضاؤں میں اڑنے دیا، نہ قبروں میں دفن ہونے دیا۔ یہ قلم کا کارنامہ تھا کہ صاحب فکر دفن ہو گیا مگر فکر دفن نہ ہونے پائی۔ مفکر قبروں میں چلے گئے مگر فکریں قبروں میں نہ جانے پائیں۔ یہ کارنامہ تھا قلم کا تو یہ قلم کاغذ پر نہیں چل رہا ہے یہ مُردوں کو قبروں سے نکال رہا ہے یہ فکروں کو قبرستان سے باہر لا رہا ہے میدانِ حشر میں بھی مردے بعد میں نکالے جائیں گے۔ دفن ہونے والے بعد میں سامنے آئیں گے مگر قلم کا نوشتہ پہلے سامنے آئے گا۔

تو گویا یہی قلم ہے جو کبھی دفن ہونے والوں کو قبر سے نکال لیتا ہے اور کبھی زمین پر چلنے والوں کو قبروں میں دفنا دیتا ہے۔ صلوٰۃ۔

یہ قلم کا دوسرا کارنامہ تھا جس نے قلم کو اس قابل بنا دیا کہ پروردگار اس کی قسم کھائے عزیزانِ محترم! بات کو طول ہو جائے گا مگر میں اس مقام پر ان ساری آیتوں کی وضاحت آج ہی کرنا چاہتا ہوں تاکہ باقی سلسلۂ کلام کل سے آپ کے سامنے گذارش کر سکوں۔

پروردگار نے کہا قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو لوگ لکھتے ہیں۔ قلم کا کام ہی ہے لکھنا تو پھر مقصد کیا ہے اس قسم کا؟ پروردگار اس قسم کے بعد کیا اعلان کرنا چاہتا ہے؟ ما انت بنعمۃ ربک بمجنون پیغمبر آپ پروردگار کی نعمت سے مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ اب آپ خود سوچئے گا اور اگر آپ کو مفسرین اور علماء کہیں مل جائیں تو ان سے دریافت کیجئے گا۔ میری جہاں تک رسائی تھی میں نے کتابیں پڑھیں۔ تفسیروں میں دیکھا علماء کے بیانات دیکھے مگر گویا

اس مسئلہ کو چھیڑنا ہی نہیں ہے کہ ان دونوں میں رابطہ کیا ہے؟

میں کسی واقعہ کا ذکر نہیں کر رہا ہوں آپ گھبرائیں نہیں جو واقعہ آپ کے ذہن میں آرہا ہو وہ مدینہ کا ہے اور یہ سورہ مکّی ہے لہٰذا اپنے ذہن کو کہیں نہ لے جائیں۔ ذہن کو یہیں رکھیں خالی یہ سوچیں کہ ان دونوں کا رابطہ کیا ہے۔ قلم کی قسم، پیغمبرؐ آپ دیوانے نہیں ہیں۔ قلم نے کب کہا تھا پیغمبرؐ آپ دیوانے نہیں ہیں۔؟ قلم کی بنا پر پیغمبرؐ کے دیوانے ہونے کا خیال کب پیدا ہوا تھا حضور کی تاریخ میں تو آج تک یہ بات مسلسل لکھی جا رہی ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ لکھتے پڑھتے نہیں تھے لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں جانتے تھے یہ الگ ایک موضوع ہے مگر اس بات سے تو سبھی واقف ہیں کہ حضور لکھتے پڑھتے نہیں تھے۔ تو اگر حضور کبھی کتابت کے لیے بیٹھے ہوتے۔ اگر کبھی قلم کاغذ لے کر بیٹھتے تو ہو سکتا تھا کہ حضور کو لکھتے دیکھ کر کسی کو خیال پیدا ہو گیا ہو کہ لکھنا پڑھنا کیا چیز ہے یہ تو کچھ دیوانے معلوم ہوتے ہیں یعنی اگر حضور کو کبھی لوگوں نے کاغذ قلم لے کے لکھتے دیکھا ہوتا تو چونکہ مکہ والے لکھنا نہیں جانتے تھے اور ان کو نہیں معلوم تھا کہ قلم کاغذ پر چلتا ہے تو کیا ہوتا ہے جیسے کوئی زمین پر بیٹھ کے انگلیوں سے نشان بنانے لگے تو آپ کہیں گے خیریت تو ہے، کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ کیا لائنیں بنا رہے ہیں حالانکہ ہو سکتا ہے وہ کوئی آرٹسٹ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ زمین پر نشان بنا کے کوئی بڑا نقشہ تیار کر رہا ہو مگر چونکہ ہم نہیں جانتے کہ کیا کاروبار ہو رہا ہے تو یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنے عیب پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسرے کو عیب دار بنا دیتا ہے اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ زمین پر لائن کھینچنے سے ایک عمارت کا نقشہ بن جاتا ہے تو ہم کبھی نہ کہتے کہ خیریت تو ہے لیکن جب ہم نہیں جانتے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے تو دیوانہ نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ اسی طرح اگر پیغمبرؐ قلم لے کر کبھی کچھ لکھ رہے ہوتے تو چونکہ مکہ والے نہ لکھنا جانیں نہ پڑھنا جانیں وہ کہتے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کیا بنایا ہے۔

وہ کیا جانیں کہ یہ الف بنا ہے۔ انھیں کیا خبر کہ اس کا نام ب ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ یہ جیم ہے انھیں کیا خبر کہ یہ سین ہے یا شین ہے۔ آج تک خبر نہیں تو اس وقت کیا ہوتی۔ وہ کیا جانیں کہ کیا بنا رہے ہیں۔ اس وقت لوگ کہتے کہ یہ دیوانے ہیں مگر حضور تو خود ہی نہیں لکھتے تھے تو آخر قلم کا پیغمبرؐ کی

کی دیوانگی سے کیا رابطہ ہے؟

یہ دیوانگی کا خیال کہاں سے پیدا ہوا؟ قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ سن کے پیدا ہوا۔ بتوں کی مخالفت سن کے پیدا ہوا۔ یا کوئی اور خیال کہیں سے پیدا ہوا جو حضور کو دیوانہ کہلوار ہا تھا تو خدا کسی ایسی چیز کی قسم کھاتا جس کا رابطہ ہوتا۔ ایسی قسم کھائی جس قسم کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی عرب کی نگاہ میں قلم کی قسم کھائیں گے تو لوگوں کو اعتبار ہو جائے گا کہ پیغمبر دیوانے نہیں ہیں۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ دونوں میں کیا رابطہ ہے؟ میں نے تو بہت تلاش کیا۔ بڑے بڑے مفسرین کو دیکھا کہ شاید کوئی اس نکتہ کو اٹھائے گا کہ ان دونوں میں رابطہ کیا ہے۔؟ مگر مجھے کہیں نہ ملا اور نہ کسی نے حل کیا کہ یہ کیسے ہوا؟ مگر پروردگار نے کہا کہ پیغمبرؐ آپ کے لیے وہ اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے اَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْن یعنی پیسے تو کسی کے پاس ہوں گے ختم ہو جائیں گے۔ دولتِ خدیجہ آخر شش ختم ہوگئی تو پھر کون سا اجر خدا پیغمبرؐ کو دے رہا ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے اور خدا اعلان کر رہا ہے کہ اس دیوانگی کے الزام کو برداشت کر لیجیے ہم آپ کو وہ اجر دیں گے جس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کو ایک اجر ملا؟ کون سا اجر ملا؟ دولت کا نام اجر ہے؟ کسی عہدے کا نام اجر ہے کسی کرسی کا نام اجر ہے؟

جب لوگ اجر کا سوال لے کر آئے تو لوگ دولت ہی لے کر آئے تھے۔ لوگ اقتدار ہی لیکر آئے تھے لوگ کرسی ہی لے کر آئے تھے مگر پیغمبرؐ نے اس کو ٹھکرا دیا کہ یہ میرا اجر نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے دولت کو اپنا اجر نہیں بنایا، اقتدار کو اپنا اجر نہیں بنایا۔ تو سب کو نبی نے ٹھکرا دیا مگر ایک اجر تھا جس کا نبی نے سوال کیا قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی گویا پیغمبرؐ کو اللہ مکہ سے اطمینان دلا رہا ہے کہ آپ الزام جنون برداشت کر لیجیے۔ آپ قلم کی منزل کو سر کر لیجیے آپ تحریر کی منزل کو سر کر لیجیے آپ کے لیے وہ اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اگر ہم نے مال دیا ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ کرسی دی ہوتی تو ختم ہو جاتی۔ اقتدار دیا ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ ہم نے تو وہ محبت دی ہے جس کا سلسلہ قیامت تک ختم ہونے والا نہیں ہے۔ یہاں تک کہنے کے بعد اب خدا نے صاف صاف کہہ دیا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم۔ پیغمبرؐ آپ بلند اخلاق کی منزل پر فائز ہیں تا کہ نبی الزام جنون کے مقابلہ میں اگر کچھ کہے

تو کوئی میرے حبیب کو بداخلاق نہ کہنے پائے کہ یہ خلق کی عظیم منزل پر ہے تو اب سوچو کہ صاحب خلق عظیم جس کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دے وہ صاحب اخلاق کیسے کہا جائے گا۔ صلوات، نعرہ حیدری۔

اس لیے بعض محدثین نے اور بعض روایات نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگلی آیت فَسَتُبۡصِرُ وَیُبۡصِرُوۡنَ پیغمبرؐ آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے بِاَیِّکُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ کہ دونوں میں کون مجنون ہے؟ یہ دیوانے کہنے والے مجنون ہیں یا جس کو دیوانہ کہہ رہے ہیں وہ مجنون ہے۔ جب آپ کا پیغام کل کے لوگوں کے سامنے آجائے گا جب حقیقت بے نقاب ہو جائے گی تو انھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ خود ہی دیوانے تھے جو آپ کو دیوانہ کہہ رہے تھے اور بے عقل اور مجنون قرار دے رہے تھے ورنہ آپ جیسا عقل کل اور آپ جیسی کامل عقل رکھنے والا انسان کون ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر اس لفظ کے ذیل میں سارے محدثین نے نقل کیا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے ابتدائے تبلیغ میں جب یہ اعلان کیا کہ یہ میرا وصی ہے۔ یہ میرا وزیر ہے، یہ میرا جانشین ہے یہ میرے امور کا ذمہ دار ہے تو لوگوں نے پیغمبرؐ کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کسی کی محبت میں دیوانے ہو گئے ہیں۔ یہ اپنی بات تو کر ہی رہے تھے کہ میں رسول اللہ ہوں میں الٰہی پیغام لے کر آیا ہوں میں خیر دنیا و آخرت لے کے آیا ہوں ابھی اپنی بات آگے چلنے بھی نہیں پائی تھی اور یکبارگی بھائی بھی یاد آگیا اور اب اسے بھی اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس کی محبت میں بہک گئے ہیں۔

محدثین کہتے ہیں کہ جب لوگوں نے سرکار دو عالمؐ پر الزام لگایا کہ یہ محبت علیؑ میں گمراہ ہو گئے ہیں تو خدا نے کہا کہ پیغمبر آپ یہ پیغام بھی سنا دیجئے کہ عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے اور آپ بھی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون ہے؟ عنقریب دونوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں بہکا ہوا کون ہے تو پروردگار عالم نے قلم اور تحریر کا حوالہ دے کر ان سارے حقائق کا اعلان کر دیا کہ میرا پیغمبرؐ مجنون نہیں ہے۔ میرا پیغمبرؐ دیوانہ نہیں ہے۔ میرا پیغمبرؐ بداخلاق نہیں ہے۔ میرا پیغمبرؐ صاحب خلق عظیم ہے اور اسلام کی کل تاریخ اخلاق کی تاریخ ہے۔ سرکار دو عالمؐ کی پوری زندگی اخلاق کی زندگی ہے یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ ام المومنین عائشہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیا

پیغمبرؐ کے اخلاق کے بارے میں بتا سکتی ہیں کہ حضورؐ کا اخلاق کیسا تھا؟ تو کہا کہ حضورؐ کے اخلاق کو تاریخ میں مت پڑھو حضورؐ کا اخلاق روایتوں میں مت تلاش کرو خُلُقُہُ القرآن پیغمبرؐ کا اخلاق یہی قرآن ہے یعنی قرآن لفظوں میں آجائے تو قرآن کہا جائے گا اور زندگی میں مجسّم ہو جائے تو اخلاقِ پیغمبرؐ کہا جائے گا۔ سرکارِ دو عالم کی پوری زندگی قرآن مجید کی تجسیم ہے۔ تعلیماتِ قرآن مجسّم ہو گئے۔ سرکارِ دو عالم کے کردار میں آپ کا کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو قرآن مجید سے الگ ہو۔ اسلام کی پوری تاریخ تاریخ اخلاق ہے اور اسلام اور کفر کا اگر کوئی معرکہ ہے تو اس معرکہ کا خلاصہ ہے معرکۂ اخلاق و بداخلاقی۔

اخلاق اِدھر ہے اور بداخلاقی اُدھر۔ یہی معرکہ روزِ اول سے روزِ آخر تک قائم رہا سرکارِ دو عالم کی زندگی کا شاہکار تھا وہ خلقِ عظیم جس پر پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب کو فائز کیا اور یہی وہ سلسلۂ اخلاق تھا جو پیغمبرِ اسلام کے بعد اولادِ رسول میں دیکھا گیا۔

اولادِ پیغمبرؐ کی زندگیوں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو اخلاق کل حیاتِ پیغمبرؐ میں دیکھا گیا تھا وہی اخلاق کردارِ آلِ محمدؐ میں نظر آرہا ہے۔ وہی زندگی کا انداز وہی چلن، وہی پیغمبرؐ کا طریقہ کار۔ اگر پیغمبرؐ کے سامنے آکر کسی نے حضورؐ کو جادوگر کہہ دیا، مجنون کہہ دیا، کسی نے پتھر مار دیا کسی نے راستہ میں کانٹے بچھائے، کسی نے کوڑا پھینک دیا اور سرکارِ دو عالمؐ نے انتقام نہیں لیا بلکہ کوڑا پھینکنے والی اگر بیمار ہو گئی تو سرکار اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ حیاتِ پیغمبرؐ میں اگر یہ کمال اخلاق دیکھا ہے تو پیغمبرؐ کے بعد اہلِ بیتؑ کی زندگی میں یہی اخلاق نظر آیا مولائے کائناتؑ جب مدینہ پیغمبرؐ سے رخصت ہو کر کوفہ کی طرف جا رہے تھے تو ایک یہودی بھی اسی راستہ پر چل رہا تھا اور اسے بصرہ کی طرف جانا تھا راستہ میں دونوں کی ملاقات ہو گئی اور دونوں کا سفر اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ وہ بصرہ کے راستہ پر چلا تو مولائے کائنات بھی اسی راستے پر چل دیے۔ اس نے کہا بندۂ خدا ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں دوسری جگہ جانا ہے وہاں نہیں جانا ہے جہاں میں جا رہا ہوں تم شاید راستہ بھول گئے ہو تمہارا راستہ ادھر ہے ادھر نہیں ہے۔ مولائے کائناتؑ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اپنے خیال میں بہت بڑی نصیحت کی کہ تم راستہ بھول گئے ہو یہ میرا اخلاق ہے کہ تم کو بتا دوں کیوں بلاوجہ غلط راستے پر جا رہے ہو تمہارا راستہ اُدھر ہے

ادھر نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنا راستہ معلوم ہے۔ میں راستہ بھولا نہیں ہوں میرا راستہ ادھر جاتا ہے لیکن میں جس دین کا ماننے والا ہوں جس مذہب کا ماننے والا ہوں اس مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی انسان راستہ میں تمہارا ہمسفر ہو جائے تو چاہے عقیدہ میں ہمسفر نہ ہو چاہے دین میں الگ ہو لیکن ہمسفر ہو جانے کی بنیاد پر اس کا اتنا حق پیدا ہو جاتا ہے کہ جب وہ تم سے الگ ہو کر جانے لگے۔ تو کچھ دور تک اسے رخصت کرنے کے لیے جاؤ لہٰذا میں تمہیں رخصت کرنے کے لیے آیا ہوں ورنہ مجھے اپنا راستہ معلوم ہے۔ کہا یہ تمہارے مذہب کی تعلیم ہے۔

بہترین موقع تھا کہ مولا کہتے کہ میرے اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے کوئی راستہ میں مل جاتا ہے تو میں اسے رخصت کرنے جاتا ہوں لیکن آپ نے فرمایا کہ بے شک یہ میرے مذہب کی تعلیم ہے میرا پیغمبرؐ جو مذہب لے کر آیا ہے اس مذہب کی تعلیم یہ ہے۔

اس نے کہا کہ اگر تمہارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ اتنی دیر میں اتنا حق پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی مسافر کو رخصت کرنے کے لیے جائے تو ذرا بتائیے کہ آپ کے مذہب کی تعلیمات اور کیا ہیں اور آپ کا مذہب کیا کیا بتاتا ہے؟ فرمایا کہ یہ ساری باتیں اس وقت معلوم ہو جائیں گی جب تو مذہب میں آجائے گا۔ اس نے کہا کہ جو مذہب غیروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہو۔ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہو۔ وہ مذہب اس قابل ہے کہ اسے اختیار کر لیا جائے۔ فرمایا کلمہ پڑھ لو سارے تعلیمات معلوم ہو جائیں گے وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور مجھے یہ کہنے کا جواز پیدا ہو گیا کہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ علیؑ راستہ بھول کر ادھر چلے آئے ہیں۔ علیؑ نے یہ سمجھایا کہ میں راستہ بھول کر نہیں آیا ہوں میں راستہ بتانے کے لیے آیا ہوں۔ صلوات۔

بس عزیزان محترم! جو اسلام ایک مسافر کے ہمسفر ہو جانے کی بنیاد پر اتنا حق مسافر کا قرار دیتا ہو کہ جب وہ اپنی منزل کی طرف جائے تو انسان اخلاقاً اسے کچھ دور رخصت کرنے کے لیے جائے تو اگر مسافر سفر ہی کرے کسی کی دعوت پر؟ اگر مسافر اپنا گھر چھوڑے کسی کے بلانے پر تو کیا اس کا حق ان لوگوں پر نہیں ہے جنھوں نے بلایا ہے۔ کیا اس کا حق ان انسانوں پر نہیں ہے جنھوں نے

وہ بات دی ہے جس کی وجہ سے مسافر کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا ہے مگر کتنا فرق ہے اس کردار میں جو مولائے کائنات ؑ نے پیش کیا ہے اور اس صورتحال میں جو مولائے کائنات کی اولاد کے حصہ میں آئی ہے اسی لیے فرزند رسولؐ قدم قدم پر اس دور کے انسانوں کو متوجہ کرتے رہے کہ میں خود نہیں آیا ہوں تم نے مجھے بلایا ہے میں نے بلا سبب اپنا گھر نہیں چھوڑا ہے۔ تم نے مجھے دعوت دی ہے کم سے کم اپنی دعوت کا تو خیال کرو، اپنے بلانے کا تو خیال کرو۔ مسافر کا احترام کرو، مہمان کی عزت کرو۔ جتنی تعلیمات سرکار دو عالمؐ دے کے گئے تھے۔ حضرت حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کو دیکھ کر ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا کہ جب سرکار دو عالم فرما رہے تھے کہ مہمان کا احترام کرو چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو تو اب میں سمجھا کہ حضور امت کو یہ سمجھا رہے تھے کہ اگر تمہارے خیال میں معاذ اللہ یہ خارجی بھی ہے تمہارے مذہب کا نہیں ہے تو تمہارا مہمان تو ہے۔ تمہارا بلایا ہوا تو ہے۔ مہمان کے ساتھ کیا سلوک اور کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ کتنی جلدی تم نے میری تعلیمات کو فراموش کر دیا ہے مگر نہ جانے کیا انقلاب آیا سرکارؐ دو عالم کے بعد کہ امت نے ساری تعلیمات اسلام کو نظر انداز کر دیا۔ بس ارباب عزا چند فقرے گذارش کر کے آج اس تقریر کو تمام کر دینا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ کل سے تفصیلات گذارش کروں گا۔

کتنا بڑا انقلاب کربلا میں آیا یہ میں نہیں گذارش کروں گا۔ کتنا بڑا انقلاب کوفہ میں آیا میں اس کا تذکرہ نہیں کروں گا اس لیے کہ ان واقعات میں پچاس سال کا فاصلہ ہو گیا ہے۔ کربلا کے واقعہ میں اور سرکار دو عالم کے انتقال میں پچاس سال کا فاصلہ ہے۔ کربلا الگ ہے۔ مدینہ الگ ہے۔ کوفہ الگ ہے۔ شام الگ ہے۔ اگر پچاس سال کے بعد کوفہ کی فضا بدلی سی دکھائی دے رہی ہے۔ اگر پچاس سال کے بعد شام کی فضا بدلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ اگر پچاس سال کے بعد کربلا کے حالات بدلے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ قیامت یہ ہے کہ ایک دن کے اندر مدینہ کی فضا بدلی ہوئی دکھائی دے رہی ہے کہ جس دروازہ پر کل سلام کرنے والے آتے تھے اور امت نہیں خود پیغمبرؐ دس مہینے تک مسلسل نماز صبح کے بعد سلام کرنے آتے رہے اور امت کو اپنے کردار سے روشناس کراتے رہے۔ اس مدینہ میں اتنا بڑا انقلاب ایک دن کے اندر پیدا ہو گیا کہ بیٹی باپ کے غم میں مبتلا بیٹھی ہے۔ انتظار ہے کہ شاید کوئی چاہنے والا پرسہ دینے کے لیے آ جائے کہ ایک مرتبہ آواز آئی علیؑ کو

باہر نکالو، علیؑ کو باہر نکالو ورنہ گھر میں آگ لگادی جائے گی۔ اتنا بڑا انقلاب کون تصور کرسکتا ہے کہ نبیؐ کی بیٹی دروازے کے پاس آ کے آواز دے رہی ہے کیا تمہیں خبر نہیں کہ اس گھر میں پیغمبرؐ کی چھوٹی چھوٹی امانتیں بھی ہیں۔ آواز آئی یہ کچھ بھی ہو۔ اس گھر میں آگ لگادی جائے گی اور دار باب عمرا اس کے بعد جو بھی صورتحال سامنے آئی وہ آپ برابر سنتے رہتے ہیں۔ بس ایک آواز فضا میں گونجی فضہؓ مجھے سنبھالو فضہ مجھے سہارا دو نبیؐ کی بیٹی گر رہی ہے۔

فضہ ذرا دیکھو میرا محسن شہید ہو گیا۔

فضہ ذرا دیکھو میں در و دیوار کے درمیان آگئی۔ عزیزو! میں اس صورتحال کی ترجمانی نہیں کرسکتا ہوں جس منزل سے نبیؐ کی بیٹی گذر رہی تھی۔

فضہ نے بڑھ کے سہارا دیا مگر شہزادی غش کھا کر خاک پر گریں تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو فرمایا فضہ میرا وارث کہاں ہے۔ فضہ نے آواز دی شہزادی ان کے گلے میں ریسمان ظلم ڈال کر لے گئے ہیں یہ سننا تھا کہ گھبرا کے دروازے کے قریب آئیں اور آواز دی ابوالحسنؑ کو چھوڑ دو ورنہ میں اپنے سر کے بال بکھرا دوں گی اور پیراہن پیغمبرؐ کو سر پر رکھ کر بد دعا کروں گی۔

ابھی یہ آواز فضا میں گونجی ہی تھی کہ مسجد پیغمبرؐ کی دیواریں بلند ہونے لگیں اور مولائے کائناتؑ نے کہا سلمان دختر پیغمبرؐ سے کہدو کہ گھر میں بیٹھیں اور صبر کریں۔

سلمان آئے اور دست ادب جوڑ کے کہا بی بی آپ گھر میں تشریف رکھیں۔ فرمایا سلمان تم نے خوب انصاف کیا جس کے وارث کے گلے میں رسی بندھی ہو اسے گھر میں بیٹھنے کا مشورہ دے رہے ہو سلمان پلٹ کر آئے مولا کو یہ جواب پہونچایا۔ فرمایا جاکے کہدو کہ فاطمہؑ تم رحمۃ للعالمین کی بیٹی ہو اگر ایک حرف بد دعا تمہاری زبان پر آگیا تو تمہارے بابا کی امت تباہ ہو جائے گی۔

سلمان نے پیغام پہونچایا۔ کہا میں نہیں چاہتی کہ بابا کی امت برباد ہو جائے۔ سلمان میں گھر میں جارہی ہوں۔

اس تمام مصیبت کو زہراؑ نے برداشت کرلیا کہا گر کانٹے بچھانے والوں کے لیے نبیؐ نے بد دعا نہ کی۔ کوڑا پھینکنے والوں کے لیے باباؐ نے بد دعا نہ کی تو جس نے محسن کو شہید کیا جس نے پہلو کو

شکستہ کیا جس نے وارث کے گلے میں رسّی ڈال دی زہرا نے اس کے لیے بھی بد دعا نہ کی اور یہ زہراؑ ہی کے خون کا اثر تھا کہ جب بھائی کے سر کو نوکِ نیزہ پر دیکھا تو ایک مرتبہ زینبؑ نے کہا بی بیو بڑھو۔ یہ ظالم مجھے بے کس سمجھتے ہیں آؤ میں انھیں سمجھاؤں کہ زہراؑ کی بیٹی کے حرف دعا میں کتنا اثر ہے تو ایک مرتبہ عابدؑ بیمار آگے بڑھے۔ پھوپھی اماں بد دعا کرنے سے پہلے بابا کے سر کو تو دیکھ لیجئے۔ اب جو نگاہ اٹھی تو کیا دیکھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ بھیا کیا کوئی تازہ مصیبت گذر گئی۔ کہا بہن کھلے سر دربار میں چلی جاؤ۔ بد دعا نہ کرنا۔ اے زینبؑ یہ ہمارے گھرانے کا چلن نہیں ہے۔

علیؑ کی بیٹی اس شان سے دربار میں داخل ہوئی کہ ہزاروں تماشائیوں کا مجمع اور زینبؑ کے سر پر چادر نہیں۔ اللہ جس کی ماں کا جنازہ رات کی تاریکی میں اٹھا ہو وہ اس انداز سے دربار میں لائی جا رہی ہے۔

عجب نہیں۔ دلِ زینبؑ نے آواز دی ہو۔ اماں۔ آپ دربار میں گئی تھیں تو ہاشمی خواتین کا حلقہ تھا۔ درمیان میں پردہ تھا۔ لیکن آپ کی بیٹی آج دربار شام میں اس انداز سے لائی جا رہی ہے۔ اماں۔ اب آپ ہی فریاد کو پہنچیں اور اپنی بیٹی کا دل سنبھالیں۔ وا محمدا۔ وا علیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

□□

مجلس ۱

عظمتِ اخلاقیات

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ.

نٓ! قسم ہے قلم کی اور تحریر کی مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ اے پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمت کی بنا پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ اور آپ کے لیے وہ اجر معیّن کیا گیا ہے جس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور آپ عظیم ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں عنقریب یہ بھی دیکھیں گے کہ بہکا ہوا کون ہے۔

یہ سلسلۂ مجالس جو آج شروع ہو رہا ہے اس کا بنیادی موضوع ہے اخلاقیات۔

اخلاقیات کے دو شعبے ہیں۔
ایک شعبے کا نام ہے فضائل اور دوسرے شعبہ کا نام ہے رذائل۔

کچھ اخلاقیات ہوتے ہیں جو اختیار کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ جنھیں فضائل کہا جاتا ہے۔ کچھ اخلاقیات ہوتے ہیں جو ترک کر دینے کے لائق ہوتے ہیں انھیں رذائل کہا جاتا ہے۔

انسان کی زندگی کی ساری آزمائش انھیں

فضائل اور رذائل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلات، میں آئندہ مجالس میں آپ کے سامنے ذکر کروں گا۔ آج تمہیدی طور پر یہ نکتہ عرض کرنا ہے کہ یہ مسئلہ اخلاق ہر دور میں اور ہر محاذ زندگی پر عام طور سے نظر انداز کیا گیا ہے اور جتنا نظر انداز کیا گیا ہے اتنا ہی زیادہ اہم ہے۔

آج اگر آپ دنیا کے مدارس میں نصابِ تعلیم کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مدرسہ میں ہر مضمون، ہر موضوع کو کسی نہ کسی شکل میں بہرحال پڑھایا جا رہا ہے لیکن اگر کوئی موضوع نظر انداز کیا جا رہا ہے تو وہ ہے مسئلہ اخلاقیات۔

حساب کی تعلیم، سائنس کی تعلیم، جغرافیہ کی تعلیم، تاریخوں کی تعلیم، زمین کی تعلیم، آسمان کی تعلیم۔ اور آج تو تعلیم کے اتنے شعبے پیدا ہو گئے ہیں کہ انسان تصوّر بھی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن سارے زندگی کے شعبوں کو قابل تعلیم سمجھنے کے بعد بھی اگر کسی بات کو ناقابل تعلیم سمجھا گیا ہے تو وہ مسئلہ اخلاقیات ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ کسی بھی علم کا عالم ہو جانا آسان ہے اور کسی بھی فنکار کا فنکار ہو جانا آسان ہے لیکن انسان ہو جانا مشکل ہے اور انسانیت کے لیے جو بنیادی شرط ہے اور جو واقعاً انسان ساز شے ہے اسی کا نام ہے اخلاقیات۔

اخلاقیات کے بغیر انسان سائنٹسٹ ہو سکتا ہے، محاسب ہو سکتا ہے، انجینئر ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے، ماہر نفسیات ہو سکتا ہے، ماہر فلکیات ہو سکتا ہے مگر انسان نہیں ہو سکتا ہے۔ انسانیت کا دار و مدار اخلاقیات پر ہے جس کو دنیا کے ہر شعبۂ تعلیم میں نظر انداز کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھتا گیا پڑھے لکھے پیدا ہوتے رہے اور انسان مرتے رہے اور اگر آپ آج کسی شعبۂ حیات میں

انسانوں کو تلاش کرنا چاہیں تو ماہرین فن ہزاروں ملیں گے مگر ہزار کے درمیان شاید انسان دو چار سے زیادہ آپ کو نظر نہیں آئیں گے۔ میں ان معاملات کی تفصیلات آئندہ آپ کے سامنے گذارش کروں گا تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح دنیا میں علم وفن رو بہ ارتقاء ہوا ہے اور کس طرح انسانیت رو بہ انحطاط ہوئی ہے

ایک مثال جو میں نے ایک میڈیکل کالج میں یوم حسینؑ کی تقریب کے درمیان گذارش کی تھی کہ دنیا میں بڑھتے ہوئے علم اور ڈھلتے ہوئے اخلاق کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ملک میں کوئی وبا آتی ہے، کوئی بیماری پھیل جاتی ہے تو ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر اور ایک طبیب دوسرے طبیب سے مسکرا کر ملاقات کرتا ہے اور دونوں کو خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ سیزن اچھا جا رہا ہے اور اگر اتفاق سے قوم میں سارے افراد صحتمند ہو گئے تو ہر ایک کا چہرہ اتر جاتا ہے اور ہر ایک مایوس ہو جاتا ہے کہ فن کا کل ارتقاء یہ ہے کہ انسان بیمار ہو کر آ جائے اور ہمارا کاروبار چلتا رہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ایک ٹیبلٹ سے بڑے سے بڑا مریض شفایاب ہو جائے آپ کے ایک انجکشن سے ناقابل علاج مرض کا علاج ہو جائے مگر مسئلہ یہ ہے کہ مریض کا علاج تو ہو جائے گا آپ کا علاج کون کرے گا۔ دین اسلام نے اخلاقیات کی اہمیت کے پیش نظر بہت سے ایسے کاروبار تھے جن کو کراہت کی نگاہ سے اسی لیے دیکھا ہے کہ یہ اگرچہ زندگی کے ضروریات میں شامل ہیں کہ اگر دنیا کے سارے انسان دوکانیں بند کر کے بیٹھ جائیں اور ہر ایک یہ طے کرے کہ ہم کفن نہیں بیچیں گے تو مُردے بلا کفن کے دفن ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد بھی اور کفن کے واجبات شریعت میں داخل ہونے کے بعد بھی اسلام نے کفن فروشی کے پیشے کو مکروہ قرار دیا ہے کفن دینا کوئی برا کام نہیں ہے وہ تو واجبات اور فرائض میں شامل ہے اور کفن بیچنا بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ انسان کے مختلف کاروبار میں سے ایک کاروبار ہے مگر اس کو پیشہ بنا لینا

یہ اسلام کی نگاہ میں مکروہ ہے۔ کیوں مکروہ ہے؟ اس لیے کہ پیشہ ورانہ مزاج یہ ہوتا ہے کہ جب تک کاروبار ترقی کرتا رہتا ہے انسان خوش رہتا ہے اور جب کاروبار کو زوال ہوتا ہے تو انسان پریشان ہو جاتا ہے اور یہ وہ پیشہ ہے کہ جس کے ترقی کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ملک الموت کا کام تیز تر ہو جائے یعنی ایسی دوکان کھولنے والا اور ایسا کاروبار کرنے والا ہمیشہ انسانوں کی موت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر لوگوں کو موت نہ آئے گی تو ہمارا کاروبار نہ چلے گا۔

اسلام یہ تو گوارا کر سکتا ہے کہ آپ کے کاروبار کو موت آجائے لیکن یہ گوارہ نہیں کر سکتا ہے کہ آپ کے دل میں لوگوں کے مرنے کی آرزو پیدا ہو جائے اگر بڑے مسلمان ہو صاحب ایمان ہو اللہ والا بننے کی آرزو ہے تو اپنی موت کی تمنا کرو دوسروں کی موت کی تمنا نہ کرو۔ صلوات

عزیزانِ محترم! مسئلہ اخلاقیات انسانی زندگی کے عظیم ترین اور اہم ترین مسائل میں شامل ہے مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے اور پورے عالم اسلام کی بدقسمتی ہے کہ اس مسئلہ کو انتہائی بے فیض غیر مفید، غیر منفعت بخش اور غیر ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ میں اخلاقیات کی ضرورت کے بارے میں آئندہ عرض کروں گا۔ آج تمہیداً چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دینِ اسلام نے اس مسئلہ کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کے فضائل و کمالات کا اعلان کرتے ہوئے پروردگار عالم نے یہ اعلان کیا ہے وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ پیغمبرؐ آپ کا سب سے بڑا شرف اور آپ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ خلقِ عظیم کی منزل پر فائز ہیں۔ آپ سے برتر کوئی صاحبِ اخلاق نہیں ہے۔ آپ کو پروردگار نے، خدائے عظیم نے خلق عظیم کی منزل پر فائز کیا ہے اور خود سرکار دو عالمؐ نے بھی اپنی بعثت، اپنی رسالت کے

اسباب پر روشنی ڈال تو فرمایا۔ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ مجھے صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں لوگوں کے اخلاقیات کو مکمل کردوں۔ آپ اس نکتہ پر توجہ دیں۔ اگر حضورؐ نے یہ کہا ہوتا کہ میری بعثت اور رسالت کے مقاصد میں سے ایک مقصد اخلاقیات کا سدھار بھی ہے تو شاید مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ نہ ہوتا لیکن حضور سرورِ کائنات کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ مجھے صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اخلاق کی بلندیوں کو درجۂ کمال و تمام تک پہنچا دوں۔ اس کے علاوہ میری بعثت کا کوئی مقصد نہیں ہے اور یہ بھی پیغمبر اسلامؐ کا ذاتی اعلان نہیں ہے بلکہ یہ وہی اعلان ہے جو وحیٔ پروردگار نے اس سے پہلے کر دیا تھا۔ ھُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ" اللہ نے مکّہ والوں کے درمیان ایک رسول بھیجا۔ جس رسول کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ اُن کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرے اور ان کے نفس کو پاکیزہ بنائے۔ یہ پاکیزگی نفس ہی وہ شے ہے جو مرکز ہے، مصدر اور محور ہے سارے اخلاقیات کا۔ اخلاقیات بے کار ہیں اگر نفس پاکیزہ نہیں ہے۔

ہمارے یہاں اخلاقیات کا تصور یہ ہے کہ کسی آدمی نے کسی کو سلام کر لیا تو بڑا صاحبِ اخلاق ہے۔ کسی آدمی نے کسی کو چائے پلا دی تو بڑا صاحبِ اخلاق ہے۔ کسی آدمی نے کسی کا احترام کر لیا تو بڑا صاحبِ اخلاق ہے لیکن درحقیقت ان باتوں کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اخلاق کی دنیا باہر کی دنیا نہیں ہے۔ اخلاقیات کی دنیا اندر کی دنیا ہے۔ یہ میں آئندہ گذارش کروں گا کہ یہ سارا کاروبار جو ہو رہا ہے اس کاروبار کی بنیاد کیا ہے۔ اگر نفس کے اندر وہ پاکیزگی پائی جاتی ہے جو انسان کو ان اعمال پر آمادہ کرتی ہے تو انسان صاحبِ اخلاق کہا جائے گا لیکن اگر نفس کے اندر وہ بات نہیں پائی جاتی ہے تو انسان ایسے لاکھوں اعمال انجام دینے کے بعد بھی دنیا کی نگاہوں میں مہذب ترین انسان ہو سکتا ہے

لیکن علمائے اخلاق کی نگاہ میں صاحبِ اخلاق نہیں ہو سکتا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان کو دیکھ کر مسکرانے والے انسان کے مسکرانے میں بھی دوسرے جذبات ہوتے ہیں۔ کبھی بھائی بھائی کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ دوست دوست کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ عزیز عزیز کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور کبھی طنز کرنے والا دشمن کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ تبسّم ان کے لبوں پر بھی ہے اور تبسّم ان کے لبوں پر بھی ہے مگر ایک کی مسکراہٹ کا نام ہے محبّت اور ایک کی مسکراہٹ کا نام ہے اہانت۔ اس کا نام ہے اخلاق اور اس کا نام ہے توہین کیوں؟ اس لیے کہ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا محرک کیا ہے اور وہ جذبہ کون سا ہے جو انسان کو مسکرانے پر آمادہ کر رہا ہے۔ وہی جذبہ انسان کے نفس کی پاکیزگی اور خباثت کا فیصلہ کرتا ہے۔ مسکراہٹ سے کوئی انسان نہ طیّب ہو سکتا ہے اور نہ خبیث ہو سکتا ہے۔ یہ نفس فیصلہ کرے گا کہ انسان طیّب ہے یا خبیث ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کے وہ اخلاقیات جن کی تعلیم دینے کے لیے سرکارِ دوعالم آئے تھے اور جن کو منزلِ تمام و کمال تک پہونچانا سرکار کے مقاصد بعثت میں شامل تھا بلکہ وہی بنیادی مقصد تھا۔ اس سے زیادہ اہم دنیا میں کوئی شئے نہیں ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر میں اس کے تفصیلات کو آئندہ مجالس میں گذارش کروں گا تاکہ آپ محسوس کر سکیں کہ جس موضوع کو باہر ہی نہیں اسلام کے اندر بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ موضوع کتنا اہم ہے اور اس کا دینِ اسلام کی تعلیمات سے کتنا گہرا رابطہ ہے۔ مسئلہ کے غیر اہم ہونے کے جو بہت سے نمونے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے مختلف علوم میں اگر آپ تلاش کرنے جائیں گے تو آپ کو کتابیں سینکڑوں کی تعداد میں مل جائیں گی۔ آپ فقہ کی کتابیں تلاش کیجئے سینکڑوں مل جائیں گی۔ تفسیر دیکھیں گے سینکڑوں مل جائیں گی۔ حدیث کی کتابیں دیکھیں گے سینکڑوں موجود ہیں۔ دیگر علوم کے بارے

میں تلاش کریں گے ہزاروں کتابیں مل جائیں گی لیکن عالمِ اسلام کے اندر بھی اگر آپ اخلاقیات کی کتابیں تلاش کریں گے تو حدیثوں کے ذیل میں تو مل جائیں گی۔ آیتوں کے ذیل میں تو مل جائیں گی تفسیر میں تو کہیں ذکرِ اخلاقیات آجائے گا لیکن خود اخلاقیات کو بنیادی موضوع قرار دے کر کتنا کام کیا گیا ہے اور کتنا لکھا گیا ہے اس کا حساب اگر لگائیں گے تو دیگر موضوعات کے مقابلہ میں شاید ایک فیصد سے زیادہ نہ ہوگا۔ ایک مدّت تک اخلاقیات کا سارا کام تفسیر یا حدیث سے لیا گیا اور تفسیروں کے ذیل میں یا حدیثوں کے ذیل میں اخلاقی مسائل کا تذکرہ کیا گیا مگر اخلاقیات کو موضوع بنا کر اس کے بارے میں تحقیقات کی جائیں۔ اس کے بارے میں تفصیلات پیش کی جائیں۔ یہ کام ایک مدّت تک نہیں ہوسکا ہے آج علم اخلاق میں جو نمایاں کتابیں دکھائی دیتی ہیں وہ چند کتابوں سے زیادہ نہیں ہیں اور یہ سلسلہ فنّی طور پر علمی اعتبار سے جب منظرِ عام پر آیا ہے تو سب سے پہلے وہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن کو رسائل اخوان الصّفا کہا جاتا ہے۔ اخوان الصّفا ایک جماعت تھی۔ مجہول، نامعلوم۔ کسی کو آج تک نہیں معلوم کہ وہ کون افراد تھے جو یہ کام انجام دے رہے تھے اگرچہ ان کا مقصد بہرحال اچھا تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ دنیا کی نگاہ میں اخلاقیات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور جب تک انسان صاحبِ اخلاق نہ ہوگا۔ ایسے انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو نگاہ میں رکھنے کے بعد رسالے مرتّب کیے گئے۔ کتابیں لکھی گئیں تاکہ ان کے پڑھنے کے بعد انسان وہ جوہر، وہ کمال وہ روح اپنے اندر پیدا کرے جس کا نام ہے روحِ اخلاق۔

______ یہ کام چوتھی صدی میں انجام پایا جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مدّت گذر گئی تھی، ایک زمانہ گذر گیا تھا مگر اخلاقیات کا کام تفسیر حدیث اور فقہ سے لیا جارہا تھا اور مستقل طور پر اس موضوع پر کام کرنا ضروری

نہیں سمجھا گیا تھا اور شاید اس دور کے حالات میں اتنا ضروری بھی نہ رہا ہو۔ رسائل اخوان الصفا کے بعد جو دوسرا کام منظرِ عام پر آیا وہ ابوالحسن عامل نیشاپوری کی کتاب تھی وہ بھی ظاہر ہے کہ آج سے سات آٹھ سو سال پہلے کی بات ہے "کتاب السعادت فی السیرۃ الانسانیتہ" انسان کی سیرت میں سعادت، پاکیزگی، خوبی، نیک بختی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سارے مسائل اخلاقیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کو ابوالحسن عامل نے طے کیا۔ ان کا دور گذر جانے کے بعد ایک مدت تک اس میدان میں سناٹا رہا اور ایک مدت کے بعد تقریباً سو سال کے عرصہ کے بعد ابن مسکویہ نے تہذیب الاخلاق کتاب لکھی جو آج بھی بعض مقامات پر بطور نصاب درس میں پڑھائی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان جو کتابیں لکھی جا رہی تھیں ان کی بنیاد وہی فلسفۂ اخلاق تھا جو یونان میں رائج تھا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے اخلاقیات میں اسلامی تعلیمات کو بنیاد نہیں بنایا۔ یعنی جو فلسفہ باہر سے آیا تھا اسی فلسفہ کو دیکھ کر فلسفہ تیار کر دیا اور اسی اخلاق کو دیکھ کے اخلاقیات کی کتابیں لکھ ڈالیں اور خود ذاتی طور پر اسلام میں جو اخلاقی تعلیمات تھیں ان کو بنیاد بنا کر وہ کام نہیں انجام دیا گیا جو بعد میں مسلمانوں کو انجام دینا چاہئے تھا۔ پانچویں صدی گذر جانے کے بعد ایک مدت تک پھر اس عالم میں سناٹا ہی رہا اور انھیں تقسیمات کو اور انھیں کتابوں کو اس مسئلہ کے واسطے کافی سمجھا گیا یہاں تک کہ عالم اسلام کی ایک مشہور ترین شخصیت جن کا بہر حال استقبال غزالی سے بھی ایک طرح کا رابطہ ہے۔ ابو حامد احمد غزالی منظرِ عام پر آئے جن کا نام بے حد مشہور ہے۔ اس موقع پر ان کا تذکرہ کچھ برا بھی نہیں ہے اگرچہ انھوں نے احیاء علوم دین کے نام سے بہترین کتاب لکھی ہے اور اس میں مسائل اخلاقیات کو اتنا واضح کر دیا ہے جتنا اس سے پہلے کتابوں میں واضح نہیں کیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے بیانات کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ انسانی زندگی میں چار چیزیں بڑی

اہمیت رکھتی ہیں اور انسان کو ہمیشہ انھیں چار چیزوں پر نگاہ رکھنی چاہئے۔
ایک حصہ انسانی زندگی میں عبادات کا ہے۔ غزالی نے عجیب بات کہی ہے کہ انسانی زندگی میں ایک شعبہ ہے عبادات کا اور ایک شعبہ ہے عادات کا۔ عادتوں کی دنیا الگ ہے اور عبادتوں کی دنیا الگ ہے اور انسانی زندگی کے دو اہم مسائل ہیں۔ ایک کا نام ہے مہلکات اور دوسرے کا نام ہے منجیات۔ یعنی وہ چیزیں جو انسان کو برباد کرنے والی ہیں اور وہ چیزیں جو انسان کو بربادی سے نجات دلانے والی ہیں۔ بچانے والی ہیں۔ یہ زندگی کے چار اہم موضوعات ہیں۔ اگر کسی آدمی نے ان چاروں موضوعات کی گہرائیوں کو اور حقائق کو پہچان لیا ہے تو اس سے زیادہ اچھا پاکیزہ اور طیّب و طاہر انسان نہیں ہو سکتا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک ایسا انسان جو انسان کو اخلاقیات کی تعلیم دے رہا ہو اور مہلکات سے بچانے کے لیے منجیات اور نجات دلانے والی چیزوں کی نشاندہی کر رہا ہو وہ جب مذہب کی دنیا میں آئے تو عقائد کی دنیا اسے اس قدر مجبور کر دے کہ بالآخر یہ فتویٰ دینے پر آمادہ ہو جائے کہ واعظ کے لیے ذکر مقتل حسینؑ حرام ہے۔

جو انسان عبادات و عادات کا فرق جانتا ہو جو انسان مہلکات کو پہچانتا ہو اور منجیات کو جانتا ہو۔ برباد کرنے والی چیزوں کو جانتا ہو اور نجات دلانے والے مسائل کو جانتا ہو وہ انسان جب عقائد کی دنیا میں آتا ہے تو فکر سے اتنا بیگانہ اور عقل سے اتنا اجنبی ہو جاتا ہے کہ عقائد کی مجبوری کی بنا پر یہ بات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واعظ کے لیے ذکرِ مقتل حسنؑ و حسینؑ حرام ہے ذکر شہادت جائز نہیں ہے کیوں؟ اس لیے کہ یہ تذکرہ وہ ہے کہ یُھَیِّجُ عَلٰی بُغْضِ الصَّحَابَۃِ جو انسان کے دل میں صحابۂ کرام کا بغض پیدا کرتا ہے اور چونکہ صحابۂ کرام کا بغض بہت بری چیز ہے لہٰذا ہر وہ چیز جو برائی پر آمادہ کرے اسے برا ہونا چاہئے۔ استدلال بالکل منطقی ہے بالکل صحیح ہے کہ ہر وہ چیز جس سے برائی کے جذبات پیدا

ہوں اسے بُرا ہونا چاہئے اس پر پابندی عائد ہونا چاہئے لیکن یہ کہہ کر غزالی نے ہر صاحب عقل کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ذکرِ شہادت حسینؑ سے بغض صحابہ کا تعلق کیا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ اگر بغضِ صحابہ کوئی بری چیز ہے تو ہر وہ چیز جس سے برے جذبات پیدا ہوں اسے بُرا ہونا چاہئے لیکن صحابۂ کرام سے یا بغضِ صحابہ سے شہادتِ حسینؑ کا کیا تعلق ہے؟ جنھیں صحابۂ کرام کہا جاتا ہے ان کو دنیا خوب جانتی ہے۔ جتنی بڑی شخصیتیں تھیں سب دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ شہادتِ حسینؑ کا واقعہ تو وفاتِ پیغمبرؐ کے پچاس سال کے بعد پیش آیا ہے۔ اس وقت کہاں صحابہ کرام بیٹھے ہوئے تھے۔ کہاں کربلا کے میدان میں صحابہ کرام تشریف لائے تھے کہ اگر ذکرِ شہادتِ حسینؑ آگیا تو بغضِ صحابہ پیدا ہو جائے گا؟ ذکرِ شہادتِ حسینؑ سے بغضِ شمر پیدا ہوگا۔ عداوتِ یزید پیدا ہوگی۔ عداوتِ ابنِ سعد پیدا ہوگی عداوتِ سنان وخولی پیدا ہوگی۔ اس کا ان صحابۂ کرام سے کیا تعلق ہے جن کو اسلام میں صحابہ کرام کہا جاتا ہے۔ کب عالمِ اسلام میں شمر کو صحابہ کرام میں شمار کیا گیا ہے۔ کب عالمِ اسلام میں سنان وخولی کو صحابہ کرام میں شمار کیا گیا ہے کہ ذکرِ شہادتِ حسینؑ سے بغضِ صحابہ پیدا ہو جائے گا۔ میں نہیں جانتا کہ غزالی کی نگاہ کتنی دقیق تھی کہ وہ پریشان تھے کہ اگر کہیں ذکرِ شہادتِ حسینؑ آگیا تو سیکڑوں سال کے پڑے ہوئے پردے یکسر اٹھ جائیں گے اور سارے حقائق بے نقاب ہو جائیں گے۔ صلوات۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ یہ بھی ایک اخلاقیات کا کام تھا اور علمی اعتبار سے اسے غزالی نے انجام دیا تھا لیکن چونکہ غزالی کی تحقیقات میں عقائد کی بنیاد پر بہت سے عیب اور بہت سی کمزوریاں اور بہت سے نقائص پائے جاتے تھے لہٰذا علّامہ محسن فیض کاشانی نے محجتہ البیضا کی متعدد جلدیں لکھیں فقط اس لئے کہ احیاء العلوم میں غزالی نے جہاں جہاں ٹھوکریں کھائی ہیں اور جہاں جہاں غلطیاں کی ہیں یا اخلاق سکھانے کے لیے جہاں جہاں اخلاق بگاڑا ہے اور جہاں جہاں بنیاد ان چیزوں کو

قرار دیا ہے جن کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان غلطیوں کی نشاندہی کی جائے تاکہ واقعاً اگر انسان صاحبِ اخلاق بن جائے تو صاحبِ اخلاق ہی بنے احسان فراموش نہ بنے۔ صاحب اخلاق بنے منکر حقائق نہ بنے۔ صاحب اخلاق ہو کر ان سے محبّت کرے جن سے محبّت کرنا چاہئے اور ان سے بیزار رہے جن سے بیزار رہنا چاہئے۔ ان حقائق کی نشاندہی کے لئے علاّمہ محسن فیض کاشانی صاحب تفسیر صافی نے محجۃ البیضا جیسی کتاب لکھی اور یہ عالم اخلاقیات میں بڑا کام تھا جو انھوں نے انجام دیا۔ اس کے بعد آخری دور میں دو کام انجام پائے جن میں آخری کام تھا جامع السعادات ملا مہدی نراقی رحمتہ اللہ علیہ۔ کہ انھوں نے یہ کتاب تصنیف فرمائی اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اخلاقیات کی دنیا میں اس جیسی کوئی کتاب نہیں ہے لیکن اگر کوئی کمزوری یا کوئی بات قابلِ تنقید کہی جاسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ انھوں نے بھی اپنے یہاں بنیاد اسی فلسفہ کو بنایا ہے جو روزِ اوّل سے چلا آرہا تھا۔ اسکی تفصیلات انشاء اللہ آئندہ مجالس میں آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔ فی الحال گذارش یہ ہے کہ وہ مسئلہ اخلاقیات جو پیغمبرؐ اسلام کی زندگی کا شاہکار ہے وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ وہ مسئلہ اخلاقیات جو پیغمبرؐ کی بعثت اور رسالت کا مقصد ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ اس پر اتنی مختصر کتابوں کا ہونا یہ اس بات کی علامت ہے کہ اخلاقیات کو وہ حق نہیں دیا گیا ہے جو اس کا واقعی حق ہے کہ یہ پیغمبرؐ اسلام کی بعثت کا مقصد اور آپ کی زندگی کا شاہکار تھا لہٰذا اس مسئلہ کو واقعاً ضرورت سے زیادہ اہمیت ملنی چاہئے تھی جو اہمیت بظاہر نہیں دی گئی لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات میرے موضوع سے الگ ہے۔ یہ میں تاریخ اخلاقیات گذارش کرنے کے لیے آپ کے سامنے گذارش کر رہا تھا اور تھوڑی دیر مزید آپ کے ذہنوں کو زحمت دینا چاہتا ہوں تاکہ آج اس تمہید کی منزل پر سارے مراحل طے ہو جائیں اخلاقیات کے بارے میں جب کتابیں لکھی گئی ہیں مختلف زبانوں میں تو ان کا مقصد

صرف علمِ اخلاق تھا اور اس کے بارے میں بھی عقلی قسم کی بحثیں تھیں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ عقلی بحثوں میں جب علماء داخل ہو جاتے ہیں تو اس مسئلے کی جتنی عقلی شقیں ہوتی ہیں ان سب پر بحث کرتے ہیں چاہے اس کا آپ کی زندگی سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن مسئلہ عقلی ہے لہٰذا عقلی اعتبار سے اس پر بحث ہونی چاہیئے اور انسان کی کل قابلیت یہ ہے کہ کوئی عقلی شق، کوئی عقلی رخ ایسا باقی نہ رہ جائے جس پر اس نے بحث نہ کی ہو۔ یہی ان کا کمال ہے۔ یہی ان کی کتاب کا کمال ہے اب اس کے بعد ان تمام بحثوں اور تحقیقات کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہے یا نہیں ہے۔ یہ ان کا مسئلہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ ان کے سامنے اگر آسمان رکھ دیا جائے تو وہ آسمان کے بارے میں جتنی تحقیقات ہو سکتی ہیں کریں گے چاہے آسمان رہ جائے یا ختم ہو جائے اگر زمین رکھ دی جائے تو زمین کے بارے میں جتنی تحقیقات ہو سکتی ہیں۔ سامنے لا کر رکھ دیں گے چاہے زمین پر آپ بسیں یا جا کے ہوا میں رہنے لگیں۔

ان کا آپ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا موضوع زمین ہے۔ ان کا موضوع آسمان ہے۔ ان کا موضوع کوئی فن ہے۔ ان کا موضوع کوئی علم ہے لہٰذا علم کے بارے میں جتنی عقلی بحثیں ہو سکتی ہیں کرتے رہیں گے چاہے ان کا تعلق آپ کی زندگی سے ہو یا نہ ہو مگر بنیادی بات یہ ہے کہ اگر واقعاً مسئلہ وہ ہے جو ہماری زندگی سے متعلق نہیں ہے تو آپ بحث کرتے رہیں ہم سنتے رہیں گے اور خوش ہوتے رہیں گے لیکن ظاہر ہے کہ آسمان تو ہم کو بنانا نہیں ہے لہٰذا آپ آسمان کے بارے میں جتنی معلومات فراہم کرتے رہیں گے ہم خوش ہوتے رہیں گے۔

آپ کی تحقیق میں زمین و آسمان کا فاصلہ کتنا ہے آپ بتا دیجئے سورج میں گرمی کتنی پائی جاتی ہے۔ آپ بتا دیں چاند میں خنکی کتنی پائی جاتی ہے۔ آپ بتا دیں سورج کا فاصلہ کتنا ہے آپ بتا دیں، چاند کا فاصلہ کتنا ہے آپ بتا دیں۔ سورج کا حجم کیا ہے۔

آپ بتادیں چاند کا حجم کیا ہے آپ بتادیں۔ ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ہم خوش ہوتے رہیں گے۔

——— مگر ان سارے مسائل کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور عزیزو! اخلاقیات کا مسئلہ نہ آسمان کا مسئلہ ہے اور نہ زمین کا معاملہ ہے۔ یہ نہ سمندروں کی گہرائیوں کا مسئلہ ہے اور نہ فضائے بسیط کا معاملہ ہے یہ تو انسان کی زندگی کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اگر آپ نے مسئلہ کی ایسی ہی بحث کی جس کو غریب انسان سمجھتا ہی نہیں ہے کہ اس بحث کا ماحصل کیا ہوگا تو یہ خالی ایک فلسفہ کی سیر ہوگی۔ اس کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

——— ہم چاہتے ہیں کہ اخلاقیات پر بحث کی جائے تاکہ انسان صاحب اخلاق ہو جائے۔ اخلاقیات پر بحث کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صداقت کے معنی پر بحث کی جائے کہ سچ کسے کہتے ہیں؟ سچ کی کتنی قسمیں ہیں یا سچ کیسے بولا جاسکتا ہے؟ اس کی فلسفی حقیقت کیا ہے؟ سچ کی منطقی حیثیت کیا ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ انسان سچا ہوا کہ نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ کے سامنے اگر مسائل رکھ دیجئے تو یہ شجاعت کے بارے میں اتنی بحثیں کریں گے کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی نہ بجھ سکے لیکن جب میدان میں قدم رکھنے کا معاملہ آجائے گا تو کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اس لیے کہ یہ شجاعت پر بحث کرنا جانتے ہیں شجاعت کو اختیار کرنا نہیں جانتے ہیں۔ یہ بات میں نے بظاہر بہت عجیب کہی ہے لیکن اگر آپ اس پر غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آج پوری دنیا کا نقشہ ایسا ہی ہے۔ مجھے یاد ہے ابھی سال بھر پہلے یہیں یہ بحث چل رہی تھی اور مختلف نشستوں میں مجھ سے نوجوانوں نے شطرنج کے بارے میں بحث کی کیونکہ عالم اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور مختلف خلفائے اسلام اس فن کے ماہرین تھے لہٰذا جتنا جتنا یہ عام ہوتا جائے گا۔ خلفائے اسلام کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ امام سجادؑ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ میں

جب کبھی شطرنج کا کھیل دیکھتا ہوں تو مجھے دربار یزید یاد آجاتا ہے کہ جب دربار یزید میں ہم کو حاضر کیا گیا تھا تو اس وقت یہی کاروبار چل رہا تھا۔

اب اس نئے دور میں ـــــــــــــــــــــــ

پھر ریڈیو سے، ٹی وی سے، اخبارات سے برابر مضامین اور پروگرام آرہے ہیں۔ تاکہ لوگ شطرنج کی اہمیت کو پہچانیں اور ظاہر ہے کہ نوجوان ذہن بچوں کے ذہن ہوتے ہیں۔ ان کا بنانے والا نہ معاشرہ ہوتا ہے نہ سماج ہوتا ہے۔ دور حاضر میں بشریت کے ڈھلنے کے لیے ایک ہی سانچہ بنا ہے جس کا نام ہے ٹی وی۔ اب نہ کوئی مدرسہ رہ گیا ہے نہ کوئی تربیت گاہ رہ گئی ہے، نہ کوئی درسگاہ رہ گئی ہے، نہ کوئی گھر رہ گیا ہے۔ جس قوم کے ذہن کو جیسا بنانا چاہیں آپ ٹی وی میں دس پروگرام ویسے ہی دے دیں۔ انشا..... سارے بچوں کا ذہن اسی سانچے میں ڈھل جائے گا یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب آپ کسی موضوع پر بات کریں گے تو ان کے پاس کوئی مدرک نہیں، کوئی سند نہیں۔ کوئی بنیاد نہیں ہے سوائے اس کے کہ ٹی وی پہ یہ آیا تھا ـــــــ ۔ ہمارے مشرقی معاشرہ میں تو پھر غنیمت ہے کہ ٹی وی ریڈیو سے ہٹ کر بھی کبھی ماں کبھی باپ، کبھی استاد کبھی عالم، کبھی مبلغ کبھی خطیب، کبھی مفکر، کبھی بزرگ آدمی دو چار باتیں بتا دیتے ہیں لیکن مغرب کا معاشرہ جو دنیا کا ترقی یافتہ معاشرہ کہا جاتا ہے۔ آپ وہاں چلے جائیے وہاں کوئی مربی انسانی ذہن کے لیے ہے ہی نہیں۔ نہ باپ کے لیے نہ بیٹے کے لیے، نہ زوجہ کے لیے، نہ شوہر کے لیے، نہ بھائی کے لیے، نہ بہن کے لیے۔ صرف ایک مربی ہے جس کا نام ہے ٹی وی۔ دنیا کے سارے کاموں سے فرصت پاکر آکے بیٹھ گئے اور جو سامنے آگیا وہی حقیقت ہے۔ بداخلاق بنانا ہو تو اسی کے ذریعہ، عیاش بنانا ہو تو اسی کے ذریعہ، فلسفی بنانا ہو تو اسی کے ذریعہ، اچھا بنانا ہو تو اسی کے ذریعہ، برا بنانا ہو تو اسی کے ذریعہ اور مشترک پروگرام کا فائدہ یہ ہے کہ جو

گھنٹے کا پروگرام آرہا ہے ایک گھنٹہ سائنس کا پروگرام ہے، ایک گھنٹہ تاریخ کا پروگرام ہے، ایک گھنٹہ جغرافیہ کا پروگرام ہے۔ آپ کہیں گے جناب ٹی وی سے بہت معلومات حاصل ہو رہی ہیں اور سب یہ صحیح ہیں۔ وہ سائنس کا پروگرام جو آرہا ہے وہ غلط نہیں ہے، جغرافیہ کے معلومات غلط نہیں ہیں۔ تاریخ کے معلومات غلط نہیں ہیں اور جب سب یہ صحیح ہیں اور ان سے ایک ذہن تیار کر لیا اعتماد کرنے والا، اعتبار کرنے والا۔ تو اب ایک گھنٹہ ناچ کا پروگرام، گانے کا پروگرام، برہنہ تصویروں کا پروگرام۔ جتنے خرافات ہو سکتے ہیں وہ سب پروگرام۔ اب آپ لاکھ بچّے کو سمجھایئے کہ یہ غلط ہے تو کہے گا کہ واہ یہی ٹی وی تو ہم کو سائنس سکھاتا ہے۔ یہی تو ہم کو جغرافیہ سکھاتا ہے۔ یہی تو ہم کو تاریخ سکھاتا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو سب غلط ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو یہ بھی صحیح ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ کھٹی کڑوی دوا دینے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ کڑوی دوا ہمیشہ کیپسول کے اندر ہی دی جاتی ہے۔ یہ تاریخ کا گھنٹہ کیپسول ہے۔ یہ جغرافیہ کا گھنٹہ کیپسول ہے اصل دوا وہی ہے جس کا نام ہے ناچ گانا۔ برہنگی، عیاشی، عیاری، نالائقی جس کی تعلیم کے لیے اتنا انتظام کیا گیا ہے اور ہمیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہم تم کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

ہم تمہیں جنگ کا نقشہ دکھانا چاہتے ہیں۔ ہم فوجوں کی حرکت دکھانا چاہتے ہیں ساری دنیا خوش ہو گئی کہ گھر بیٹھے معلوم ہو جائے گا کہ میدانِ جنگ میں کیا ہو رہا ہے۔ گھر بیٹھے معلوم ہو جائے گا کہ محاذِ جنگ پر کیا ہو رہا ہے لیکن محاذِ جنگ تو ختم ہو گیا۔ میدان تمام ہو گیا، لڑائی ختم ہو گئی، معاملات ختم ہو گئے۔ کاروبار نہیں ختم ہوا۔ اب نئے نئے محاذ عمل کھل رہے ہیں جن کو دکھلانے کے لیے وہ آئے تھے۔ وہ نہ کسی فوج کو دکھلانے آئے تھے نہ کسی لشکر کو دکھلانے آئے تھے۔ نہ کوئی منزل دکھلانے آئے تھے اور نہ کسی جنگ کا نقشہ دکھلانے آئے تھے، وہ جو کچھ دکھانے آئے تھے وہ اب دکھا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ذہنوں میں انسان کیسے داخل ہوتا ہے چنانچہ شطرنج کے

فضائل نشر ہو رہے ہیں اور نوجوان ذہن متاثر ہو رہے ہیں۔ اس بات سے کہ اس کے بڑے فائدے ہیں جناب دیکھئے یہ کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے۔ درحقیقت یہ یہ میدانِ جنگ کا نقشہ ہے۔ اُدھر کی فوج آ رہی ہے اِدھر کی فوج جا رہی ہے۔ انھوں نے حملہ کیا۔ انھوں نے کاٹ کر دی۔ اِنھوں نے حملہ کیا وہ یوں بچ کے نکل گئے۔ ان کا ہاتھی یوں بڑھ گیا۔ ان کا گھوڑا یوں آ گیا۔ یہ اصلاً میدانِ جنگ کا نقشہ ہے۔ اس سے ایک انسان جنگی صلاحیت حاصل کرتا ہے، جنگی تربیت حاصل کرتا ہے۔ یہ بہترین فلسفہ ہے جو مجھ سے کئی نوجوانوں نے بیان کیا جو اِن پروگراموں کے جاننے والے اور سمجھنے والے تھے لیکن میں نے ایک ہی لفظ کہا کہ بے شک جو آدمی شطرنج کا ماہر ہو گا وہ جنگ کے نقشے کو جانتا ہو گا۔ بے شک ادھر کی فوج بھی کھڑی ہوئی ہے ادھر کی فوج بھی کھڑی ہوئی ہے۔ یہ یوں بڑھے، وہ یوں پیچھے ہٹے۔ انھوں نے ادھر سے حملہ کر دیا، یہ پسپا ہو گئے۔ وہ جیتے یہ ہارے ...... یہ تماشہ نہیں ہے جس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ خالی انگلیوں کی حرکت کا ایک تماشہ ہے۔ یہ جنگ کی ایک تربیت ہے۔ یہ فوجی تربیت ہے یہ مقابلے میں اس کے نہ جاننے سے ملک ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اس کے جاننے سے ملک پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ —— تو کیا آپ فوجی تربیت کے مخالف ہیں؟ کیا آپ جنگی تربیت کے مخالف ہیں۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ لوگوں میں سلیقۂ جنگ پیدا ہو جائے۔

میں نے کہا بے شک شطرنج کی مشق انسان کو ماہر حربیات بناتی ہے بے شک شطرنج کی چال انسان کو ماہر جنگ بناتی ہے۔ مگر بدقسمتی ہے بیسویں صدی کی کہ آج تک ہم نے نہ دیکھا کہ کسی ملک نے کسی ملک پر حملہ کرنے کے لیے یا اگر کسی ملک پر حملہ ہو گیا ہو تو حملہ کو رد کرنے کے لیے اور ملک کو بچانے کے لیے شطرنج کے چیمپینوں کی بھرتی کی گئی ہو کہ یہ ۱۹۹۰ء کے چیمپین ہیں۔ وہ ۹۲ کے وہ ۹۳ کے وہ ۹۴ کے۔ عالمِ اسلام پر وقت پڑا ہے لہٰذا جتنے چیمپین ہیں بلا لیے جائیں۔

ہم نے تو آج تک نہ دیکھا کہ کسی ملیٹری میں کوئی چیمپین بلایا گیا ہو۔ یہاں وہی بلائے جاتے ہیں جو میدان میں لڑنے والے ہوتے ہیں۔ جنگ کرنے والے ہوتے ہیں۔ وزیر دفاع آئے گا، وزیر جنگ آئے گا۔ وہاں کے ماہر آئیں گے۔ ان میں سے کوئی کام نہیں آتا ہے تو آپ کسی اور کو بیوقوف بنائیں گے کہ ایک انسان اس سے جنگ کا ماہر ہو جاتا ہے۔ اسلام کوئی ایسا بھولا مذہب نہیں ہے کہ جس کی تعلیمات کو اتنی آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس نے اسی لیے دیکھا تھا کہ یہ کوئی ذہنی تربیت نہیں ہے اس میں سوائے اس کے کہ انسان کی ذہنی صلاحیتیں برباد ہو کے رہ جائیں اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ذہنی صلاحیت کے آگے بڑھنے کا امکان پیدا ہو جاتا تو اسلام میں سب سے پہلے شطرنج کی تعلیم ہی ہوتی مگر وہ جانتا تھا کہ ذہنی صلاحیت انسان کی برباد ہو جائے گی لہٰذا انسان پر پابندی عاید کر دی۔ ہاں اگر شطرنج سے شطرنج کی حیثیت ختم ہو جائے تو وہ الگ مسئلہ ہے۔ ہمیں ضرورت ان اخلاقیات کی ہے کہ جن سے انسان اپنی زندگی سنوار سکتا ہو۔ اپنی زندگی بنا سکتا ہو۔ ورنہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ صداقت کی حقیقت کیا ہے اور معلوم ہونے کے بعد بھی انسان سچا نہ ہو سکا۔ یہ معلوم ہو گیا کہ شجاعت کی حقیقت کیا ہے لیکن حقیقت معلوم ہونے کے بعد بھی انسان کے اندر ہمّت قلب پیدا نہ ہو سکی یا یہ معلوم ہو گیا کہ پاکیزگیٔ نفس کی حقیقت کیا ہے مگر معلوم ہونے کے بعد بھی انسان پاکیزہ نفس نہ ہو سکا۔ تو یہ اخلاقیات ہمارے کام آنے والے نہیں ہیں۔ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ یونان کی بحثیں ہیں۔ یہ یونان والوں کو مبارک ہوں۔ یہ باہر کے جھگڑے ہیں۔ یہ باہر والوں کو مبارک ہوں۔ اسلام ان اصلی اقدار کا درس دینا چاہتا ہے۔ اسلام ان اخلاقیات کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے کہ اگر انسان شجاعت کے بارے میں بڑھتا جائے تو اندر سے ہمّت پیدا ہوتی جائے۔ اگر انسان صداقت کے بارے میں بڑھتا جائے تو معلومات کے ساتھ جذبۂ عمل بھی بڑھتا جائے۔ ورنہ سرکار دو عالمؐ کا کمال

یہ نہیں تھا کہ آپؐ ماہرِ اخلاقیات تھے. عالمِ اخلاقیات تھے بلکہ آپ کا کمال تھا. اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ —— ماہرِ اخلاق ہونا اور ہے اور صاحبِ اخلاق ہونا اور ہے. فلسفی یا عالم اخلاقیات ہونا اور ہے اور صاحب اخلاق ہونا اور ہے پیغمبرؐ اپنے علم کے اعتبار سے عالم اخلاقیات تھے اور اپنے عمل کے اعتبار سے صاحبِ اخلاق تھے. صلوات . نعرۂ حیدری

بس اے عزیزانِ گرامی آج اس تمہید کی منزل میں اس سے زیادہ آپکے ذہنوں پر زور نہیں دینا چاہتا ہوں. یہ موضوع ہے بہر حال قابلِ غور اور قابلِ فکر. اور ان شاء اللہ آئندہ میں گذارش کروں گا. اور آپ اپنی فکر کو ایک نکتہ پر رکھ کر ان مسائل پر غور کر سکیں گے جو ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل ہیں. بس ایک آخری فقرہ کہہ کے بات کو منزلِ آخر تک لانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اخلاقیات کے جتنے شعبے ہیں، جتنے اس کے حصّے ہیں. ان سارے حصّوں کے بارے میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ اخلاقیات میں صداقت شامل ہے، اخلاقیات میں شجاعت شامل ہے. تہذیب نفس شامل ہے، سخاوت شامل ہے، کرم شامل ہے یہ سب شامل ہے مگر مشکل یہ ہے کہ انسان دنیا میں جتنے پائے جاتے ہیں. ان سارے انسانوں میں کوئی خوبی ہے تو کوئی خرابی بھی ہے کوئی کمال ہے تو کوئی نقص بھی ہے. اگر میں علمی اعتبار سے بہت بڑا عالم ہو جاؤں تو بھی میں اپنی کمزوری جانتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ سامنے آجائے گا تو میں آپ کو آگے بڑھا دوں گا. اس لیے کہ ہاتھ پاؤں چلانا آپ جانتے ہیں —— اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں کمالِ علم ہے فن شجاعت نہیں ہے ایک انسان بہت بڑا طاقتور ہے کوئی نہ ہو اکیلا میدان میں کود پڑے گا لیکن ایک مسئلہ پوچھ لیجئے گا تو نہیں جانتا ہے. ایک آدمی بہترین سچّا ہے لیکن بدترین بزدل بھی ہے. ہر آدمی کی زندگی میں ایک شعبہ کمال کا ہے اور ایک شعبہ کمزوری کا ہے. کوئی آدمی اس سے بچ نہیں سکتا ہے. ہم آپ سب اپنی زندگی کو جانتے ہیں اور میں جب ان انسانوں

کے لیے تفصیلات عرض کروں گا اور دس دن کے بعد پندرہ دن کے بعد آپ بیٹھ کر حساب لگائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کی زندگی اخلاقیات کے معیار پر مکمل نہیں ہے کسی آدمی کی زندگی اس معیار پر مکمّل نہیں ہے جو اخلاقیات کا معیار ہے۔ ایک طرف اگر انتہائی بلند ہے تو دوسری طرف انتہائی پست۔ تو حضور جب سارے انسانوں میں یہ کمی پائی جاتی ہے۔ سارے انسانوں میں یہ دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو آخر اخلاقیات کا معیار کیسے بنے گا۔

میں نے کہا فلاں صاحب کو دیکھ لیجئے۔ آپ جو ان کے پاس پہونچے تو معلوم ہوا کہ صداقت میں اتنے کامل ہیں کہ زندگی میں ایک بھی جھوٹ نہیں بولا لیکن جب کہا کارِ خیر میں چندہ دیجئے تو جیب تک ہاتھ جاتا ہی نہیں ہے۔ وہ کمال دیکھئے یہ کمزوری دیکھئے۔

صداقت میں وہ حال ہے اور سخاوت میں یہ حال ہے۔ ہر آدمی زندگی کے ایک شعبہ میں بڑا با کمال دکھائی دیتا ہے تو دوسرے شعبہ میں کہیں نہ کہیں کمزوری ضرور پائی جاتی ہے۔ واقعات آپکے سامنے ہیں۔ انسان کو کوئی فلسفہ دینا چاہیں، کوئی معیار دینا چاہیں تو کس کو معیار بنائیں۔ مشرق و مغرب عالم میں تلاش کیا۔ کوئی انسان ایسا نہ ملا جو اخلاقیات کے جملہ شعبوں میں ایک جیسا کمال رکھتا ہو تو خدایا جب تو چاہتا ہے کہ تیرے سارے بندے کمالِ اخلاق کی منزل پر آجائیں تو آئیں کیسے؟ کوئی نمونہ سامنے نہیں ہے؟ آواز آئی لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمہارے واسطے پیغمبرؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ یہ نہ کہنا کہ کوئی ایسا نہیں ہے۔ میں تمہارے سامنے ایسا نمونہ رکھے دیتا ہوں کہ جس کمال کی منزل کو چاہو وہ موجود ہے۔ صداقت چاہتے ہو کمالِ صداقت ہے۔ شجاعت چاہتے ہو کمالِ شجاعت ہے۔ عفّت چاہتے ہو کمالِ عفّت ہے۔ کون سا کمال چاہتے ہو ہر ایک کمال کردارِ پیغمبرؐ میں مل جائے گا۔ اگر کردارِ پیغمبرؐ نہ ہوتا تو اخلاقیات کا شعبہ فضا میں

معلق رہ جاتا۔ زمین پر کوئی نمونہ نہ تھا لہٰذا خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو صاحبِ خلقِ عظیم بنا کر بھیج دیا تاکہ ایک نمونہ تمہارے سامنے رہے اور جو صاحبِ اخلاق بننا چاہے اپنی زندگی کو پیغمبرؐ کی زندگی کے سانچے میں ڈھال دے اور کمالِ کردار کی منزل پر فائز ہو جائے۔
پروردگار تو نے صاحبِ خلقِ عظیم کو ہمارے درمیان رکھ کے ہم پر یہ احسان کیا ہے کہ ہم پیغمبرؐ کی پیروی کر کے، ان کے نقشِ قدم پر چل کے، ان کے کردار کو اپنا کر کمالِ کردار کی منزل کو پا سکتے ہیں۔ کمالِ اخلاق کی منزل تک جا سکتے ہیں مگر یہ کب تک رہیں گے جب یہ چلے جائیں گے تو کمال کا نمونہ کہاں ڈھونڈنے جائیں گے؟ جب یہ چلے جائیں گے تو کہاں وہ نمونہ ملے گا۔ اصحاب میں تو کوئی ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں میں تو کوئی ایسا نہیں ہے۔ خدا نے کہا گھبراؤ نہیں جب تک با کمال بننے والے رہیں گے میں کمال کے نمونے بھی رکھوں گا۔ خدایا ایک ہی نمونہ تو کمال کا تھا اور وہ بھی چلا گیا کہا ایک نہیں میرے پاس بہت نمونے ہیں اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ اہلِ بیت تم سے ہر برائی کو الگ رکھا۔ تم کو ہر طہارت کی منزل پہ رکھا جب تک سلسلۂ اہلِ بیت قائم رہے گا اخلاقیات کے نمونے ملتے رہیں گے۔ صلوات۔
اور یہی کمالِ اخلاق اور نقصِ اخلاق اور یہی فضائل اور رذائل کا معرکہ تھا جس کا نام ہے معرکۂ کربلا۔ ایک طرف صاحبِ خلقِ عظیم کا وارث، ایک طرف انتہائی بداخلاق بندہ۔ ایک طرف صاحبِ فضائل، ایک طرف دنیائے رذائل۔ یہی وہ معرکہ تھا جس کی سیکڑوں مثالیں آپ تاریخِ کربلا میں ڈھونڈ سکتے ہیں مگر چونکہ یہ استقبالِ محرّم کی مجلس ہے لہٰذا میں واقعۂ کربلا سے پہلے ایک منظر آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کربلا کا واقعہ درحقیقت فضائل و رذائل کا ٹکراؤ ہے۔ حسینیت کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے سامنے فضائل آشکار ہو جائیں یزیدیت یہ چاہتی ہے کہ دنیا رذائل میں ڈوب جائے۔ جب تک دنیا میں رذائل نہ پیدا ہوں گے اور عیوب نہ پیدا ہوں گے یزید کا قدرداں کون ہو گا۔ اسی لیے حسینؑ

بن علی علیہ السلام نے ہمیشہ ہر کام کے لیے ان افراد کا انتخاب کیا جن کے پاس کمال اخلاق تھا۔ جن کے پاس کمال فضائل تھا۔ جن کی زندگی میں کسی نقص، عیب اور کسی رذیلت کا گذر نہیں تھا۔ جس کی مثال اسی ماہ ذی الحجہ میں دیکھ لیجیے۔

حسینؑ ابن علیؑ نے کوفہ والوں کے مطالبہ پر اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ اِنّی بَاعِثٌ اِلَیْکُم اَخِی وَ ثِقَتِی وَ ابْنَ عَمِّی کوفہ والو میں تمہارے مطالبہ پر اسے بھیج رہا ہوں جو میرا بھائی ہے، میرے چچا کا بیٹا ہے۔ میرے لیے معتبر، قابل اعتماد ہے وہ مسلم ابن عقیل ہے۔ دیکھئے فضائل و رذائل کا ٹکراؤ۔ مسلم جا رہے ہیں حسینؑ کا خط لے کر، مسلم جا رہے ہیں سفیر حسینؑ ابن علیؑ بن کر۔ مسلم جا رہے ہیں نمائندہ حسینؑ ابن علیؑ بن کر۔ ایک طرف جناب مسلم ہیں اور ایک طرف کوفہ ہے۔ دونوں کے حالات کا ایک منظر نقطہ اس سے زیادہ آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کربلا کا واقعہ جو پیش آنے والا ہے فضائل و رذائل، اخلاق و بد اخلاقی کا ایک ٹکراؤ ہے جس سے حسینؑ بن علیؑ نے دنیا کو اخلاقیات سے روشناس کرایا اور یزید فنا ہو گیا۔

جناب مسلم کوفہ میں آئے اور اس اعلان کے ساتھ آئے کہ حسینؑ ابن علیؑ کے نمائندے اور سفیر ہیں اور مسجد میں حسینؑ کی امامت کا اعلان کیا۔ اپنی نمائندگی کا بھی اعلان کیا تاکہ ہر آدمی پہچان لے کہ یہ نمائندہ حسینؑ بن علیؑ ہیں۔ جو حقیقت ہے وہ مسلم کے کردار سے واضح ہے۔ اس کے بعد جب ابن زیاد کوفہ میں آیا اور لوگ استقبال کرنے کے لئے گھروں سے نکل آئے۔ تو اعلان ہو گیا کہ فرزند رسولؐ آ رہے ہیں۔

لہٰذا اہل کوفہ نکل پڑے استقبال فرزند رسولؐ کے لئے۔ ابن زیاد محمل کے اندر، محمل پر پردہ پڑا ہوا اور کوفہ والے استقبال کر رہے ہیں مَرحَبًا مَرحَبًا یَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰہِ فرزند رسولؐ ہم آپ کے استقبال کے لئے آئے ہیں۔ ہم نے آپ کے نمائندے کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ ہم نے آپ کو اپنا امام تسلیم کیا ہے۔ ہم نے مسلم کو اپنا قائد اور

رہنما بنایا ہے۔ یہاں تک کہ دارالامارہ کے قریب ابن زیاد کا قافلہ پہنچا اور ابن زیاد محمل سے نکل کر دارالامارہ کے اندر داخل ہوا۔ اب اعلان ہوتا ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کے بجائے یزید کا نمائندہ ابن زیاد آیا ہے۔ دیکھا آپ نے فرق کردار؟ استقبال کی صورت ہو یا نماز جماعت کی یا لڑائی کی مسلم ہر حال میں جو تھے وہی رہے مگر ابن زیاد وہ مکار انسان ہے جو کوفہ میں داخل ہونے کے لئے یہ اعلان کرا رہا ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ آ رہے ہیں

گویا امام حسینؑ کے احترام کے پردے میں کوفہ میں داخل ہونا یہ مکاری ابن زیاد کا حصہ ہے اور اعلان حقائق یہ مسلم کا حصہ ہے۔ اس کے بعد جب کوفہ کی صورتِ حال بدل گئی تو جناب مسلمؑ کو جناب ہانیؑ نے یہ مشورہ دیا کہ میں بیمار ہوں اور ابن زیاد بہرحال میری عیادت کے لئے آئے گا لہٰذا بہترین موقع ہے کہ جب ابن زیاد آئے تو میں آپ کو اشارہ کر دوں گا ـــ اور آپ اسے یہیں قتل کر دیجئے گا۔ وہ وقت آگیا۔ آنے والا آیا۔ اشارہ کرنے والے نے اشارہ کیا مگر جناب مسلمؑ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ جب آنے والا چلا گیا اور مسلمؑ سامنے آئے تو ہانیؑ نے کہا مسلم تم نے بڑا نرالا اور انوکھا موقع ہاتھ سے دے دیا۔ میں نے تم کو پسِ پردہ اسی لئے بٹھایا تھا کہ یہ بہترین موقع ہے ظالم آئے گا اور ظالم کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور کوفہ کے حالات رو بہ اصلاح ہو جائیں گے۔ میں نے بار بار تم کو اشارہ کیا مگر تم نے باہر آ کے اس ظالم کا خاتمہ نہیں کیا۔ مسلمؑ نے کہا غدّاری بنی ہاشم کا شعار نہیں ہے۔ مجھے لڑنا ہوگا میدان میں جا کے لڑوں گا۔ مجھے مقابلہ کرنا ہوگا تو کہیں اور جا کے مقابلہ کروں گا لیکن کوئی گھر میں مہمان آئے اور اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ بنی ہاشم کا شعار نہیں ہے۔

ـــــــــــــــــ یہ مسلمؑ کا اعلان ہے کہ مسلمؑ مجسمۂ فضائل ہیں۔ مسلمؑ حسینی اخلاق کا نمونہ ہیں۔ حسینی اخلاق کا مرقع ہیں۔ یہ ایک منظر دیکھ لیا آپ نے اب آخری منظر۔ جب جناب مسلمؑ کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ نماز مغربین کے بعد مسجد کے باہر آئے جس ہاتھ پر اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والے تھے جس کے پیچھے ہزاروں افراد

نماز با جماعت پڑھنے والے تھے جب مسجد کے باہر نکلے تو آپ۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ ایسی پریشانی کی حالت میں آدمی اپنے کردار کو بدل دیا کرتا ہے۔ ایسی کسمپرسی کے عالم میں انسان اپنے حرکات کو تبدیل کر دیا کرتا ہے مگر جنابِ مسلمؑ کا ایک حال ہو کوفہ کی گلیوں میں جا رہے ہیں راستہ نہیں معلوم ہے جب آئے تھے تو کوفہ کے حاکم بنکر آئے تھے۔ ہزاروں کے درمیان استقبال کے ساتھ آئے تھے۔ اب چلتے چلتے ایک مقام پر، ایک دروازے پر آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد صاحب خانہ خاتون نے دروازہ کھولا۔ اے بندۂ خدا تو یہاں کیوں بیٹھا ہے، کہا میں پیاسا ہوں اگر ممکن ہو تو مجھے پانی پلا دے۔ صاحبِ خانہ خاتون گھر کے اندر گئی اور جاکر پانی لے آئی۔ پانی لاکر جنابِ مسلمؑ کے حوالے کیا۔ جنابِ مسلمؑ نے پانی پی لیا۔ وہ ظرفِ آب لے کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آکر پھر دروازہ کھولا کہ اسکو اپنے گھر والوں کا انتظار ہے تو جیسے ہی دروازہ کھولا دیکھا وہ بندۂ خدا پھر بیٹھا ہوا ہے۔ کہا بندۂ خدا یہ کہاں کی شرافت ہے۔ میں نے تجھے پانی لاکر دے دیا تو نے پی بھی لیا۔ اب یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ تجھے نہیں معلوم ہے کہ کوفہ کے حالات کیا ہیں۔ تجھے نہیں معلوم ہے کہ زمانے کا رنگ کتنا خراب ہے۔ کسی اجنبی آدمی کا کسی عورت کے دروازے پر بیٹھنا اچھا نہیں ہوتا ہے۔ اپنے گھر کیوں نہیں جاتا ہے۔ بس یہ سننا تھا سر جھکا کے مسلم نے کہا مگر وہ کہاں جائے جس کا کوئی گھر نہ ہو؟ (خدا آپ کو کسی غم میں نہ رُلائے سوائے غمِ آلِ محمدؐ کے) بڑا نازک مرحلہ تھا۔ اے مومنہ وہ کہاں جائے جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ کہا کیا تم اس شہر میں مسافر ہو؟ فرمایا کہ تمہارے اس شہر میں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں مسافر ہوں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔

کہا تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟ کہا اگر تو نے سنا ہو تو ایک نبیؐ کا نواسہ حسینؑ ابن علیؑ ہے۔ کوفہ والوں نے حسینؑ ابن علیؑ سے نمائندے کا مطالبہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ ابن عقیل کو بھیجا تھا کہا۔ ہاں مجھے معلوم ہے میرا آقا کوفے میں ہے۔ میرے مولا کا نمائندہ مسلمؑ ابن عقیل ہے۔

میں کیا نہیں جانتی ہوں ؟ مجھے کون سی داستان سنا رہے ہو۔ کہا اگر تجھے معلوم ہے تو وہ مسلمؑ جس کے ہاتھ پر کوفہ والوں نے بیعت کی تھی وہ جس کے ساتھ اہلِ کوفہ نے غدّاری کی ہے اور بیعت توڑ دی ہے وہ مسلم میں ہی ہوں۔

اے شہزادے آپ! ——— آپ میرے مولا کے نمائندے ہیں۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ آیئے آیئے یہ گھر آپ کا ہے۔ میں تو آپکی خادمہ ہوں ——— جنابِ مسلمؑ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ مصلّائے عبادت بچھا دیا۔ رات مسلمؑ نے گذار دی عبادتِ الٰہی میں مگر جب صبح کا ہنگام آیا تو ابھی مسلمؑ مصلّی پر تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ مسلمؑ مصلّی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا طوعہ! دروازہ کھول دے۔ اس نے کہا شہزادے کیا ارادہ ہے؟ فرمایا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آرہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ابن زیاد کا لشکر گرفتاری کے لیے آگیا ہے۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ نامحرم تیرے گھر میں داخل ہو جائیں۔ دروازہ کھول دے میں باہر جارہا ہوں۔!

طوعہ نے کہا شہزادے یہ نہ کریں۔ فرمایا طوعہ یہ نہیں ہو سکتا ہے۔

طوعہ نے دروازہ کھولا، مسلمؑ باہر آئے۔ فوجوں نے گھیرا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ ایک حسینی سفیر اور مقابلہ میں پانچ سو کا لشکر۔ جنگ جاری رہی۔ سردار نے تین سو کی مزید کمک طلب کی۔ لیکن مسلمؑ کا یہ حال تھا کہ سوار کو پشتِ فرس سے کھینچ کر پشتِ بام پر پھینک دیا کرتے تھے اور مصروفِ جہاد رہے یہاں تک کہ ظالموں نے دھوکہ دے کر ایک گڑھا کھود کر اوپر سے بند کر دیا۔ مسلم لڑتے لڑتے گڑھے میں گر پڑے۔ چاروں طرف سے وار ہونے لگے۔ بالآخر گرفتار کر کے ابن زیاد کے سامنے لائے گئے لیکن کمال کردار کہ سلام نہیں کیا۔ اس نے حکم دے دیا کہ پشتِ بام پر لے جا کر سر قلم کر دیا جائے اور لاش کو باہر پھینک دیا جائے اور پھر کوفہ کی گلیوں میں گھسیٹا جائے۔

جلاد پشتِ بام پر لے کر آیا۔ مسلمؑ نے اجازت طلب کی۔ دو رکعت نماز ادا کی

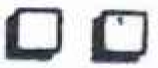
نماز کے بعد حسینؑ کی طرف رخ کیا۔ مولا! چاہنے والے کا آخری سلام۔ کوفہ نے غدّاری کی۔ آقا اب نہ آئیے گا۔

حسینؑ سرگرم سفر ہیں۔ ایک منزل پر قیام ہے۔ آنے والے سواروں کو دیکھ کر اصحاب سے فرمایا: ذرا دریافت کرو کہ کوفہ کا کیا حال ہے۔ سواروں نے آکر بتایا کہ مسلم کا سر قلم ہو چکا تھا اور لاش کو کوفہ کی گلیوں میں کھینچا جا رہا تھا اور کوئی دفن کرنے والا نہیں تھا۔

حسینؑ کے دل پر چوٹ لگی۔ بے قرار ہو کر رونے لگے۔ بہن کو خبر دی۔ زوجۂ مسلم کو تسلّی دی، بیٹی کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور کربلا کے مصائب کا آغاز ہو گیا۔

آج مسلمؑ کا لاشہ کھینچا گیا کہ کوئی وارث نہ تھا۔ کل سید سجادؑ ہوں گے۔ زینبؑ ہوں گی سکینہؑ ہوں گی اور اس کے بعد عصر کا ہنگام۔ کربلا کا صحرا! ادھر کے سوار ادھر، ادھر کے سوار ادھر۔ درمیان میں فرزند رسولؐ کا لاشہ۔

دل زینبؑ کی فریاد۔ امّاں! آپ نے بڑی شفقتوں سے پالا تھا۔ نانا! یہ آپ کا حسینؑ ہے جسے کاندھوں پر اٹھایا تھا۔ شاہ دلدل سوار آؤ۔ آپ کا لال گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہو رہا ہے۔ وامحمداہ - واعلیاہ - واحسیناہ!



P-3

مجلس ۲

اخلاق اور انسانیت

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

چودہ سو پندرہ ہجری کے آغاز کے ساتھ کل جو سلسلہ مجالس عشرۂ محرم شروع ہوا ہے آج اس کے دوسرے مرحلہ پر "فضائل اور رذائل" کے عنوان سے اس موضوع کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ انسانی زندگی سے اخلاق کا رابطہ کیا ہے۔

کل میں نے آپ کے سامنے یہ عرض کیا تھا کہ دین الٰہی نے مسئلۂ اخلاق کو انسانی زندگی کے لئے کس قدر عظیم اور اہم قرار دیا ہے اور آج جو گذارش کرنا ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات سے الگ ہونے کے بعد بھی انسانی زندگی اس وقت تک انسانی زندگی کہے جانے کے لائق نہیں ہے جب تک اس میں اخلاق اور اخلاقیات کو شامل نہ کر لیا جائے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے آپ کے سامنے تین باتیں گذارش کرنا ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ساری مخلوقات کے مقابلہ میں خود انسان کی عظمت اور اہمیت کیا ہے؟

اگر آپ کلام الٰہی کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کی کسی مخلوق کو وہ عظمت اور شرف حاصل نہیں ہے جو شرف اور عظمت پیدا کرنے والے نے اس انسان کو عطا کیا ہے۔

قرآن مجید نے انسان کی اس عظمت کا تذکرہ مختلف صورتوں میں کیا ہے۔
کبھی انسان کی بلندی کا اعلان دیگر مخلوقات کے مقابلے میں یوں کیا ہے کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ ہم نے امانت کو آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر کسی میں اتنا دم نہیں تھا کہ امانتِ الٰہی کا بوجھ اٹھا سکیں وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ یہ فقط انسان تھا جس نے بار امانت الٰہی کو اٹھا لیا۔ صرف قلبِ انسانی میں اتنی طاقت پائی جاتی تھی کہ یہ طاقت نہ زمینوں میں تھی نہ آسمانوں میں اور نہ پہاڑوں میں اور اسی نکتہ کی طرف دوسرے مقام پر اشارہ کیا گیا ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو پہاڑ خوفِ خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

پہاڑوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ آیاتِ قرآنی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ یہ سکت اور طاقت صرف قلبِ نازنین پیغمبرؐ میں پائی جاتی تھی کہ سارے قرآن حکیم کی معنویت اور روحانیت اور اس کے سارے حقائق کا بوجھ اٹھا لیا نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ پیغمبرؐ یہ قرآن وہ ہے جس کو روح الامین کے ذریعہ آپ کے قلبِ اقدس پر اتارا گیا ہے۔ قلب پیغمبرؐ میں وہ طاقت پائی جاتی تھی جو پہاڑوں میں نہیں تھی اور جب یہ بات آگئی ہے تو یہ جملہ کہے بغیر آگے بڑھنا بات کو ناتمام چھوڑنا ہے کہ قرآن مجید دیکھ رہا تھا کہ کہاں اتنی طاقت پائی جاتی ہے کہ اسے اپنی منزل بنایا جائے۔ پہاڑوں میں اتنا دم نہیں تھا۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے تھے لہٰذا اس نے اپنی منزل پہاڑوں کو نہیں قرار دیا۔ قلب پیغمبرؐ میں اتنی طاقت تھی لہٰذا قرآن حکیم نے اپنی منزل قلبِ پیغمبرؐ کو بنا دیا۔

تو عزیزو! جو قرآن حکیم اتنا عظیم ہو اور جس کا بوجھ اتنا سنگین ہو کہ پہاڑ نہ اٹھا سکیں اگر کوئی اٹھا سکے تو قلبِ پیغمبرؐ اٹھا سکے تو اگر پیغمبرؐ دنیا سے چلا گیا تو اس قرآن کی منزل کہاں ہو گی؟ اور اور وہ حقائق قرآن کن دلوں میں رکھے جائیں گے۔ ان دلوں میں رکھے جائیں گے جو ذرّوں سے کمزور ہوں۔ ان دلوں میں رکھے جائیں گے جو پہاڑوں سے کمزور ہوں۔ انہیں ایسے دل

درکار ہوں گے جن میں اتنی قوت پائی جاتی ہو کہ اگر پہاڑوں کو اشارہ کر دیں تو پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں۔ اور یہ بات میں اپنے جذبات اور عقیدت کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں یہ تو عیسائیوں کے فقرے ہیں جو آپ کے سامنے دوہرا رہا ہوں وَاللّٰهِ اِنِّی لَاَرٰی وُجُوْهًا لَوْ سَئَلُوا اللّٰهَ اَنْ یُّزِیْلَ الْجَبَلَ عَنْ مَکَانِهٖ لَاَزَالَهٗ خدا کی قسم میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ اللہ سے گذارش کر دیں کہ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دے تو یقیناً ہٹا دے گا۔ پہاڑوں کی کوئی طاقت نہیں ہے آلِ محمدؐ کی طاقت کے مقابلے میں۔

یہ تو مولائے کائنات مقامِ تفہیم میں سمجھانے کے لئے فرما رہے تھے کہ میری مثال استقامت میں پہاڑوں جیسی ہے کَالْجَبَلِ لَا تُحَرِّکُهُ الْعَوَاصِفُ وَلَا تُزِیْلُهُ الْقَوَاصِفُ اگر تم نے پہاڑوں کو دیکھا ہے کہ جھکڑ آتے ہیں گذر جاتے ہیں ہوائیں چلتی ہیں، اور آگے گذر جاتی ہیں مگر پہاڑوں کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں تو آؤ میرے ثباتِ قدم کو دیکھو۔ میں نے جب میدانِ جہاد میں قدم جما دئے تو کالجبل لا تحرکہ العواصف ولا تزیلہ القواصف ایسے قدم جما دئے کہ جیسے جھکڑ کی ہوائیں ہلا نہ سکتی ہوں۔ کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو علیؑ کے قدموں میں لغزش پیدا کر سکے۔

میں نہیں جانتا کہ مولا کی مصلحت کیا تھی کہ پہاڑ کی مثال دیں۔ آخر پہاڑ میں کیا خصوصیت تھی؟ شاید آپ یہ سمجھانا چاہتے ہوں کہ ثباتِ قدم کو دیکھنا ہے تو ان قدموں کے ثبات کو دیکھو جو پہاڑ کی طرح ثابت رہتے ہیں۔ ورنہ پہاڑوں پر تو قرار کے مناظر نظر آجاتے ہیں۔ ثبات کے مناظر نہیں نظر آتے ہیں۔

بہر حال ساری کائنات میں امانتِ الٰہی کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں تھی اگر یہ طاقت تھی تو اسی انسان میں۔

اس کے بعد پروردگار عالم نے ساری مخلوقات کو پیدا کیا تو اسی انسان کے لئے سَخَّرَ لَکُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ ہم نے روز و شب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ شمس و قمر کو تمہارے لئے بنایا ہے۔ پوری کائنات کو تمہارے لئے خلق کیا ہے۔ مگر جب تمہاری منزل

آئی تو میں نے اعلان کیا خلقتک لنفسی تم کو میں نے اپنے لئے بنایا ہے تمہارا انتخاب اپنے لئے کیا ہے۔

کتنا فرق ہے اس کائنات میں جس کو انسان کے لئے بنایا گیا ہے اور اس انسان میں جس کے لئے بنایا گیا ہے ــــــ اس کے بعد شاید کوئی یہ سوچتا کہ انسان زمین والوں سے اونچا ہوگا۔ کہ زمین کی مخلوقات، زمین کے ذخیرے، زمین کے خزانے انسان کے لئے بنائے گئے ہیں۔ پروردگار نے چاہا کہ دنیا کو سمجھا دے کہ زمین کی کیا اوقات ہے۔ انسان کے مقابلے میں کوئی آسمان والا بھی نہیں ہے اگر یقین نہ آئے تو جب آسمان کا سب سے اونچا رہنے والا زمین والے کے ساتھ چلے تو دیکھنا کہ کون فریادی ہے اور کون قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ کون یہ کہہ کے ٹھہر جاتا ہے کہ لَو دَنَوتُ بِقَدرِ اَنمُلَۃٍ لَاحتَرَقتُ اگر سر انگشت کے برابر بھی قدم آگے بڑھا دوں تو جل کے خاک ہو جاؤں گا اور کون ہے جو آسمانوں کے بعد عرش اعظم کی منزلیں طے کر رہا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ مالک نے بشر کو وہ مرتبہ عنایت کیا ہے جو مرتبہ دنیا میں کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے اور یہ تجربہ بھی آخری دن فقط معراج پیغمبرؐ میں نہیں ہوا بلکہ یہ تجربہ پہلے ہی دن ہو گیا تھا جب آسمان والے درخواست دے رہے تھے نَحنُ نُسَبِّحُ بِحَمدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری تقدیس کرتے ہیں سجدہ ہمارا شعار ہے رکوع ہمارا طریقہ کار ہے اور ادھر سے آواز آرہی تھی اِنِّی اَعلَمُ مَا لَا تَعلَمُونَ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو۔ یہ تاج خلافت ہے یہ کسی ملک مقرب کے سر پر نہیں رکھا جا سکتا ہے اگر یہ رکھا جائے گا تو کسی انسان کے سر پر رکھا جائے گا۔ یہ انسان کتنا عظیم الشان ہوگا، کتنا شریف انسان، کتنا بلند انسان ہوگا جس کو مالک نے حامل امانت بنا دیا ہو اور اس کے لئے کائنات کو مسخر کر دیا ہو۔ اور اس کو اپنی ذات کے لئے بنایا ہو۔

لیکن عزیزو اب میری گفتگو کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس انسان کی عظمت کا راز کیا ہے؟ کیا اس انسان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس کے پاس دو ہاتھ دو پیر ہوتے ہیں دو آنکھیں

اور دو کان ہوتے ہیں اور یہ اعضاء و جوارح اس کی عظمت کا راز ہیں؟ یہ گوشت و پوست یہ ہڈیاں اس کی عظمت کا راز ہیں۔

انھیں تو اگر بازار میں لے جایا جائے تو شاید ایک جانور کی قیمت بھی انسان سے زیادہ ہوگی کہ جانور کا گوشت انسان سے زیادہ ہوتا ہے جانور کی ہڈیاں انسان سے بڑی ہوتی ہیں اور اس کے جسم میں خون انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ جانور کی مادی حیثیت انسان سے بہر حال زیادہ ہے اسکی قدر و قیمت کو بھی انسان سے زیادہ ہونا چاہئے۔ تو پھر وہ کون سی شئی ہے جس نے انسان کو ساری مخلوقات سے بالاتر بنا دیا ہے۔ درحقیقت وہ انسان کی روحانی حیثیت ہے۔ وہ انسان کے فضائل ہیں۔ وہ انسان کے کمالات ہیں جن کو اخلاق کہا جاتا ہے کہ انھیں ملا دیا جائے تو انسان عظمتِ انسانی کا مالک ہو جائے اور انھیں الگ کر دیا جائے تو اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ یہ جانوروں جیسے ہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

انسان عظیم ہو تو عرش اعظم تک جانے کے قابل ہو جائے اور ذلیل ہو تو اتنا ذلیل ہو کہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جائے۔

یہی مسئلہ اصل میں اخلاقیات کا ہے جس کو میں آپ کے سامنے واضح کرنا چاہتا ہوں مگر اصطلاحات کی دنیا سے الگ، فلسفہ کے عالم سے جدا ہو کر اپنے بچوں کو سمجھانے کے لئے وہ بات جو برابر آپ سنتے رہتے ہیں اس کو ایک نئے رخ سے گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ جو لفظیں آپ سنتے ہیں ان کے معانی بھی میرے بچے سمجھ لیں اور انھیں یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ اخلاق کیا ہے؟ اور اس اخلاق نے انسان کو کن بلندیوں کا مالک بنا دیا ہے اور اس کے الگ ہو جانے کے بعد انسان کس قدر ذلیل ہو جاتا ہے۔

خدا نہ کرے کہ کسی جگہ پر دونوں چیزیں ایک منزل پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ میری دعا قبول ہونے والی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جہاں دو طرح کی چیزیں ایک منزل پر جمع نہ ہوں۔ اکائی اور وحدت صرف ذاتِ واجب کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ ہر چیز مرکب ہے اور ہر چیز میں دوئی پائی جاتی ہے اور جہاں دو چیزیں جمع ہوجاتی ہیں وہاں دونوں اپنا اپنا کام کرتی ہیں جس کی چند مثالیں گذارش کرنا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے میرے نوجوان اسے محسوس کریں۔ میری بہنیں، میری بیٹیاں اسے پہچانیں جو میں گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ یہ الفاظ سب کے سنے ہوئے ہیں اور سب کی زبانوں پر صبح و شام آتے رہتے ہیں۔ ایک چمڑے کی مشک آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ اس مشک کو چھوڑ دیجئے کدھر جائے گی؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ زمین کی طرف آئے گی کیوں؟ اس لئے کہ یہ چمڑے کی مادیت کا اثر ہے۔ اس میٹیریل کا اثر ہے کہ یہ بہر حال زمین کی طرف آئے گی چاہے زمین اس کو کھینچے یا اسکی اوقات اسے گرادے۔ لیکن اگر تھوڑی سی ہوا اسی مشک کے اندر بھر دی جائے اور اس کو تالاب میں یا حوض میں یا دریا میں یا سمندر میں کہیں پانی کے اوپر رکھ دیا جائے تو اگرچہ جس حوض میں پانی ہے اس پانی کے نیچے زمین ہی ہے اور پانی فضا میں معلق نہیں ہے لیکن مشک کے اندر ہوا بھری ہوئی ہے لہٰذا آپ اسے دبا کے بھی نیچے لے جانا چاہیں تو وہ نیچے جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ابھی تک نہ دبانے کی ضرورت تھی نہ زور لگانے کی، نہ طاقت صرف کرنے کی ضرورت تھی نہ زور آزمائی کی جیسے ہی آپ نے چھوڑا فوراً اس نے زمین کا رخ کیا لیکن اب تھوڑی دیر کے بعد حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ آپ اسے دبا کے زمین تک لے جانا چاہتے ہیں اور وہ جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا انقلاب کیسے آگیا ہے؟ اس انقلاب کا راز صرف یہ ہے کہ پہلے یہ مشک خالی تھی اور چمڑا اس کا مادہ تھا اور اسکی خاصیت یہ تھی کہ اس کا رخ ہمیشہ خاک کی طرف ہوگا لیکن اب اس کے اندر ہوا آگئی ہے اور ہوا زمین کے اوپر رہنے والی چیز نہیں ہے بلکہ بلندیوں پر رہنے والی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مکانات میں نیچے کی منزل میں رہتے ہیں وہ اکثر ہواؤں سے محروم رہتے ہیں مگر جو دوسری اور تیسری منزل پر رہتے ہیں وہ خالی ایک کھڑکی کھول دیتے ہیں اور ہوا آجاتی ہے اس لئے کہ ہوا کی جگہ زمین پر نہیں ہے زمین سے بالاتر ہے۔ تو ہوا کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کھنچ کر اوپر لے جائے جہاں اس کی جگہ ہے کہ اس کا مادہ انتہائی لطیف ہے۔ چمڑے کی کثافت کا تقاضا

یہ تھا کہ نیچے لے آئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشک کے اندر ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ آپ دباتے جاتے ہیں اور وہ اوپر چلی جا رہی ہے ہوا اپنا زور لگا رہی ہے کہ اوپر لے جائے اور مادہ اپنا زور لگا رہا ہے کہ نیچے لے جائے مگر مشکل یہ ہے کہ جو ہوا اس کے اندر داخل ہو گئی ہے اس ہوا کا پریشر اس چمڑے کی کثافت سے زیادہ ہے کہ اگر چمڑے کی کثافت زیادہ ہوتی تو وہ پیر کھینچ کرلے جاتی مگر ہوا کو پانی کا سپوٹ مل گیا ہے اور زمین کی طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ یہی حال گیند کا بھی ہوتا ہے۔ یہ مثال جلدی سمجھ میں آجائے گی کہ فٹ بال کے فٹ بال بننے سے پہلے دو کان سے آپ خرید کر لائے یہ ایک چمڑے کی یا پلاسٹک کی چیز تھی جیسے ہی آپ نے چھوڑا ویسے ہی گر گئی اور زمین پر آگئی یا غبارہ جب تک غبارہ نہیں بنا ہے اگر آپ اس کو چھوڑ دیجئے تو فوراً زمین ہی پر گر جائے گا لیکن جیسے ہی ہوا بھر گئی اب بچہ بے چارہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہے لیکن غبارہ اوپر جا رہا ہے۔ یہ غریب ڈور کو کھینچ رہا ہے اور وہ اوپر جا رہا ہے۔ جہاں بچے کی طاقت کمزور پڑی غبارہ اڑ کے چلا گیا۔ بچہ دیکھتا رہ گیا تو کیا غبارہ کی جگہ آسمانوں پر ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر کوئی ذریعہ ایسا نکل آئے کہ جو غبارہ میں ہوا بھری ہوئی ہے اس کو نکال دیجئے تو دو منٹ کے بعد پھر وہیں آکر گر جائے گا جہاں سے اڑ کے گیا تھا۔ یعنی جب تک غبارہ غبارہ ہے چمڑہ ہے۔ پلاسٹک ہے یا کوئی اور شئی ہے اسکی جگہ زمین پر ہے لیکن چونکہ ہوا کی جگہ بلندی ہے لہٰذا جیسے ہی ہوا اس کے اندر داخل ہو گئی جھگڑا شروع ہو گیا۔ کشمکش شروع ہو گئی غبارہ اِدھر کھینچنا چاہتا ہے ہوا اُدھر کھینچنا چاہتی ہے جب تک ہوا کا زور چلتا رہے گا وہ اوپر جاتا رہے گا اور جب ہوا نکل جائے گی یا اس کا زور ختم ہو جائے گا تو دوبارہ پلٹ کر زمین پر آجائے گا۔ تو جب بھی کسی جگہ پر دو طرح کی طاقتیں جمع ہو جاتی ہیں یہ کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے آپ دیکھ لیجئے کہ جہاں چار مومنین بیٹھ گئے وہاں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی موضوع چھیڑ دیجئے انشاء اللہ رات بھر بحث ہوتی رہے گی کہ یہ اپنے مزاج کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے مزاج کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ دو مزاج والے ایک جگہ اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اب جس کی طاقت زیادہ ہو گی انسان ادھر چلا جائے گا۔ جیسے اکثر مومنین کو دیکھا گیا ہے کہ جب سے شیطان

گھروں میں آگیا ہے اب کسی کو شیطان کے یہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے پہلے جب کسی مومن کو سینما ہال سے نکلتے دیکھتے تھے تو پوچھتے تھے آپ یہاں کیسے؟ آپ تو مسلمان مومن ہیں۔ نمازی روزہ دار پرہیزگار ہیں؟ کہا حضور میں نہیں آیا۔ کیا کروں بے چارے ان سے تعلقات ہیں اسی دنیا میں رہنا ہے تو کچھ تو تعلقات کو نبھانا ہوگا۔ یہ کھینچ لے آئے ہیں ہم چلے آئے ہیں گویا جب بھی دو طاقتیں ایک جگہ جمع ہوں گی یہ کشمکش بہر حال ہوگی جہاں تک آپ غور کرتے چلے جائیں گے دنیا کے سارے جھگڑوں کی بنیاد یہی ہے ورنہ ایک اکیلے میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا ہے جب دو طاقتیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں وہ اپنے باپ کے گھر کی پلی ہیں یہ اپنے باپ کے گھر کے پلے ہیں۔ رشتۂ ازدواج نے دونوں کو ایک گھر میں جمع کر دیا ہے۔ اب صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی کشمکش بہر حال جاری رہے گی۔ ان کو چائے بغیر چین نہیں ہے۔ ان کے گھر میں چائے کا رواج نہیں ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک گھنٹہ بعد چائے بن کر آئے۔ وہ کہتی ہیں جناب سوچئے آپ اس چائے کا فائدہ کیا ہے بلا وجہ پیسے کی بربادی ہے۔ اس میں تو یہ عیب ہے۔ یہ خرابی ہے یہ نقص ہے اور بحث جاری ہے کیوں؟ اس لئے کہ دو طاقتیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ اب کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ یہ ہر گھر کا حال خود بتائے گا۔ میں صرف مختلف مثالوں سے اسکو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب دو طرح کی طاقتیں ایک مقام پر جمع ہو جائیں گی تو یہ کشمکش بہر حال ہوگی۔ اس سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی ہے۔ یہ کام بہر حال ہونے والا ہے۔ اب کون ہارے گا کون جیتے گا یہ بعد کا مسئلہ ہے۔ اب اگر یہاں تک آپ کے ذہن میرے ساتھ چلے ہیں تو اب وہ پرانا محاورہ دہرائیے کہ انسان دو چیزوں سے مل کر بنا ہے ایک جسم اور ایک روح اور اس کے معنی پر غور کیجئے کہ ان دونوں چیزوں سے مرکب ہونے کا اثر کیا ہے اور اس غبارہ اور ہوا نے مل کر کیا مصیبت برپا کی ہے۔ انسانی وجود کے اندر کیا قیامت برپا ہو گئی ہے۔ آپ اس کشمکش کو پہچانیں جو آج میں آپ کے سامنے گذارش کرنا چاہتا ہوں اور جو روح اخلاقیات ہے۔ یہ کشمکش کیا ہے۔ ایک یہ جسم ہے۔ ہڈی، چمڑا،

گوشت اور ایک روح ہے جو اس سے بہر حال بالاتر ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ تو خدا بہتر جانتا ہے اور جب اس نے نہیں بتایا تو میں کون بتانے والا یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ پیغمبرؐ یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ روح کیا چیز ہے؟ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کہہ دیجئے یہ ایک امر خدا ہے یعنی تم سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہو تو ہم تمہیں کیا بتائیں۔ یہ ایک امر خدا ہے جب کبھی امر خدا کے معنی سمجھ میں آجائیں گے تو روح کو خود ہی پہچان لیں گے۔ اب لوگ پریشان ہیں کہ یہ امر خدا کیا چیز ہے؟ امر ربی کیا ہے۔ ارشاد ہوا وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے تم نہیں سمجھ سکتے کہ روح کیا ہے؟ تو نہ خدا نے بیان کیا نہ پیغمبر نے لوگوں کو بتایا تو میں کیا بتاؤں گا۔ لیکن یہ طے شدہ ہے کہ روح بہر حال ایک لطیف شئی ہے ایک روحانی چیز ہے، ایک غیر مادی ہے ایک مجرّد ہے ایک بالاتر چیز ہے ایک امر خدا ہے۔ امر خدا کوئی مادہ تو ہے نہیں۔ میٹریل نہیں۔ تو انسان کے ایک حصّے کا نام ہے جسم۔ مادہ، گوشت پوست ہڈی چمڑا اور ایک حصّہ کا نام ہے روح۔ لطیف، غیر مادی، مجرد، پاکیزہ، فضائی، ہوائی، آسمانی، عرشی، خدا جانے یہ کہاں کی چیز ہے۔ میں نہیں جانتا اور اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو ایک لفظ عرض کردوں گا خود پہچان لیجئے گا کہ یہ کہاں کی چیز ہے۔ اے میرے فرشتو میں ایک انسان بنانے جا رہا ہوں اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ طِیْنٍ میں مٹی سے ایک بشر بنانے جا رہا ہوں۔ یہیں کی مٹی سے ایک بشر بننے جا رہا ہے اس کے بعد دوبارہ آواز آئی فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُوْحِیْ جب یہ پیکر تیار ہو جائے اور میں اس میں اپنی روح پھونک دوں فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ تو تم سب کے سب سجدے میں گر پڑنا۔ پہچانا آپ نے۔ یہ نہیں کہا کہ میں ایک بشر اپنی مٹی سے بنانے جا رہا ہوں کہ کوئی خاص مٹی ہے جس سے بننے والے ہیں۔ نہیں۔ میں ایک بشر بنانے والا ہوں۔ طین سے۔ تراب سے۔ مٹی سے۔ خاک سے۔ یہ تو ہوگئی مٹی تراب طین۔ لیکن اس کے اندر جو روح شامل کی جائے گی وہ کوئی ہوائی فضائی نہیں ہے مِنْ رُوْحِیْ میں اپنی روح کمال اس کے اندر رکھنا چاہتا ہوں۔ کہاں یہ مٹی، یہ مادہ، یہ خاک جو ہمیشہ قدموں کے نیچے رہنے والی ہے اور کہاں وہ روح پروردگار جس کو خدا نے اس کے اندر داخل

کر دیا ہے جو رشتہ غبارہ اور ہوا میں ہے اس سے کہیں زیادہ دقیق اور لطیف رشتہ اس روح و جسم میں ہے کہ جو ہوا مشکیزہ کے اندر آئی ہے وہ اتنی لطیف نہیں ہے جتنی روح خدا لطیف ہے تو خدا نے ایک انسان تو بنا دیا ایک بشر تو تیار کر دیا مگر اسی کے ساتھ کشمکش کی ایک دنیا بھی آ گئی، ایک معرکہ کارزار بھی گرم ہو گیا۔ ایک طرف وہ مادہ ہے جو ادھر کھینچ رہا ہے۔ یہ ہڈی چمڑا گوشت ہے جو انسان کو ادھر کھینچ رہا ہے اور ایک طرف وہ روح خدا ہے جو اُدھر کھینچ رہی ہے اور بے چارہ انسان پوری زندگی اسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ جسم اِدھر کھینچتا ہے اور روح اُدھر کھینچتی ہے۔ اَب کس وقت کون غالب آ جائے گا۔ یہ تو بعد میں طے ہو گا مگر یہ معرکہ بہرحال جاری رہے گا۔

کبھی انسان حد وسط میں رہے گا کہ نہ یہ پامال ہونے پائے نہ وہ تباہ ہونے پائے نہ جسم کے تقاضے فنا ہونے پائیں اور نہ روح کے تقاضے مٹنے پائیں یا بیلنس نہیں قائم کر پائے گا تو کبھی اِس کی تباہی ہو گی اور کبھی اس کی تباہی ہو گی۔ اگر بیلنس قائم ہو جائے گا تو زندگی الگ ہو گی اور اگر بیلنس قائم نہیں ہو گا تو کبھی اِدھر چلا جائے گا کبھی اُدھر چلا جائے گا۔ یہی انسان کی پوری زندگی کا نقشہ ہے اور انھیں تقاضوں کا معرکہ جاری رہے گا۔ یہ تقاضے کیا کیا ہیں؟ انھیں یوں پہچانئے کہ انسان اپنے اندر دو چیزیں رکھتا ہے۔ ایک کا نام ہے خواہش اور ایک کا نام ہے غضب اور غصہ جہاں جہاں یہ جسم پایا جاتا ہے یہ دو باتیں ضرور ہوں گی۔ ایک کا نام ہو گا خواہش اور ایک کا نام ہو غیظ و غضب۔ جس میں یہ نہ ہوں وہ بے حیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ ہم کو غصہ نہیں آتا ہے۔ کوئی آپ کے ناموس پر ہاتھ ڈال دے تو آپ کو غصہ نہیں آئے گا؟ کوئی خدا کو برا بھلا کہے گا تو غصہ نہیں آئے گا؟ کوئی نبی کو برا کہے گا تو غصہ نہیں آئے گا؟ کوئی امام کو برا کہے گا غصہ نہیں آئے گا؟ کون شریف آدمی دنیا میں ایسا ہے جس کو غصہ نہیں آتا ہے۔ یہ غضب تو وہ صفت ہے جو خدا تک پہنچی ہے اِنَّ اللّٰہَ یَغۡضِبُ بِغَضَبِ فَاطِمَۃَ فاطمہؑ کے غضب سے خدا غضبناک ہوتا ہے۔ اگر یہ کوئی عیب ہوتا تو یہ صفت پروردگار تک کیسے پہنچ جاتی۔ تو ہر مخلوق میں یہ دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کا نام ہے خواہش اور ایک کا نام ہے

غیظ وغضب۔ خواہش کی کتنی قسمیں ہیں یہ آپ کو معلوم ہے۔ پیٹ کی خواہش روٹی، پیاس کی پانی، آنکھ کی خواہش منظر، کان کی خواہش آواز، پیر کی خواہش زمین۔ سب کی خواہش الگ الگ ہر اور یہ پورا وجود کچھ نہ کچھ ضرور چاہتا ہے۔ کون ایسا وجود ہے جو کچھ نہیں چاہتا ہے۔ یہ انسان پورا مجسمہ ہے خواہشات کا۔ کتنی خواہشات ہیں آپ سب جانتے ہیں ہر چیز کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور انھیں خواہشات کے پہلو میں ہر جگہ غصہ رکھا ہوا ہے۔ باہر نکلے بھائی چائے پلائیے۔ کہدیا نہیں پلائیں گے۔ جب آپ نے کہا چائے تو یہ کون بول رہا تھا۔ اس کا نام تھا خواہش اور جب اس نے کہدیا نہیں پلائیں گے تو کہا جائیے آپ سے تعلقات ختم ہو گئے۔ اب کون بول رہا ہے۔ اس کا نام ہے غضب۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ پہلی منزل پر خواہش ہوتی ہے اور جیسے ہی خواہش پوری نہیں ہوتی ہے خود بخود غصہ آجاتا ہے۔ بیٹا باپ سے ناراض، بیوی شوہر سے ناراض، شوہر بیوی سے ناراض، عوام علماء سے ناراض، علماء عوام سے ناراض۔ جس کی خواہش پوری نہ ہو سکی سب ناراض۔ آپ جو چاہتے ہیں میں نے نہیں پڑھا آپ ناراض اور جو میں کہہ رہا ہوں آپ نہیں سمجھنا چاہتے۔ میں آپ سے ناراض۔ یہاں پوری دنیا کا ایک ہی حال ہے یعنی پہلے مرحلہ میں خواہش ہوتی ہے اور جیسے ہی خواہش کو ٹھیس لگی ویسے ہی غصہ نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ اسی لئے ایک سمجھ دار نے سچ کہا تھا۔

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم　　　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس لئے کہ ٹھیس لگی نہیں کہ غصہ آیا نہیں۔ گویا جب تک یہ جسم آپ کے ساتھ رہے گا یہ کاروبار چلتا رہے گا۔ اب اس کے بعد دوسرا ڈپارٹمنٹ روح کا ہے جس کا اصلی کاروبار ہے فکر! علم! اس کا کوئی تعلق انسان کے ہاتھ پاؤں سے نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں سلامت رہیں جب بھی انسان مفکر ہوگا اور ہاتھ پاؤں کاٹ دئے جائیں جب بھی اسکی فکر میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ علم و فکر، یہ سارے شعبے وہ ہیں جن کو روح نے اپنے حصے میں لے لیا ہے اور سارا کاروبار خواہش و غضب کا جسم کے حوالے کر دیا ہے اور پوری زندگی انھیں مسائل کا شکار رہتی ہے اور ان سے کوئی آدمی کبھی بچا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نہیں سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ٹھیک ہی گذر رہی ہے۔ نہیں ٹھیک

نہیں گذر رہی ہے۔ مشکلات ہیں، معرکے ہیں۔ تو ایک طرف فکر، ایک طرف خواہش اور ایک طرف غضب۔ ان تینوں کے تین حالات ہیں ایک بیلنس اور ایک ڈس بیلنس پھر جو چیز بیلنس کو کھو بیٹھتی ہے اس کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں کبھی آگے بڑھ جاتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

بیلنس کے معنی یہ ہیں کہ سیدھے راستے پر رہے اور اگر بیلنس ختم ہو جائے گا تو یا آگے بڑھ جائے گا یا پیچھے ہٹ جائے گا۔ مثال کے طور پر ہماری ضرورت ہے مہینہ میں ایک ہزار روپے کی۔ ایک ہزار روپے ہم خرچ کریں گے تو ہماری زندگی بیلنس میں رہے گی لیکن اگر چار ہزار ہم نے خرچ بڑھا دیا تو کبھی چندہ کی نوبت آجائے گی تو کبھی فاقہ کی، کبھی قرض کبھی ادھار، کبھی پریشانی، کبھی الجھن۔ اسی طرح اگر ہم نے کم کر دیا تو نئی پریشانی پیدا ہو جائے گی کہ پیسے تو بچ گئے لیکن لوگ کہیں گے کہ کنجوس ہے، بخیل ہے، منحوس ہے؟ تو ہر طاقت کے تین حصّے ہوں گے یا بیلنس، اعتدال اور حد وسط یا آگے پیچھے بڑھنے کی عادت۔ تو جب فکر بالکل صحیح راستے پر چلتی ہے تو اس کا نام ہوتا ہے حکمت۔ اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا اگر کسی کو حکمت دے دی گئی تو سمجھو کہ خیر کثیر مل گیا۔ خیر کثیر پیسہ نہیں ہے وہ تو فرعون و قارون کے پاس بھی تھا۔ خیر کثیر حکمت ہے تو جس کو حکمت مل گئی اسے خیر کثیر مل گیا۔ اب اس کے بارے میں سوچیں جس کے بارے میں کہا گیا يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یہ پیغمبرؐ کتاب و حکمت پڑھانے کے لئے آیا ہے۔ پیغمبر حکمت سیکھنے نہیں آیا۔ پیغمبرؐ حکمت سکھانے کے لئے آیا ہے۔ حکمت سیکھنے والا وہ ہوتا ہے جس کی فکر صحیح راستے پر چلتی ہے کہ اگر فکر بہک جائے تو انسان حکمت سیکھنے والا نہیں ہو سکتا ہے سکھانے والا کیسے ہو گا۔ تو اب وہ کتنا بہکا ہوا انسان ہو گا جو معلّم حکمت کے بارے میں بھی سوچے کہ اسکی فکر بہک گئی ہے۔ صلوات۔

فکر کے صحیح راستے پر چلنے کا نام ہے حکمت اور جب یہی فکر راستے سے ہٹ جاتی ہے تو اگر آگے بڑھ گئی تو وہی حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ آپ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سمجھدار ہو گئے ہیں۔ سمجھدار ہونا کوئی عیب نہیں ہے لیکن ضرورت سے زیادہ سمجھدار ہونا عیب ہے۔ فکر کا ایک مرحلہ وہ ہے جو بالکل سیدھا

دانشمند ہے۔ ایک آگے بڑھ جانے والا راستہ ہے جس کو کہتے ہیں ضرورت سے زیادہ سمجھدار ہو جانا۔ ایک پیچھے رہ جانے والا راستہ ہے جس کا نام ہے بیوقوفی، حماقت، سفاہت۔

اب آئیے خواہشات کا حال دیکھیں۔ خواہشات میں بھی کبھی بیلنس ہوگا، کبھی آگے بڑھ جائیں گے کبھی پیچھے ہٹ جائیں گے۔ لہٰذا یہاں بھی تینوں حالات پیدا ہوں گے بیلنس رہ جائے تو اس کا نام ہے عفت یعنی انسان ہر طرف سے مالیات میں، عزت میں، آبرو میں ہر اعتبار سے پاکدامن رہے اور اگر خواہش میں حد سے تجاوز ہو جائے تو اسے کہا جائے گا لالچ۔ اور اگر حد سے پیچھے رہ جائے تو اس کا نام ہوگا بخل۔

یہی حال قوتِ غضب کا ہے کہ اس کے بھی تین حالات ہیں۔ اعتدال کا نام ہے شجاعت آگے بڑھ جانے کا نام ہے تہوّر یعنی طاقت کا بے جا استعمال اور ضرورت کے بعد بھی استعمال نہ کرنے کا نام ہے بزدلی۔

انیسؔ مرحوم نے جنابِ حُر کا مرثیہ لکھا تو حُر کی زندگی کے دو رخ کئے۔ ایک رخ تھا جب لشکر ابن زیاد میں تھے اور ایک رخ وہ تھا جب صبح عاشور خدمتِ حسینؑ میں آگئے۔ اُس وقت ہزار کے سپہ سالار تھے۔ اِدھر آنے پر امام حسینؑ نے سردارِ لشکر بھی نہیں بنایا۔ سرداری اُدھر ہی تھی۔ طاقت تھی، ہمت تھی، قوت تھی، زورِ بازو تھا، اسلحے تھے، سب کچھ تھا مگر خدمتِ حسینؑ میں نہ تھے۔ لہٰذا انیسؔ نے فرمایا۔

"بخدا فارس میدان تہور تھا حر" اہلِ فن جانتے ہیں کہ شجاعت اور تہور میں وزن کا کوئی فرق نہیں ہے جو وزن ہے شجاعت کا وہی وزن ہے تہور کا لیکن شجاعت کے اور تہوّر کے وزن میں کوئی فرق نہ ہونے کے باوجود انیسؔ نے یہ نہیں کہا کہ "بخدا فارس میدان شجاعت تھا حر" جہاں قافیوں کی کوئی کمی نہ تھی مگر کیسے کہدیں کہ حر میدان شجاعت کا شہسوار ہے جبکہ لشکر ابن زیاد میں ہے اور اُدھر کا نوکر ہے۔ شجاعت قوت غضب کے بیلنس کا نام ہے۔ بیلنس ہوتا تو اِدھر ہوتا اُدھر نہ ہوتا۔ صلوات۔

تو عزیزانِ محترم میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ غضب اگر بیلنس میں رہے تو اس کا نام ہوگا

شجاعت۔ تین شعبے انسانی زندگی کے ہیں اور تینوں شعبوں کی تین تین حدیں ہیں۔ ایک درمیانی حد ہے ایک آگے بڑھ جانے والی کیفیت ہے، ایک پیچھے ہٹ جانے والی صورت ہے فکر کی درمیانی حد کا نام ہے حکمت، خواہش کی درمیانی حد کا نام ہے عفت اور غضب کی درمیانی حد کا نام ہے شجاعت اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام ہے عدالت۔

یہ جو آپ سنتے رہتے ہیں کہ امام جماعت میں عدالت کا ہونا ضروری ہے قاضی صاحب کو عادل ہونا چاہئے گواہ کو عادل ہونا چاہئے اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ فکر حکمت سے الگ ہونے پائے نہ خواہش عفت سے الگ ہونے پائے اور نہ غضب شجاعت سے الگ ہونے پائے اگر تینوں کا بیلنس برقرار رہے تو اس کا نام ہوگا عدالت۔ جو انسان تینوں میں بیلنس کرلے اسکو کہا جائے گا عادل اور جس کو اعتدال دے کر دنیا میں بھیجا گیا ہو اس کا نام ہے معصوم۔ صلوات نعرۂ حیدری۔

بس عزیزان محترم میں بات کو مختصر کر کے تمام کردینا چاہتا ہوں۔ باقی باتیں انشاء اللہ آئندہ تفصیلات کے ذیل میں آپ کو خود ہی معلوم ہو جائیں گی۔ انسانی زندگی مجموعہ ہے دو چیزوں کا ایک روح اور ایک جسم اور دونوں کی کشمکش برابر جاری رہتی ہے روح کھینچ کر بلندیوں میں لے جانا چاہتی ہے اور جسم کھینچ کر پستیوں میں لانا چاہتا ہے اور انسان کے پاس جتنی طاقتیں ہیں ہر طاقت کا ایک حد وسط ہے۔ ایک آگے بڑھ جانے والا مرحلہ ہے اور ایک پیچھے ہٹ جانے والا۔ لہٰذا ہر انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ تینوں مرحلوں پر درمیانی راستوں میں رہے۔ آگے پیچھے نہ ہونے پائے۔ اگر فکر ہے تو حکمت کے راستے پر چلے اگر خواہش ہے تو درمیانی راستے پر چلے اور اگر قوت غضب ہے تو بھی درمیانی راستے پر چلے نہ آگے بڑھنے پائے نہ پیچھے ہٹنے پائے۔ یہی تقاضائے انسانیت ہے کہ حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ بھی انسان نہیں ہے اور حد سے پیچھے رہ جائے تو وہ بھی انسان نہیں ہے۔

پھر انہیں تینوں کے بیلنس کا نام ہے اخلاق۔ عدالت اور اخلاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عدالت اور اخلاق ایک ہی شئی ہے جس کو عدالت کہتے ہیں درحقیقت وہی اخلاق ہے

کہ فکر کا بیلنس بھی رہے خواہش کا بیلنس بھی رہے۔ غضب کا بیلنس بھی رہے کہ ذرا آگے پیچھے ہونے کا خیال پیدا ہوا تو زندگی میں وہیں سے تباہی شروع ہوجاتی ہے۔ میں نے اس لفظ کو بلا سبب نہیں کہا آپ نے غور نہیں فرمایا۔ ذرا آگے پیچھے انسان نقطۂ اعتدال سے ہٹا اور تباہی شروع ہوگئی اور نبیؐ سے بہتر اس نکتہ کو کوئی نہیں پہچانتا ہے اسی لئے حضور نے جب نقطۂ اعتدال کو پہچنوانا چاہا تو فرمایا کہ جو آگے بڑھ گئے ہیں انھیں پیچھے لاؤ اور جو پیچھے رہ گئے ہیں انھیں آگے بڑھاؤ کہ یہ سب پہچان لیں کہ علیؑ ہی اسلام کے نقطۂ اعتدال کا نام ہے۔ صلوات، نعرۂ حیدری۔

اسلامی فکر کے نقطۂ اعتدال کا نام ہے علیؑ۔ اسلام کے خط مستقیم کا نام ہے علیؑ۔ اسلام کے صراط مستقیم کا نام علیؑ۔ اسلام کے اس مرکز و محور کا نام ہے علیؑ جس سے آگے بڑھ جاؤ تو بھی تباہی ہے اور پیچھے رہ جاؤ تو بھی تباہی ہے۔ اب چاہے دھوپ ہو، گرمی ہو، قیامت ہو، تپش ہو، مصیبت ہو، کچھ بھی ہو مگر جو آگے بڑھ گئے انھیں پیچھے آنا پڑے گا اور جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تاکہ لوگ پہچان لیں اس نقطۂ اعتدال کو جو اسلام کا نقطۂ اعتدال ہے، جو فکر بشر کا نقطۂ اعتدال ہے۔ جو مجسمۂ اخلاق ہے جو مجسمۂ عدالتِ الٰہیہ ہے کہ اگر عدالتِ اسلامی کو دیکھنا ہے تو کردار علیؑ کو دیکھو، اگر صراط مستقیم کو پہچاننا ہے تو علیؑ کی زندگی کو دیکھو۔ اسلام کے خط مستقیم کو دیکھنا ہے تو سیرتِ علیؑ کو دیکھو۔ اسی لئے جب فرزند رسولؐ، فرزند علیؑ کے سامنے مسئلہ بیعت آیا تو امام حسینؑ نے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ میں اپنے نفس کو دو چیزوں کے درمیان پا رہا ہوں بَیْنَ السَّلَّةِ وَالذِّلَّةِ مسئلہ اس مرحلہ پر آگیا ہے کہ یا میں مقابلہ پر تلوار کھینچ کر آجاؤں یا ذلت برداشت کرلوں وَھَیْھَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ میں ذلت کو برداشت نہیں کرسکتا ہوں، مَوْتٌ فِی عِزٍّ خَیْرٌ مِّنْ حَیَاةٍ فِی ذُلٍّ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ امام حسینؑ کے یہ فقرات بڑی اہمیت رکھتے ہیں ھَیْھَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ میں اس ذلت کو برداشت نہیں کرسکتا ہوں۔ کیوں نہیں برداشت کرسکتے؟ اگر ذلت برداشت کرنے میں جان بچ جاتی ہے، گھر بچ جاتا ہے، گھر والے بچ جاتے ہیں تو تلوار چلانے، مقابلہ کرنے، قتل ہوجانے، جان دے دینے سے بہتر ہے کہ ذلت کو برداشت کر لیا جائے۔ تو امام حسینؑ نے فرمایا کیسے برداشت کرلوں۔

یَاْبَی اللّٰہِ ذَالِکَ یہ ذلت وہ ہے جس کو خدا برداشت نہیں کرتا ہے وَرَسُوْلُہٗ یہ ذلت وہ ہے جس کو رسول برداشت نہیں کرتا ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ اور کوئی صاحب ایمان بھی اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یعنی حسینؑ انکار بیعت کر کے ہر نمائندگی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ میں وہ طریقہ اختیار کر رہا ہوں جو اللہ کا طریقہ ہے جو پیغمبرؐ کا طریقہ ہے جو صاحبانِ ایمان کا طریقہ ہے باطل کے سامنے جھک جانا یہ ذلت وہ ہے جس کو نہ خدا برداشت کر سکتا ہے نہ رسولؐ برداشت کر سکتا ہے اور نہ صاحبان ایمان برداشت کر سکتے ہیں۔ ابھی تک تو عقیدہ کی بات ہو رہی تھی۔ اس کے بعد فرمایا وَحُجُوْرٌ طَابَتْ اور وہ گودیاں بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ جن پاکیزہ گودیوں میں میں پلا ہوں۔

عجیب نقرہ فرزند رسولؐ نے فرمایا ہے۔ نہ میرا خدا اس بات کو پسند کرے گا کہ میں باطل کے سامنے جھک جاؤں نہ میرا پیغمبرؐ پسند کرے گا، نہ کوئی صاحب ایمان اس کو گوارہ کرے گا، نہ وہ گودیاں گوارہ کریں گی جن گودیوں میں پلا ہوں۔ نُفُوْسٌ اَبِیَّۃٌ وہ نفوس بھی برداشت نہیں کریں گے جو ذلت کا انکار کرنے والے ہیں۔ نہ وہ افراد برداشت کریں گے جو دنیا میں نیک نام ہیں۔ صاحبانِ حیثیت ہیں، جو صاحبانِ کرامت ہیں یعنی میرے شجرے میں، میرے نسب میں میرے خاندان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ذلت کو برداشت کر سکے۔ یہ میرے عقیدے کا تقاضہ ہے کہ میں انکار بیعت کروں۔ یہ پیغمبرؐ کی نیابت کا تقاضا ہے کہ میں انکار بیعت کروں۔ یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے کہ میں انکار بیعت کروں۔ یہ آغوش فاطمہؑ کا تقاضا ہے کہ میں انکار بیعت کروں یہ نفس علیؑ کا تقاضا ہے کہ میں انکار بیعت کروں۔ یہ میرے آبا ر اجداد کی سیرت کا تقاضا ہے کہ میں انکار بیعت کروں۔ کوئی شریف انسان اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ میں باطل کے سامنے سر جھکا دوں۔ یہ تو حسینؑ کا اعلان تھا۔ اب آیئے قاتل کا اعلان سنیں۔ ظالم، دشمن خون کا پیاسا وہ کیا کہتا ہے جب امام حسینؑ کی آخری گفتگو تمام ہوئی اور یہ طے ہو گیا کہ فرزند رسولؐ بیعت یزید نہ کریں گے۔ جان دے دیں گے گھر لٹا دیں گے۔ سب قربان کر دیں گے مگر بیعتِ یزید نہ کریں گے تو ابن سعد نے اپنے حاکم کو پیغام بھیجا یزید کو ابن زیاد کو بھی ہوشیار

ہو جائے، یزید بھی باخبر ہو جائے۔ ابن سعد اپنے حاکم کو اطلاع کر رہا ہے اِنَّ الْحُسَیْنَ لَا یُبَایِعُ ساری کوششیں، ساری محنت، ساری گفتگو، ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حسینؑ بیعت نہیں کریں گے کیوں نَاِنَّ نَفْسَ اَبِیْہِ بَیْنَ جَنْبَیْہِ کہ حسینؑ کے پہلو کے اندر علیؑ کا دل ہے۔ یہ کوئی چاہنے والا نہیں کہہ رہا ہے فرزند رسول کا اپنا اعلان نہیں ہے۔ یہ دشمن، قاتل خون کا پیاسا وہ کہہ رہا ہے۔ حسینؑ بیعت نہ کریں گے کیوں اس لئے کہ حسینؑ کے پہلو میں علیؑ کا دل ہے۔ میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کاش آج کوئی تو ابن سعد کو سمجھاتا کیا کہہ رہا ہے اور کاش ابن زیاد یا یزید کے پاس بیسویں صدی کی عقل ہوتی تو فوراً پیغام بھجواتا اگر ان کے دل میں علیؑ کا دل ہے تو انھیں بیعت کرنے میں کیا تکلیف ہے (نہیں غور کر رہے ہو عزیزو میں نے کیا کہا۔ میں بات تمام کر دوں گا) ابن زیاد کو کہنا چاہئے تھا۔ احمق، نادان، ناسمجھ تیری عقل میں اتنی بات نہیں آتی ہے۔ اگر ان کے پہلو میں علیؑ ہی کا دل ہے تب تو یہ فوراً بیعت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے انھیں کیا پریشانی ہے مگر ظالم کا یہ کہنا کہ یہ بیعت نہ کریں گے اس لئے کہ ان کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے۔ یہ تنہا حسینؑ کے کردار کا اعلان نہیں ہے یہ حسینؑ کے بزرگوں کے کردار کا اعلان ہے اندھے مورخ دیکھ لیں۔ بہرے تاریخ سن لے۔ اگر حسینؑ کے باپ نے کسی کی بیعت کی ہوتی تو آج حسینؑ بیعت کے لئے تیار ہو جاتے۔ صلوات۔

مگر یہ بیعت نہ کریں گے اس لئے کہ ان کے پہلو میں اُن کے باپ کا دل ہے۔ یہی یہی فرزند رسولؐ نے اعلان کیا تھا وہ گودیاں گوارہ نہ کریں گی۔ وہ اصلاب و ارحام گوارہ نہ کریں گے کہ میں ظالم کے سامنے باطل کے سامنے سر جھکاؤں حسینؑ مجسمہ اخلاق پیغمبرؐ ہیں، حسینؑ نمونہ عدالت اسلامیہ ہیں، حسینؑ وارث پیغمبرؐ ہیں حسینؑ وارث علیؑ ابن ابی طالب ہے لہٰذا حسینؑ چاہتے ہیں کہ دنیا سے جاتے جاتے خط مستقیم کو پہنچوا دیا جائے جس سے آگے بڑھ جانے والے بھی گمراہ ہوتے رہیں گے جس سے پیچھے رہ جانے والے بھی تباہ و برباد ہوتے رہیں گے۔ یہی کام زندگی بھر پیغمبرؐ نے انجام دیا۔ یہی کام اپنی پوری زندگی میں مولائے کائناتؑ نے آخری سانس تک انجام دیا۔ یہی کام اُب حسینؑ ابن علیؑ انجام دینا چاہتے ہیں۔ وطن چھوٹتا ہے تو چھوٹ جائے

مصائب کا سامنا کرنا پڑے تو میں مصائب کو برداشت کرلوں گا اللہ وہ مدینہ کا رہنے والا قبر پیغمبرؐ کا مجاور جو گھر سے باہر آئے تو کبھی نانا کی قبر پر آگئے کبھی بھائی کی لحد پر آگئے کبھی ماں کی قبر کے سرہانے آگئے جس کو اتنا سامان اطمینان نصیب ہو جس کو اتنا سامان سکون نصیب ہو جس کو اتنا سامان فرحت قلب نصیب ہو ایک دن وہ آئے کہ اس کے نانا کی قبر بھی چھوٹ جائے اس سے ماں کا مزار بھی چھوٹ جائے اور اس کے بعد فقط اتنا ہی نہیں ہے اس کے لئے دنیا میں کوئی جائے امان نہ رہ جائے۔ محرم کی دوسری رات ایسے موقع پر عام طور سے اس منظر کا اور اس منزل کا تذکرہ کیا جاتا ہے جب فرزند رسولؐ نے وطن چھوڑنے کے بعد سرزمین کربلا پر قدم رکھا۔ کہاں کا مسافر کہاں رہ گیا۔ کہاں مدینۂ پیغمبرؐ کہاں خاک کربلا۔ کہاں نانا کا جوار کہاں صحرائے بے آب و گیاہ۔ کہاں ماں کی لحد کہاں یہ میدان مگر حسینؑ ابن علیؑ دین کی راہ میں جب قربانی دینے کے لئے آئے تو اس منزل پر آئے جس منزل پر کوئی نہیں چاہتا کہ یہاں کوئی ٹھہرے، کوئی نہیں چاہتا کہ یہاں کوئی قیام کرے اس لئے کہ دنیا میں اس زمین کو بستی نہیں پسند۔ مولائے کائنات صفین کے معرکہ کے بعد پلٹ رہے ہیں جب علیؑ کا گذر اس سرزمین سے ہوا تو ابن عباس کہتے ہیں کہ مولا ایک مقام پر ٹھہر گئے، خاک کو دیکھا آنکھوں میں آنسو آگئے اس سرزمین کی پوری تاریخ ہے۔ عزیزو وقت نہیں رہ گیا ورنہ میں تاریخ کربلا کو آپ کے سامنے گذارش کرتا۔ اگر آپ مذہبی تاریخ پڑھیں گے تو آدمؑ کی تاریخ میں ذکر زمین کربلا ہے نوحؑ کی تاریخ میں ذکر زمین کربلا ہے۔ اسماعیلؑ کی تاریخ میں ذکر کربلا ہے اور ہر اس منزل پر جب کوئی نبی خدا اس منزل سے گذرا اور پریشانی پیدا ہوئی تو اللہ کی بارگاہ میں گذارش کی خدایا اس منزل پر آنے کے بعد دل کیوں لرز رہا ہے۔ پروردگار اس زمین پر آنے کے بعد یہ مصیبت کیوں آئی؟ کہا اس لئے کہ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ سرزمین مصیبتوں کی سرزمین ہے۔ یہ زمین بلاؤں کی سرزمین ہے۔ ابھی ایک آخری مصیبت باقی رہ گئی ہے جب آخری پیغمبرؐ کا نواسہ اس سرزمین کربلا پر تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا جائے گا۔ اس تاریخ کو دیکھتے ہوئے جب مولائے کائنات اس منزل پر آئے بیٹھ گئے، خاک کو دیکھا سر جھکایا آنکھوں میں آنسو آگئے

لوگ حیرت زدہ ہیں ابھی تو علیؑ راستہ طے کر رہے تھے یہ اچانک اس خاک پر کیوں بیٹھ گئے اگر بیٹھ گئے تو آپ آنسو کیوں بہا رہے ہیں؟ ایک مرتبہ مولا کی زبان سے تین فقرے سنے گئے فرمایا صَبْرًا اَبَا عَبْدِاللّٰہِ صَبْرًا اَبَا عَبْدِاللّٰہِ صَبْرًا اَبَا عَبْدِاللّٰہِ میرے حسینؑ صبر کرنا، میرے حسینؑ صبر کرنا، میرے حسینؑ صبر کرنا۔ کون جانتا تھا کہ یہ علیؑ کیا کہہ رہے ہیں کسے معلوم تھا کہ یہ صبر کی تلقین آج کیوں ہو رہی ہے اس لئے کہ علیؑ کی نگاہ کے سامنے وہ سارا منظر ہے جب علیؑ کا لال زرغۂ اعدا میں گھرا ہوگا۔ اے عزیزو جب واقعہ سے بیس سال پہلے اتنے زمانے پہلے علیؑ نے خاک کربلا کو دیکھا اور بے قرار ہو گئے تو جب صحرائے کربلا میں علیؑ نے عالم قدس سے اپنے لال کو دیکھا ہو گا تیس ہزار کا نرغہ درمیان میں زہراؑ کا لال جب علیؑ نے اس منظر کو دیکھا ہوگا کہ کڑیل جوان بیٹا باپ سے ایک گھونٹ پانی مانگ رہا ہے حق تھا کہ علیؑ تڑپ کے صحرائے کربلا میں آجاتے جبھی تو علیؑ اکبر نے کہا بابا آپ گھرائیے گا نہیں دادا آگئے اجرکم علی اللّٰہ (خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غم آل محمدؐ) بس عزیزو آخری فقرات ایسی بلا کی سرزمین، ایسی مصیبتوں کی سرزمین جب حسینؑ کا قافلہ اس سرزمین پر پہنچا قافلہ کو روک دیا اس لئے کہ حسینؑ اپنی منزل شہادت کو پہچانتے ہیں۔ ابھی ام سلمہ کو بتا کے آئے ہیں۔ ابھی ابن عباس کو سمجھا کے آئے ہیں حسینؑ ٹھہر گئے۔ لوگوں نے آکے روکا قافلہ کو یہاں قیام نہ کیجئے یہ جگہ اچھی نہیں ہے یہ کوئی مناسب جگہ نہیں ہے یہاں سے جو نیک بندۂ خدا گذرا کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوا۔ آپ یہاں قیام نہ فرمائیے آپ یہاں نہ ٹھہریں؟ کہا مجھے کیوں سمجھا رہے ہیں۔ بتاؤ یہ زمین ہے کون سی زمین حد یہ ہے کہ لوگ اس لفظ سے گھبراتے ہیں۔ اس نام کو کوئی کہنا نہیں چاہتا ہے ھل لھا اسم آخر کہا کیا اور کوئی نام بھی ہے کہا ہاں اسے نینوا بھی کہتے ہیں۔ اور کوئی نام ہے کہا اسے شط فرات بھی کہتے ہیں حسینؑ کا سوال بڑھتا جا رہا ہے اور کوئی نام اور کوئی نام ارے مجھے کیا سمجھا ہے ہو میں اپنی منزل سمجھ کے یہاں ٹھہرا ہوں اور کوئی نام؟ گھبرا کے کسی نے کہا یُقَالُ لَھَا کَرْبَلَا بس عزیزو تین جملے امام حسینؑ کے اور میں نے مجلس تمام کر دی جیسے ہی کسی نے کہا اسے کربلا

P-6

کہا جاتا ہے بس حسینؑ بیٹھ گئے خاک پر ھٰذِہٖ اَرضُ کَربٍ وَبَلاءٍ یہ کرب کی زمین ہے یہ بلا کی زمین ہے بس میرے چاہنے والو ٹھہر وھٰھُنا مَحَطُّ رِحَالِنَا ہمارا قافلہ یہیں ٹھہرے گا (سن لو عزیزو تین جملے برداشت نہ کر سکو گے) یہ آپ کے مولا کے فقرے ہیں ھٰھُنَا مَحَطُّ رِحَالِنَا سامان اتارو ناقے بٹھاؤ بس منزل تمام ہو گئی سفر ختم ہو گیا یہی ہمارے ٹھہرنے کی جگہ ہے ھٰھُنَا تُسفِكُ دِمَاءُنَا اے یہ وہی زمین ہے جہاں ہمارا خون بہایا جائے گا (سن لو سن لو عزیزو اور میری بہنیں بھی سنیں) یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارا خون بہایا جائے گا اور کیا فرمایا ھٰھُنَا تُذبَحُ اَطفَالُنَا یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں ہمارے چھوٹے بچے ذبح کئے جائیں گے۔ اے غیرت دارو! ایک فقرہ حسین نے کہا ھٰھُنَا یُسبٰی حَرِیمُنَا یہی وہ جگہ ہے جہاں سیدانیاں قیدی بنائی جائیں گی۔ ہائے جب زینبؑ نے سنا ہو گا بھیا آپ مارے جائیں گے ارے بہن میری تمہیں قیدی بنایا جائے گا۔ کوفہ و شام کے بازار تماشائیوں کا مجمع ھٰذِہٖ سَبَایَا مِن بَنَاتِ رَسُولِ اللّٰہِ - وَسَیَعلَمُ الَّذِینَ ظَلَمُوا اَیَّ مُنقَلَبٍ یَّنقَلِبُونَ ○○

مجلس ۳

یقین

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ فَسَتُبْصِرُ وَیُبْصِرُوْنَ بِاَیِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝

نٓ، قلم اور تحریر کی قسم۔ پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمت کی بنیاد پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق پر فائز ہیں عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھیں گے کہ دونوں میں کون مجنون ہے اور کون صاحب عقل ہے۔

آیاتِ کریمہ کے ذیل میں فضائل اور رذائل کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام دو دن پہلے شروع ہوا تھا آج اس کے تیسرے مرحلہ پر انسانی زندگی کی عظیم ترین فضیلت اور انسانی کردار کی بدترین رذیلت کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا ہیں۔

سلسلۂ کلام کے آغاز سے پہلے ایک جملہ کی طرف اپنے عزیز بچّوں اور نوجوانوں کو متوجہ کر دینا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے جس کا نام ہے جسم اور روح اور دونوں کے درمیان جو بے شمار فرق پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک فرق یہ بھی ہے کہ صنف کی تقسیم کا تعلق جسم سے ہے روح سے نہیں ہے۔

جسم انسانی کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصّہ کا نام ہے مرد اور ایک حصّہ کا نام ہے عورت۔ ایک حصّہ کو کہا جاتا ہے مذکر اور دوسرے حصّہ کو کہا جاتا ہے مونث۔ اس مسئلہ کا

کوئی تعلق روح سے نہیں ہے کہ روح نہ مذکر ہوتی ہے نہ مونث۔ نہ مرد ہوتی ہے اور نہ عورت۔

یہی وجہ ہے کہ روح پائی جاتی ہے آپ کے اندر اور کہی جاتی ہے مونث۔ ایسا نہیں ہے کہ میں آپ حضرات کے بارے میں کہوں کہ آپ کے اندر روح پایا جاتا ہے اور کسی خاتون سے گذارش کروں کہ آپ کے اندر روح پائی جاتی ہے۔ روح کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ ہر ایک کے لیے استعمال ہوتا ہے عورت میں بھی روح پائی جاتی ہے اور مرد میں بھی روح پائی جاتی ہے اور یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ ان دونوں جسموں میں تفرقہ پیدا ہو گیا ہے لیکن روح میں تفرقہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ تو انسانی حیات کا یہ تفرقہ اور انسانی نوع کی یہ تقسیم "مرد اور عورت" اس کا تعلق بھی انسانی جسم کے جسمانی حصہ سے ہے روحانی حصہ سے نہیں ہے۔ اس مختصر سی بات کو اگر آپ اپنے ذہن عالی میں رکھیں گے تو آئندہ کے سارے مطالب آپ کے لیے انتہائی آسان ہو جائیں گے اور جا بجا جو غلط فہمیاں پیدا ہونے والی ہیں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائیگا پہلی بات۔ یہ ہے کہ مرد و عورت کی تقسیم کا تعلق جسم سے ہے روح سے نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سن و سال کے اعتبار سے جو تقسیم ہوتی ہے اس کا تعلق بھی جسم سے ہوتا ہے روح سے نہیں ہوتا ہے۔ جسم کبھی بچہ ہوتا ہے کبھی جوان ہوتا ہے اور کبھی بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن روح نہ کبھی بچہ ہوتی ہے نہ جوان ہوتی ہے اور نہ بوڑھی ہوتی ہے۔ اس کی جو کیفیت ہے وہ اپنے مقام پر بہر حال قائم رہتی ہے اس کا کوئی امتیاز جسمانی امتیاز جیسا نہیں ہوتا ہے۔ جسم سن و سال کی منزلوں سے گذرتا ہے اور روح اپنے مقام پر اپنے عالم میں ثابت رہتی ہے۔ حد یہ ہے کہ جسم کبھی زندہ ہوتا ہے کبھی مردہ ہو جاتا ہے مگر روح جسم کے مرنے کے بعد بھی مردہ نہیں ہوتی ہے۔ ورنہ اگر روح جسم کے مرنے کے بعد مردہ ہو گئی ہوتی تو اِسْمَعْ اِفْهَمْ کے کوئی معنیٰ ہی نہ رہ جاتے۔

یہی حال قوم اور نسل و رنگ کے تفرقہ کا ہے کہ اس کا تعلق بھی جسم سے ہوتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں گھرانے میں پیدا ہوا ہے اس کا نام سیّد رکھا گیا ہے اور جو دوسرے گھرانے میں پیدا ہوا ہے اس کا نام غیر سید رکھا گیا ہے۔ فلاں ملک میں پیدا ہوا ہے اس کا رنگ کالا ہے۔ فلاں ملک میں پیدا ہوا ہے اس کا رنگ گورا ہے مگر سارے رنگ و نسل کے تفرقے انسانی جسم سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ کبھی آپ نے دیکھا ہے نہ سنا ہے کہ حبش میں رہنے والے کی روح کالی ہوتی ہو یا سفید فام علاقے میں پیدا ہونے والے انسان کی روح سفید ہو جاتی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خون تو سفید ہو سکتا ہے روح سفید نہیں ہو سکتی ہے لہٰذا جسم کی دنیا رنگ و نسل کے اعتبار سے بھی الگ ہوتی ہے اور روح کا عالم الگ ہوتا ہے۔

اگر یہاں تک آپ میرے ساتھ چلے ہیں تو ایک جملہ اور بھی احتیاطاً ذہن میں رکھ لیں جو شاید خاتمۂ کلام میں کام آ جائے کہ آزاد اور غلام کی تقسیم بھی جسم کے اعتبار سے ہوتی ہے روح کے اعتبار سے نہیں ہوتی ہے۔ کتنے آزاد ہوتے ہیں کہ جن کی روحیں غلام ہوتی ہیں اور کتنے غلام ہوتے ہیں کہ جن کی روحیں آزاد ہوتی ہیں۔ صلوات۔

یہ میری گفتگو کا پہلا مرحلہ ہے جسے آپ ذہنِ عالی میں محفوظ رکھیں۔

میں نے کل اشارہ کیا تھا کہ روح کا عالم الگ ہے اور جسم کا عالم الگ ہے اس کے بہت سے امتیازات کل آپ کے سامنے آ چکے ہیں جن میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ جتنے تفرقے عالم انسانیت میں پائے جاتے ہیں ان سارے تفرقوں کا تعلق انسان کے جسمانی حصوں سے ہے اور روحانیت کی دنیا الگ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے تفرقے کے ساتھ چلے اور ہو سکتا ہے کہ بالکل اس کے خلاف ہو جائے اس کے نتائج کیا ہوں گے یہ آئندہ گذارش کروں گا۔

دوسری بات جو منزل تمہید میں محفوظ کرنے کی ہے اور جس کا محفوظ کر لینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے جتنے فضائل یا رزائل ہیں ان سب کا تعلق انسان کی روح

سے ہے جسم سے نہیں ہے۔

آپ بہت بہادر ہیں۔ تو بہادری ہاتھ پاؤں میں نہیں ہوتی ہے۔ بہادری روح میں ہوتی ہے۔ اگر روح میں بہادری پائی جاتی ہے تو کمزور اور لاغر جسم والا بھی میدان میں جم جاتا ہے اور اگر روح میں بزدلی پیدا ہو گئی تو انتہائی اچھے حسین ہاتھ پاؤں رکھنے والا بھی اپنے پیروں کو صرف کر دیتا ہے ہاتھوں کو صرف نہیں کرتا ہے۔ اگر آپ کی روح میں صفتِ کرم پیدا ہو گئی ہے تو آپ کا ہاتھ جیب سے سائل کی طرف اٹھ جائے گا۔ اور اگر آپ کی روح میں صفتِ بخل پیدا ہو گئی ہے تو آپ کا ہاتھ سائل سے جیب کی طرف جائے گا۔ یہ روح ہے جو انسان کو حرکت دیتی رہتی ہے۔ کمالات کا مرکز، کمالات کا سرچشمہ اور کمالات کی واقعی منزل جسم نہیں ہے بلکہ روح ہے جس کی طرف میں اشارہ بھی کر چکا ہوں۔ اگر انسانی کمالات کا تعلق انسانی جسم سے ہوتا تو جسم کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کمالات میں فرق پیدا ہو جاتا۔ انسان صحتمند ہے تو بڑا کریم ہے اور بیمار ہو گیا تو جتنا جسم گھٹ گیا اتنے ہی پونڈ اس کا کرم بھی گھٹ گیا۔ حالانکہ اس کے برعکس دیکھنے میں آتا ہے جب تک صحتمند رہتے ہیں کرم نہیں کرتے ہیں اور جب رحم و کرم کے محتاج ہو جاتے ہیں تب کرم یاد آتا ہے کہ فقیر کو کچھ دے دیا جائے۔ صدقہ نکال دیا جائے خیرات کر دی جائے۔ کاش یہ پہلے ہی کر دیا ہوتا تو بستر پر لیٹنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس لیے کہ مصائب کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک قسم مصائب کے لیے لفظ رفع استعمال ہوتا ہے اور ایک کے لیے لفظ دفع استعمال ہوتا ہے --- مصیبت آجائے اور اس کو ٹالا جائے تو یہ ہے رفع اور آنے سے پہلے روک دیا جائے تو اس کا نام ہے دفع۔ پروردگار عالم نے اپنے لیے رافع البلاء نہیں کہا ہے بلکہ دافع البلاء کہا ہے۔ کہ وہ اپنے بندوں پر اتنا مہربان ہے کہ دنیا کے حکمرانوں کی طرح مصیبتوں میں پھنسا کے نہیں نکالنا چاہتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو مصیبتوں سے بچانا چاہتا ہے۔ دنیا والے جب اپنی شخصیت کا رعب

جانا چاہتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ پہلے آدمی کہیں سے پریشانی میں پڑ جائے اس کے بعد فوراً بچا لیں، جس کے لیے اردو میں مثل ہے کہ "آگ لگا کے بالٹی لے کے دوڑے" پہلے خود ہی آگ لگائی اور سب سے پہلے بالٹی میں پانی لے کے آ گئے تو ہر ایک نے کہنا شروع کر دیا کہ جناب اگر وہ نہ آئے ہوتے تو آگ کیسے بجھتی۔ یہ کوئی بے چارہ سوچ ہی نہیں سکتا ہے کہ وہ نہ ہوتے تو آگ کیسے لگتی۔

یہ دنیا کا سیاسی فن ہے کہ انسان یہ چاہتا ہے کہ لوگ پریشانی میں مبتلا ہو جائیں کہ جب پریشانی ہو جائے گی تو شخصیت خود بخود سامنے آجائے گی۔ لیکن پروردگار عالم کو کس سے اپنی شخصیت کو منوانا ہے۔ کون اس قابل ہے کہ اس کے سامنے اپنی ہستی کا اظہار کیا جائے۔ ایک اپنا ارادہ نہ ہوتا تو کوئی نہ ہوتا اور جس دن ارادہ بدل جائے گا کوئی صاحب نہیں رہ جائیں گے۔ جتنے صاحب صاحبہ جو کچھ دکھائی دے رہے ہیں سب ایک ارادۂ الٰہی اور ایک کرم پروردگار کا نتیجہ ہیں ورنہ خدا نہ کردہ ابھی ارادہ الٰہی بدل جائے تو اس علاقے کا نام قبرستان ہو سکتا ہے آبادی نہیں ہو سکتا ہے تو وہ انسان جس کا کل وجود، جس کی کل ہستی ایک ارادۂ الٰہی کے دم سے قائم ہے پروردگار اس انسان کے اوپر اپنی ہستی کا رعب کیا قائم کرے گا اس کی اوقات ہی کیا ہے اس کی ہستی ہی کیا ہے، اس کی حیثیت ہی کیا ہے کہ اس کے سامنے اپنی ہستی کا یا اپنی عظمت کا اظہار کیا جائے۔ یہ اس کی نالائقی ہے کہ اس کی عظمت کو نہیں پہچانتا ہے یہ اس کی نالائقی ہے کہ اس کی بزرگی کا اقرار نہیں کرتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ انسان اگر ذرا سی شرافت رکھتا ہوتا تو ان باتوں کو پہچان لیتا اور اس کے سمجھانے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

لو انسان کے جتنے کمالات ہیں۔ ان سارے کمالات کا تعلق روح سے ہے اور انسان کے جتنے عیب ہیں ان کا مرکز بھی روح ہی ہے بخل بھی روح ہی میں ہوتا ہے۔ بزدلی بھی نفس ہی میں ہوتی ہے۔ یہ سارے صفات

جتنے ہیں سب اسی نفس میں پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی نفس اس راہ پر چلا جاتا ہے۔ کبھی اس راہ پر چلا جاتا ہے۔ کبھی روح کی منزل یہ ہوتی ہے اور کبھی وہ منزل ہوتی ہے۔

اگر آپ نے پہلے لفظ کو اس لفظ سے ملا لیا تو اس نتیجہ کو سمجھنے میں زحمت نہیں ہوگی کہ جب کمالات کا تعلق روح سے ہے اور روح نہ مرد ہوتی ہے نہ عورت ہوتی ہے۔ نہ مذکر ہوتی ہے نہ مونث ہوتی ہے۔ نہ بچّہ ہوتی ہے نہ جوان ہوتی ہے نہ بوڑھی ہوتی ہے۔ نہ گوری ہوتی ہے نہ کالی ہوتی ہے۔ نہ سیّد ہوتی ہے نہ شیخ ہوتی ہے۔ اور اس کا عالم ہی الگ ہوتا ہے تو جب کبھی انسانی کمالات کا حساب لگاتا ہو تو خبردار جسم کی کیفیتوں کا حساب نہ لگائیے گا۔ کبھی کسی موقع پر یہ خیال نہ پیدا ہو کہ ہم مرد ہیں لہٰذا زیادہ باکمال ہوں گے۔ وہ عورت ہے لہٰذا اس کا کمال کم ہوگا۔ ہم گورے ہیں لہٰذا صاحب کمال ہوں گے۔ وہ کالا ہے لہٰذا اس کا کمال کم ہوگا۔

یہ سارے خنّاس اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسانی روح اور جسم کے فرق کو نہیں سمجھا جاتا ہے ورنہ اگر اس فرق کا احساس پیدا ہو جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ جو کمالات کی دنیا ہے وہاں یہ تفرقے ہوتے ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اس امتیاز کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا ہے۔

اس نکتہ کے نہ سمجھنے کی بنیاد پر تاریخ اسلام میں سیکڑوں بحثیں پیدا ہو گئی ہیں مثلاً نابالغ کے ایمان کی کیا قیمت ہے؟ اس بیچارے کو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ نابالغ جسم ہوتا ہے روح نہیں ہوتی ہے۔ یہی جسم ہے جو ایک عمر تک نابالغ کہا جاتا ہو اور آگے چل کر بالغ ہو جاتا ہے۔ یہ تفرقے روح میں نہیں ہوتے ہیں کہ روح آج نابالغ ہے کل بالغ ہو گئی۔ وہ نہ بچّہ ہوتی ہے نہ بوڑھی ہوتی ہے اور ایمان کی جگہ جسم نہیں ہے بلکہ روح ہے تو جس بے چارے نے جسم اور روح کے فرق کو نہیں پہچانا۔ وہ یہی سوچتا رہ گیا کہ جب یہ بوڑھا ہے تو اس کا ایمان بھی کچھ زیادہ ہوگا اور یہ نابالغ ہے تو اس کا ایمان بھی کمزور ہوگا۔ حالانکہ عالم روحانیت

جسمانیت سے اسقدر الگ ہوتا ہے کہ جس منزل پر ایک سو بارہ سال کا بوڑھا ہوتا ہے اسی منزل پر تیرہ سال کا بچّہ بھی ہوتا ہے۔ بوڑھا باپ نابالغ بچے کو منزل ذبح میں لٹاتا ہے تو قرآن ایک ہی لفظ دونوں کے لیے استعمال کرتا ہے فَلَمَّا اَسْلَمَا جب دونوں منزل اسلام میں آگئے۔ قرآن نے یہ تفرقہ نہیں کیا کہ بوڑھے کو منزل اسلام میں رکھا جائے اور بچے کے اسلام کو منسوخ کر دیا جائے بلکہ ایک ہی لفظ میں دونوں کے اسلام کا اعلان کیا گیا تاکہ نافہم سمجھ لیں کہ اسلام کا تعلق روح سے ہوتا ہے جسم سے نہیں ہوتا ہے۔ جسم کا بوڑھا روح کا بچہ ہو سکتا ہے اور جسم کا بچہ روح کا کامل و اکمل ہو سکتا ہے۔ صلوات

یہ ایک مختصر تمہید تھی جو میں نے آپ کے سامنے گذارش کر دی آج کے لیے بھی اور آئندہ مجالس کے لیے بھی۔ آپ ان دونوں باتوں کو ذہن عالی میں محفوظ رکھیں گے۔

آج انسانی روحانیت اور انسانی نفس کے عظیم ترین کمال کے بارے میں کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں۔

علماء اخلاق کا اس نکتہ پر اتفاق ہے کہ انسان کے نفس کے اندر جتنے کمالات پائے جاتے ہیں۔ ان سب سے بڑے کمال کا نام ہے یقین۔ اگر دولت یقین انسان کو حاصل ہو جائے تو اس سے بڑا کوئی صاحب کمال نہیں ہے۔ اور اگر انسان کو دولت یقین حاصل نہ ہو تو انسان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر کمال کی اعلاترین منزل تک نہیں جا سکتا ہے۔

یاد رکھئے کہ ہمارے ذہن میں جب بھی کسی بات کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس خیال کے آتے ہی ہمارا ذہن چار حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس خیال کے دونوں رخ برابر ہوتے ہیں یعنی پچاس پچاس۔ پچاس پرسنٹ اس کے ہونے کا خیال ہوتا ہے اور پچاس پرسنٹ نہ ہونے کا۔ نہ ادھر کوئی حصّہ زیادہ ہوتا ہے نہ ادھر

تو اس کیفیت کا نام ہوتا ہے شک۔ اس کے بعد انسان سوچنا شروع کرتا ہے کہ یہ واقعہ اسوقت ہو سکتا ہے یا نہیں اور نتیجہ میں ایک پلڑہ جھک جاتا ہے اور ایک پلڑہ اوپر چلا جاتا ہے تو جو پلڑہ جھک جاتا ہے اس کا نام ہوتا ہے گمان اور ظن اور جو ہلکا ہو جاتا ہے وہ ہے وہم مثلاً ایک طرف کا خیال ساٹھ پرسینٹ 60٪۔ ستر پرسینٹ 70٪۔ اسی پرسینٹ 80٪۔ ہوگیا تو اس کا نام ہوگا گمان اور دوسری طرف کا نام ہوگا وہم۔ تو گویا یہ تین حالتیں ہوگئیں۔ ایک حالت درمیان والی ہے جس کا نام ہے شک۔ ایک حالت جھکاؤ والی ہے جس کا نام ہے گمان۔ ایک حالت ہلکی ہے جس کا نام ہے وہم۔ اب اگر ایک طرف اتنا جھکاؤ پیدا ہو جائے کہ دوسری طرف کا خیال بھی نہ آسکے تو اس کا نام ہے یقین۔

ایسا نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں یقین نہیں ہے۔ یقین ہوتا ہے۔ آپ کو اس وقت رات ہونے کا یقین ہے۔ مجلس ہو رہی ہے اس کا یقین ہے۔ میں پڑھ رہا ہوں آپ کو یقین ہے۔ آپ سن رہے ہیں مجھے یقین ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں تک انسان کا مشاہدہ پھیلتا جاتا ہے۔ زندگی میں یقین آتا جاتا ہے اور اس میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ میرے سامنے دو ہزار آدمی بیٹھے ہیں۔ ان دو ہزار کے وجود کا مجھے یقین ہے مگر ان کے علاوہ جو اور ہیں ان کا یقین نہیں ہے کہ میں دو ہزار کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ ذرا باھر دور کھڑے ہوئے ہیں سڑک کے پاس۔ آپ تین ہزار کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو تین ہزار کا یقین ہے۔ ایک پانچ ہزار کو دیکھ رہا ہے اسکو پانچ ہزار کا یقین ہے۔ ہم زمین پر بیٹھے آسمان کو دیکھ رہے ہیں لاکھوں میل کا فاصلہ ہے مگر یقین ہے اس لیے کہ نگاہ کی زد میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کمرے کے اندر ہیں اور دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں تو دو کا یقین ہے اور سڑک پر آ گئے تو سو کا یقین ہو گیا۔ مجلس میں آ گئے تو دو ہزار کا یقین ہو گیا۔ زمین پر بیٹھ کر آسمان کو دیکھا تو آسمان کا یقین ہو گیا۔ جتنا جتنا مشاہدہ بڑھتا گیا انسان کی حالت یقین میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یہ ہماری نگاہ کی کمزوری ہے کہ کچھ دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں دیکھتے ہیں۔ کچھ مشاہدے

میں آتا ہے اور کچھ نہیں آتا ہے۔ جتنے سامنے ہیں ان سب کا یقین ہے اور جتنے پردے کے پیچھے ہیں کسی کا یقین نہیں ہے کہ مشاہدہ کی زد میں نہیں آئے ہیں اور ہماری نظر وہاں تک نہیں پہنچی ہے تو ہماری دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کچھ چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کچھ چیزیں ہمارے مشاہدے کی حد سے باہر نکل گئی ہیں۔ کہ اگر دیکھنے میں آجائے تو آسمان کا بھی یقین ہے اور اگر دیکھنے میں نہ آئے تو اپنی جیب کا بھی یقین نہیں ہے۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ مشاہدہ جتنا بڑھتا جائے گا یقین کا عالم اتنا ہی وسیع تر ہوتا جائے گا۔ اب اگر کسی انسان کی نگاہ اتنی وسیع ہو کہ جیسے ہمارے ہاتھوں کی پانچ انگلیاں ہیں اس کے لئے کل کائنات عالم یقین ہو تو ہمارا عالم یقین پانچ انگلیوں تک محدود رہے گا اور اس کا عالم یقین کل کائنات کو احاطہ میں لے لے گا لہٰذا ہم یہ کہیں گے کہ جب پردہ ہٹ جائے گا تو یقین بڑھ جائے گا اور جیسے جیسے پردے ہٹتے جائیں گے یقین بڑھتا جائے گا اور وہ یہ کہے گا کہ اگر پردے ہٹا دئے جائیں تو بھی یقین میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔ (صلوات)

تو عزیزان محترم دنیا کے ہر مسئلہ میں ہمارا ذہن چار طرح کے حالات سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے۔ کبھی شک، کبھی گمان، کبھی وہم اور کبھی یقین۔

نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور شک ہونے لگتا ہے کہ یہ تیسری ہے یا چوتھی۔ اس کے بعد ایک لمحہ کے لیے غور کیا کہ ابھی تو ہم تشہد پڑھ کے اٹھے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیسری ہے۔ تیسری ہونے کا خیال کچھ زیادہ ہو گیا تو اس کا نام ہو گیا گمان شریعت نے کہا کہ جب تک شک رہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن جب گمان ہو جائے تو اس پر عمل ہو سکتا ہے لیکن اگر گمان نہ پیدا ہو تو جو شک کے قوانین ہیں ان پر عمل کیجئے گا یعنی بنا چار پر رکھئے گا۔ اور چار سمجھ کر نماز تمام کیجئے گا اور بعد میں ایک رکعت نماز احتیاط پڑھئے گا۔

یہ مسائل اس لیے بیان کر دئے گئے ہیں کہ انسانی زندگی میں شک بھی آتا ہے۔ گمان بھی آتا ہے اور یقین بھی آتا ہے۔

یہ چاروں طرح کے حالات ہیں جو انسان کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ کسی کے یہاں

یہ زیادہ۔ کسی کے یہاں وہ زیادہ۔ کسی کے یہاں اِس میں کمی ہے۔ کسی کے یہاں اُس میں کمی ہے اس سلسلے میں سب کے حالات الگ الگ ہیں اور کوئی قانون اس کے لیے نہیں بن سکتا ہے ہوسکتا ہے کہ آپ کا نفس ماشاء اللہ اتنا مضبوط ہو کہ آپ کے یہاں یقینیات کی مقدار ۹۰٪ فیصد ہو اور کوئی بے چارہ ایسا بدنصیب ہو کہ اس کے یہاں شکیات ۹۰٪ پرسینٹ ہوں۔ اب جو شک کرنا شروع کیا تو نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا نماز میں شک۔ روزہ رکھنے لگا وقت روزہ میں شک۔ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر شک اپنی زبان سے کہہ رہا ہے۔ بمبارک ہو مگر شک۔ ابھی کہا آمنّا وصدّقنا مگر شک۔ علمائے اخلاقیات کا اتفاق ہے کہ یقین بہرحال بہترین کمال کا نام ہے اور شک بدترین صفت ہے۔ اب جس میں بہترین بات ہوگی وہ بہترین آدمی ہوگا اور جس میں بدترین بات ہوگی وہ بدترین آدمی ہوگا۔ صلوات۔

تو انسانی زندگی میں جب کوئی ایسا خیال پیدا ہو جس کے خلاف کا تصوّر بھی نہ پیدا ہو سکے تو اس کا نام ہے یقین۔

پھر اس کی بھی تین قسمیں ہیں۔ کبھی یقین دلیلوں سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا مگر یقین ہے۔ آپ میں نہ جانے کتنے ایسے افراد ہوں گے جنھوں نے مثلاً امریکا نہیں دیکھا ہے لندن نہیں دیکھا ہے لیکن اگر میں منبر سے اعلان کردوں کہ آپ لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ سارے پروگرام، سارے اخبارات، سارے ریڈیو، سارے ٹی وی سب جھوٹ بولتے ہیں دنیا میں امریکا نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ لندن نام کی کوئی جگہ نہیں ہے تو آپ نہیں مانیں گے اور میری بات کو ٹھکرا دیں گے لندن، امریکا، چین، جاپان کے وجود کو نہیں ٹھکرائیں گے۔ اس لیے کہ آپ کو ان ملکوں کے بارے میں یقین پیدا ہو چکا ہے اور اس کے مقابلہ میں کچھ سوچنے سننے کو تیار نہیں ہیں۔ تو یقین کے لیے دیکھنے کی شرط نہیں ہے۔ دلائل اتنے ہیں۔ خبریں اتنی آئی ہیں، پروگرام اتنے آئے ہیں۔ ریڈیو نے، ٹی وی نے، جانے والوں نے، آنے والوں نے اتنی خبریں سُنائی ہیں کہ انسان کو یقین پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ یہ یقین آنکھوں کا دیکھا ہوا نہیں ہے اس کے بعد آپ کو ویزا مل گیا اور آپ چلے گئے جیسے

ہی نیویارک کے ایرپورٹ پر اترے آپ کے یقین میں اضافہ ہوگیا۔ کل یہ یقین علم کے زور سے آیا تھا اور آج یہ یقین آنکھوں کے زور سے آیا ہے۔ کل ممکن تھا کوئی دھوکہ دے دیتا مگر اب دھوکہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔

پہلی قسم کا نام تھا علم الیقین یعنی وہ یقین جو علم کے زور سے آیا تھا اور دوسرا یقین ہے عین الیقین جو آنکھوں سے دیکھ کر پیدا ہوا ہے جہاں کسی طرح کا دھوکہ نہیں کیا جاسکتا ہے اس کے بعد دو چار دن رہ گئے اور نیویارک کی فضا نے آپ پر اثر کردیا۔ تو یقین تو یقین ہی رہا جو پہلے تھا مگر حالات میں فرق پیدا ہوگیا۔

اس کی بہترین مثال فلسفہ والے یوں دیا کرتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ آگ جلانے والی ہے۔ آپ نے کبھی آگ کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو مگر اتنا یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے۔

اس کے بعد آگ سامنے جل رہی تھی آپ نے ایک کاغذ ڈال دیا کاغذ جل گیا تو پہلے جو آپ کو یقین تھا وہ تھا علم الیقین جو علم کے زور سے آیا تھا اور اب جو آپ نے کاغذ کو جلتا ہوا دیکھ لیا تو اس کا نام ہوگیا عین الیقین۔ یعنی آنکھ سے دیکھا ہوا یقین۔ لیکن آپ نے کاغذ کو جلتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ کیا جانیں جلنا کیا ہے اور جلنے کا مزہ کیا ہوتا ہے یہ کاغذ جانتا ہے ہم نہیں جانتے ہیں۔ ہم تو خالی یہی جانتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے اور ہم نے اپنی آنکھ سے اسے جلاتے ہوئے دیکھ بھی لیا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اسی آگ میں ہم نے انگلی رکھ دی جلنے کی لذت کا احساس بھی ہوگیا اور ظاہر ہے کہ آگ میں جلنے کے بعد یا آگ میں جانے کے بعد جو انسان کو آگ کا یقین پیدا ہوتا ہے اس سے بالاتر کوئی یقین نہیں ہے اس لیے کہ پہلے کا یقین سنا سنایا تھا اس کے بعد کا یقین دیکھا ہوا ہے لیکن یہاں یقین محسوس کیا ہوا ہے۔ میں اس حقیقت کو کس طرح واضح کردوں جو مجھ پر واضح نہیں ہے کہ میں اس منزل تک نہیں پہنچا ہوں لیکن جہاں تک آپ غور کرسکتے ہیں سوچتے جائیں۔ سُنا ہوا یقین اور ہے دیکھا ہوا یقین اور ہے اور محسوس کیا ہوا یقین اور ہے۔

میں اپنے ایمان اور آپ کے ایمان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں انشاءاللہ مجھے بھی یقین خدا ہے اور آپ کو بھی یقین خدا ہے مگر یہ یقین دلیلوں سے آیا ہے کہ زمین کو دیکھا کائنات کو دیکھا۔ مخلوقات کو دیکھا اور یقین کر لیا کہ کوئی خالق ہوگا مگر یہ یقین علم کے زور سے آیا ہے کسی نے دیکھا ہے خدا کو نہ محسوس کیا ہے۔

ایک قوم نے اپنے نبی سے کہہ دیا تھا کہ ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو جناب موسیٰؑ نے کہا کہ چلو اگر خدا کو دیکھنے کا شوق ہے۔ جناب موسیٰؑ قوم کو لے کر چلے آواز دی پروردگار یہ قوم آئی ہے تیرا جلوہ دیکھنے کے لیے۔ اللہ نے کہا ٹھیک ہے ٹھہرو ابھی دکھائے دیتا ہوں فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا جیسے ہی ایک جلوۂ خدا ایک تجلّی پروردگار، ایک روشنی دکھائی دی پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہوگئے دیکھئے موسیٰؑ قوم کو لے کر آئے تھے اور قوم دیدار خدا کے لیے آئی تھی لیکن تجلّی کے بعد خدا نے صرف دو کا ذکر کیا۔ پہاڑ پر جلوہ دکھلایا تو پہاڑ چور چور ہوگیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے یہ دیگر حضرات جو دیکھنے آئے تھے یہ کہاں چلے گئے خدا ہی جانے۔ ان کا تو ذکر تک قرآن مجید نے نہیں کیا ہے کہ یہ کہاں چلے گئے۔ کم سے کم نبی خدا کا ذکر تو آیا کہ کیا ہوا۔ پہاڑ جو بے جان تھا اس کا ذکر تو آیا کہ کیا ہوا مگر جو پہاڑ پر جلوہ دیکھنے گئے تھے وہ تو قابل ذکر بھی نہ رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ خدا کا جلوہ کوئی دیکھنا چاہے تو دیکھ نہیں سکتا ہے لہٰذا خدا کے بارے میں جتنا یقین بھی جس کا ہے وہ سارا یقین علم کے زور پر ہے، دلائل کے زور پر ہے۔ براہین کے زور پر ہے۔ وہ یقین ہمارے پاس کہاں سے آئے گا جو یقین برتنے سے پیدا ہوتا ہے جو یقین محسوس کرنے سے پیدا ہوتا ہے وہ کیفیت ہم کہاں سے لائیں گے ہم تو ابھی یقین کی دوسری منزل تک نہیں پہنچے ہیں۔ آخری مرحلہ تک کیا جائیں گے مگر کچھ بندے ایسے بھی ہیں۔

ذعلب یمانی مولائے کائناتؑ کے سامنے آئے اور سوال کیا یا علی هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ تَعْبُدُهٗ جس خدا کی آپ عبادت کرتے ہیں کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے؟ ذرا

سوال کے تیور دیکھئے گا ھَلْ رَأَیْتَ رَبَّنَا تَعْبُدُہٗ جس کی آپ عبادت کرتے ہیں کیا آپ نے اس خدا کو دیکھا ہے۔ اگر نہیں دیکھا ہے تو بغیر دیکھے کیوں سجدہ کئے جا رہے ہیں۔ مولا نے اسی تیور سے جواب دیا کَیْفَ اَعْبُدُ رَبًّا لَمْ اَرَاہُ جس خدا کو دیکھا نہیں ہے اس کی عبادت کیسے کر سکتا ہوں۔

اگر دیکھا نہ ہوتا تو سجدے کیسے کرتا۔ اگر دیکھا نہ ہوتا تو عبادت کیسے کرتا۔ مگر مولا جانتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سننے والوں کو غلط فہمی ہو جائے لہٰذا فوراً وضاحت فرمائی بے شک دیکھا ہے مگر یہ یاد رکھنا کہ اگر مادّہ ہوتا تو ان آنکھوں سے دیکھا جاتا لیکن چونکہ کائنات سے بالاتر ہستی ہے لہٰذا مشاہدہ کی آنکھوں نہیں دیکھا جاتا بلکہ بِحَقَائِقِ الْاِیْمَانِ ایمان کی حقیقتوں سے دیکھا جاتا ہے۔ عجب لفظ مولا نے فرما دیا ہے۔ قربان جائیے اس لفظ پر کہ وہ آنکھوں سے نہیں ایمان کی حقیقتوں سے دیکھا جاتا ہے یعنی اسے صاحب ایمان نہیں دیکھے گا کل ایمان دیکھے گا جہاں حقیقت ایمان پائی جاتی ہو ان کا یقین اس منزل پر ہے کہ جو منزل مشاہدے کی منزل ہوتی ہے ان کی نگاہ میں جلوۂ پروردگار ہو اور خالی ایسا ہی نہیں ہے بلکہ میں نے عرض کیا تھا کہ جس انسان نے کاغذ کو جلتے ہوئے دیکھا ہے وہ کیا جانے کہ آگ میں جلنے کا لطف کیا ہوتا ہے جو خود آگ سے دور ہے اسے جلنے کی لذت نہیں مل سکتی ہے آگ میں کود جائے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ جلنے کا مزہ کیا ہوتا ہے چاہے آپ خوش ہوں یا کہ ناخوش مزہ بہر حال معلوم ہو جائے گا اس لیے کہ فاصلہ ختم ہو گیا ہے۔ تو عزیزو ہم لذّتِ یقین سے ناآشنا ہیں۔ ہمیں یقین کا مزہ نہیں معلوم ہے اس لیے کہ ہم دور رہیں اور ہمارے اس کے درمیان فاصلہ ہے۔ مکّہ چلے گئے اللہ سے قریب ہونے کے لیے۔ گھر کے قریب ہو گئے مگر اللہ سے قریب ہونا چاہتے ہیں۔ یعنی ابھی فاصلہ ہے تو جب تک فاصلہ رہے گا اگر یقین پیدا بھی ہو جائے تو لذّتِ یقین نہیں معلوم ہوگی۔ ہاں جب انسان اس منزل پر پہنچ جائے کہ جہاں فاصلہ کا ذکر ہی نہ آسکے یعنی دو کمان یا کچھ کم۔ اس سے بھی کچھ اور کم ... کچھ اور کم ... جب یہ منزل آجائے تو لذتِ یقین کا احساس ہوگا اور پختگی یقین سے دل میں سکون و سرور پیدا ہوگا۔

جو لذّتِ یقین سے آشنا نہیں ہیں وہ رات کو تھوڑی دیر کھڑے رہے اور تھک گئے لیکن وہ رات بھر مصلّے پر کھڑے رہیں تو احساس نہ ہو۔

ہم تلواروں کے سایے میں لیٹ جائیں تو نیند نہ آئے کہ خوفِ موت طاری ہے وہ لیٹ جائیں تو ایسی نیند آئے جو کبھی نہ آئی ہو۔ صلوات۔

ہمارے سامنے خنجر، تلوار آجائے تو ہم قیام کرنا بھول جائیں۔ وہ تہہ خنجر سجدہ کرکے مطمئن رہیں اس لیے کہ انھوں نے اس لذّت یقین کو محسوس کرلیا ہے جس لذت یقین سے دنیا ناآشنا ہے۔ آلِ محمدؐ کے کردار کا یہ وہ امتیاز ہے جس کو دنیا کا کوئی انسان سمجھ نہیں سکتا ہے اس لئے کہ جلنے کی کیفیت کو وہی جانتا ہے جو آگ کے اندر چلا جائے۔

دنیا نے کبھی خدا کے ساتھ زندگی گذاری ہوتی۔ کبھی یادِ خدا میں صبح و شام گذارے ہوتے۔ کبھی محبّت الٰہی میں زندگی گذاری ہوتی تو معلوم ہوتا کہ لذّتِ یقین کیا ہے۔

اب میں مولائے کائناتؑ کا ایک جملہ جو دعائے کمیل میں مولا نے فرمایا ہے۔ اس کا حوالہ دیتا ہوں۔ اس سے اس لذّت کا احساس ہو جائے گا۔ خدایا ھَبْنِی صَبَرْتُ عَلٰی حَرِّ نَارِکَ پروردگار میں جہنّم کی گرمی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ میں عذاب کو برداشت کر سکتا ہوں مگر تیرے فراق کو برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔

یاد رکھئے گا یہ میں نے ایک نیا رخ آپ کے حوالے کیا ہے۔

خدایا عذاب تو برداشت ہو سکتا ہے مگر فراق برداشت نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ عذاب و ثواب غلاموں کے کام ہیں۔ بندوں کے کام ہیں اور وصل و فراق یہ عاشقوں کے کام ہیں۔ اب منزل بندگی اتنی بلند ہو گئی ہے کہ بندگی عشق کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ اب گرمی برداشت ہو سکتی ہے۔ آگ برداشت ہو سکتی ہے۔ مصیبت برداشت ہو سکتی ہے مگر خدایا تیرا فراق برداشت نہیں ہو سکتا ہے۔ عاشق کے لیے ہر مصیبت قابلِ برداشت ہے مگر معشوق کا فراق قابلِ برداشت نہیں ہوتا ہے۔ دنیا والوں کے معشوق دو پیسے کے ہوتے ہیں علیؑ کا معشوق کل کائنات کا پروردگار ہے اور اس منزل پر فائز ہونے والا ہی

جانتا ہے کہ خدا کے ساتھ رہنے کی لذّت کیا ہوتی ہے لہٰذا اسکی نظر میں عذاب برداشت بھی کرلیا جائے تو فراق برداشت نہیں ہوسکتا ہے۔

مولائے کائنات نے اسی نکتہ کو سمجھایا ہے کہ اگر انسان عشق خدا اپنے دل میں پیدا کرے اور اس کے شب و روز صبح و شام محبّت خدا اور یاد خدا کے ساتھ گذر جائیں تو وہ ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہیں کرسکتا ہے۔

اسی لیے بعض اہلِ معرفت نے ایک عجیب جملہ کہا ہے کہ پیغمبرؐ کے لیے کانٹوں پر چلنا مشکل کام نہیں تھا۔ تیر کھانا مشکل کام نہیں تھا، کوڑے کی مصیبت برداشت کرلینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہاں کے رہنے والے کو یہاں بھیجا گیا تھا کہ اگر بندۂ خدا نہ ہوتا اور کمال بندگی کی منزل پر نہ ہوتا تو اتنا بڑا فراق برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یاد رکھئے کہ نبی کو جتنی دیر قوم کے ساتھ رہنا پڑتا ہے وہ سب سے زیادہ سخت ترین لمحہ ہوتا ہے کہ اسے اُدھر سے مڑکر اِدھر دیکھنا پڑتا ہے۔

ہمارا حال تو یہ ہے کہ مسجد میں گئے آپ سے بات کررہے ہیں، ان سے بات کررہے ہیں۔ نماز کے دو گھنٹہ پہلے کوئی تھکن نہیں ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے کوئی الجھن نہیں ہے لیکن جیسے ہی اِدھر سے مڑکے اُدھر کھڑے ہوئے مصلّے پر اور نیت کی قربۃً الی اللہ تھکن شروع ہوگئی۔ یعنی نماز کے ایک گھنٹہ پہلے مسجد میں آئے۔ ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے لیکن نہ اکتاہٹ تھی نہ پریشانی۔ نہ الجھن تھی نہ کوئی مصیبت لیکن اگر نماز دو منٹ کے بجائے ڈھائی منٹ کی ہوجائے تو الجھن پیدا ہوجائے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم ہیں اِدھر والے۔ ہمیں اِدھر زیادہ لطف آتا ہے اور جب اُدھر رُخ کرکے کھڑے ہوتے ہیں تو پریشانی شروع ہوجاتی ہے تو جتنی اکتاہٹ، جتنی پریشانی، جتنی الجھن ہمیں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اِدھر سے مڑکے اُدھر کھڑے ہوتے ہیں اتنی ہی زحمت معصوم کو ہوتی ہے جب ان کو اُدھر سے مڑکے اِدھر دیکھنا پڑتا ہے اور اتنی دیر کے لیے مناجات رک جاتی ہے اس لیے کہ ہماری دنیا اِدھر کی دنیا ہے اور ان کا عالم اُدھر کا عالم ہے۔ صلوات

بات نامکمل رہ گئی لیکن تمہیداً ایک لفظ کی طرف اور اشارہ کر دوں کہ اگر یہ دولتِ یقین انسان میں پیدا ہو جائے اور انسان اس منزل پہ پہنچ جائے جو منزل یقین کو محسوس کرنے کی ہے اور یقین کی لذت کو جاننے اور برتنے اور سمجھنے کی ہے تو انسان کی زندگی کچھ اور ہی ہو جائے گی۔ ہماری زندگیاں اس منزل سے دور ہیں۔ لہٰذا کریم کو کرم میں مزہ آتا ہے اور بخیل کو بخل میں مزہ آتا ہے کہ بخیل کسی کریم کو کرم کرتے دیکھ لے تو فوراً اعتراض کر دے گا کہ اتنا پیسہ نہ خرچ کیجئے۔ اگر آئندہ ضرورت پڑ گئی تو کیا ہوگا کہ اس کو زیادہ خرچ کرنے میں تکلیف ہوتی ہے اور کریم کو زیادہ خرچ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ کتنے آدمی ایسے ہیں کہ جن کو دعوت کرنے میں مزہ آتا ہے اور دوسروں کے گھر میں کھانے میں مزہ نہیں آتا ہے اور کتنے ایسے ہیں کہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں تو بڑا مزہ آتا ہے اور اپنے گھر بلانا پڑ جائے یا کوئی آدمی آ بھی جائے تو فوراً آواز آتی ہے تشریف لے جائیے یہ کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ ہر آدمی کا اپنا ایک ذوق ہوتا ہے جس کا ذوق نیکیوں کا ہوتا ہے اسکو نیکیوں میں لذت کا احساس ہوتا ہے وہ نیکی کرتا نہیں ہے کہ یہ تو کوئی کام نہیں ہے کہ یہ تو بدترین آدمی بھی کر سکتا ہے۔ وہ نیکی کرنے کی لذت محسوس کرتا ہے۔

تاریخ میں ایک لطیف واقعہ آج ہی میں نے دیکھا کہ مولائے کائنات نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا۔ ایسی نماز کہ کب شروع ہوئی اور کب ختم ہو گئی کچھ نہیں معلوم ہے تو مولا کو غصہ آ گیا جیسے ہی اس نے نماز ختم کی فرمایا۔ نالائق یہ کون سی نماز ہے؟ یہ نماز اس قابل نہیں ہے کہ خدا اس پر ثواب دے۔ یہ نماز اس قابل ہے کہ میں اس پر تازیانے لگاؤں یہ توہین نماز ہے۔ یہ استہزاء ہے۔ یہ مذاق ہے نماز کا یہ نماز نہیں ہے۔ تو جیسے ہی مولا نے تازیانہ دکھلایا پھر کھڑا ہو گیا کہ حضور اگر وہ غلط ہو گئی ہے تو دوبارہ پڑھے لیتا ہوں۔ فوراً نماز شروع کر دی لیکن اب جلدی جلدی نہیں اب ذرا ہوش سے۔ دو رکعت نماز پڑھی اور جب نماز ختم ہو گئی تو اس نے کہا حضور آپ کو نماز پسند آ گئی؟ مولا نے سکوت اختیار فرمایا۔ اس نے کہا یہی والی نماز بہتر ہے یا پہلے والی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ویسی پڑھی

جائے یا ایسی۔ مولا نے مسکرا کے فرمایا پہلی بہتر تھی۔

یعنی پہلے اس سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ تم سزا کے قابل ہو اور اب جو دوسری پڑھ لی تو فرما رہے ہیں کہ پہلی والی ہی بہتر تھی۔ اس نے کہا حضور اگر پہلی والی بہتر تھی تو دوبارہ آپ نے کیوں پڑھوادی؟ فرمایا دونوں میں ایک فرق ہے وہ جیسی بھی تھی اللہ کے لیے تو تھی۔ ترتیب کے اعتبار سے، ارکان کے اعتبار سے، واجبات کے اعتبار سے غلط تھی۔ لہٰذا میرا فرض تھا کہ تنبیہہ کروں لیکن نیت کے اعتبار سے تو ٹھیک تھی دوسری تو تازیانہ دیکھ کر پڑھی گئی ہے ظاہر ہے کہ نیت کے اعتبار سے وہ نماز اس سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ آپ نے سمجھایا کہ اسلام دونوں باتیں چاہتا ہے نہ خالی ظاہری شکل نہ خالی نیت اگر تنہا نیت ہی کافی ہوتی تو پہلی نماز کو قبول کر لیا جاتا اس میں عیب یہ تھا کہ نیت ٹھیک تھی مگر عمل غلط تھا اس میں عیب یہ ہے کہ عمل صحیح ہو گیا مگر نیت غلط ہو گئی۔ پھر بھی مولا نے کہا کہ وہ اس سے بہتر تھی تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ اگر نیت میں پاکیزگی پیدا ہو جائے تو عمل کی اصلاح کے امکانات رہتے ہیں۔ صلوات۔

بس عزیزان محترم! باقی باتیں انشاء اللہ کل گذارش کروں گا کہ آخر اس دولت یقین کی انسان کو ضرورت کیوں ہے۔ بات یہ ہے کہ یقین انسان سے چھن جائے تو انسان کا کردار بدترین کردار ہو جائے گا اور اگر یہ دولت حقیقتاً انسان کو حاصل ہو جائے تو اس سے بہتر کسی کا کردار نہیں ہو سکتا ہے یہ دولت یقین روحانی ہے۔ یہ دولت یقین وہ ہے جس کا مرکز نفس ہے۔ روح ہے۔ اس کا تعلق جسم سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق قبائل سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق رنگ سے نہیں ہے لہٰذا اگر روح میں کمال پایا جاتا ہے تو انسان صاحب کمال کہا جائے گا چاہے رنگ کے اعتبار سے سیاہ ہی کیوں نہ ہو اور ملک کے اعتبار سے حبشی کیوں نہ ہو۔ پسینہ کے اعتبار سے پسینہ بدبو دار کیوں نہ ہو۔

اسی حقیقت کو کربلا نے بے نقاب کیا ہے کہ انسان کی دولت فضائل قبائل کی محتاج نہیں ہے۔ رنگ و نسل کی محتاج نہیں ہے۔ ورنہ جون غلام ہے۔ واضح ترکی غلام ہے۔ اسلم

غلام ہے. شوذب غلام ہے. کربلا میں ایک دو نہیں. کتنے افراد ہیں جو قانونی اعتبار سے غلام کہے جاتے ہیں ورنہ حسینؑ کے اعتبار سے تو سب ہی غلام تھے. امامؑ کے اعتبار سے تو جو بھائی تھے وہ بھی غلام تھے مگر قانونی اعتبار سے بھی کربلا میں وہ سب آ گئے تھے جو شرعاً اور اصطلاحاً غلام کہے جاتے تھے مگر منزلِ فضائل میں ایسا نہیں ہوا کہ زیارت پڑھنے والا جب کہے السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ وَأَحِبَّاءَهُ اے اولیائے خدا تم پر ہمارا سلام. اے خدا کے چاہنے والو تم پر ہمارا سلام. تم پر ہمارے ماں باپ قربان تو جون کو الگ کر دے بلکہ چاہنے والے صاحبِ ایمان نے جب بھی آواز دی ہے بِأَبِي أَنْتُمْ وَأُمِّي کربلا والو تم پر ہمارے ماں باپ قربان. تو اس میں حبیب بھی شامل ہیں، مسلم بھی شامل ہیں. زہیر بھی شامل ہیں. بریر بھی شامل ہیں. کربلا کے سارے آزاد انصار بھی شامل ہیں اور اسی میں جون بھی شامل ہے یعنی لے جون ہم آزاد ہیں لیکن تجھ جیسے غلام پر قربان ہیں)۔ جون ہمارا رنگ صاف ہے مگر تجھ جیسے سیاہ فام غلام پر قربان ہیں ہم بہترین نسل و نسب والے ہیں مگر ہماری جانیں تم پر قربان ہیں. تم تو جس منزلِ فضائل پر ہو وہاں یہ دنیا نہیں پہنچ سکتی ہے.

عزیزو! دنیا کے سارے آزاد جس پر قربان ہو جائیں وہ کربلا کے غلام ہیں. سارے حسین جن پر قربان ہو جائیں وہ کربلا کے سیاہ رنگ والے افراد ہیں. دنیا کے سارے عالی نسب جن پر قربان ہو جائیں وہ کربلا کے وہ افراد ہیں جو مختلف قبائل سے آکر جمع ہو گئے تھے مگر سب اس قابل تھے کہ سارا عالم انسانیت سارا عالم ایمان، ان کے جذبہ قربانی، ان کے فضائل، ان کے مناقب، ان کے اخلاق اور یقین پر قربان ہو جائے.

کیسا یقین کہ سمجھانے والے سمجھا رہے ہیں، بہکانے والے بہکا رہے ہیں کہ کیوں اپنی جان دے رہے ہو. کیوں اپنی جان قربان کر رہے ہو. کیوں مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہو. حد یہ ہے کہ فرزند رسولؐ نے بھی اعلان عام کر دیا ہے کہ جو جانا چاہے وہ چلا جائے. یہ ظالم میری جان کے دشمن ہیں. یہ ظالم میرے خون کے پیاسے ہیں. میں اپنا طوقِ بیعت اتار لیتا ہوں. میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھائے لیتا ہوں اور

اس میں کسی آزادی کی کوئی تخصیص نہیں ہے لیکن جیسے ہی امام حسینؑ کا خطبہ تمام ہوا۔ اگر اس طرف سے بنی ہاشم کی نمائندگی میں عباس علمدارؑ کھڑے ہو گئے۔ مولا یہ کیا فرمار ہے ہیں چاہنے والے آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو دوسری طرف جب بنی ہاشم کی ترجمانی تمام ہوگئی تو زہیر کھڑے ہو گئے اصحاب کی ترجمانی کے لیے۔ اور زہیر کی تقریر ختم ہو گئی تو حبیب بولنے لگے گویا یہ کربلا والوں کی منزل یقین تھی کہ شمع بجھ گئی۔ محفل میں اندھیرا چھا گیا۔ امام حسینؑ نے اجازت دے دی مگر اس کے بعد بھی جب دوبارہ شمع جلی تو دیکھا سب ویسے ہی بیٹھے ہوئے ہیں مولا ایک دفعہ کا مرنا جینا کیا اگر ستر مرتبہ مارے جائیں اور پھر زندہ ہوں تو آپ کے قدموں کو چھوڑ کے نہیں جا سکتے ہیں۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ اگر ہزار مرتبہ قتل کیے جائیں اور ہماری لاش کو جلا دیا جائے۔ ہماری راکھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے تو فاطمہؑ کے لال آپ ہی کے قدموں میں رہیں گے۔

____________ یہ اعلان عام تھا جو سارے اصحاب کے لیے، سارے انصار کے لیے اور سارے بنی ہاشم کے لیے تھا لیکن اب غلاموں کی منزل یقین دیکھئے کہ جب جون حسینؑ کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے جو حسینؑ کے غلام نہیں ابوذر کے غلام ہیں اور کہا کہ فرزند رسولؐ اب مجھے بھی مرنے کی اجازت دے دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ جون! غلام اپنے آقاؤں کے ساتھ اس لیے آتے ہیں کہ ان کے ساتھ رہیں گے تو زندگی میں کچھ سکون، کچھ عافیت، کچھ آرام مل جائے گا۔ غلاموں کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں ہوتا ہے غلاموں کے پاس آرام سے کھانے پینے کا وسیلہ نہیں ہوتا ہے۔ اپنے آقاؤں کے زیر سایہ رہتے ہیں تو گھر میں کھانا مل جاتا ہے، لباس مل جاتا ہے۔ آرام مل جاتا ہے۔ غلام اپنے آقا کے ساتھ مرنے کے لیے، تلواروں کے لیے، خون بہانے کے لیے نہیں رہتے ہیں۔ تم غلام ہو ابوذر کے ساتھ رہے اپنی عافیت اور راحت کے لیے تو میں نہیں چاہتا کہ تم مبتلائے مصیبت ہو لہٰذا اگر جانا چاہتے ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔

میں نہیں جانتا کہ مولا نے یہ بات جون سے کیوں کہی۔ شاید اس کا راز یہ رہا ہو کہ عاشور کی رات جب امام نے اعلان کیا تھا تو جتنے مقرّرین تھے سب آزاد تھے کوئی غلام نہیں تھا یعنی غلاموں کے جذبات کی ترجمانی نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا امام حسینؑ نے چاہا کہ غلاموں کی ترجمانی بھی ہوجائے۔

فرمایا غلام آقا کے ساتھ عافیت اور راحت کے لیے آتے ہیں لہٰذا تم مصیبت میں اپنے کو مت ڈالو۔ اگر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ بس یہ سنا تھا کہ ابھی تک تو کھڑے ہوئے مولا سے باتیں کر رہے تھے۔ نگاہیں ملا کے مولا سے گفتگو کر رہے تھے لیکن جیسے ہی آقا نے کہا جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ ایک مرتبہ جون حسینؑ کے قدموں پر گر پڑے۔ سر قدموں پر رکھ دیا اور روایت کہتی ہے کہ قدموں پر آنکھیں ملنا شروع کر دیں۔ مولا یہ آپ نے کیسے کہدیا ہم راحت کے لیے، آرام کے لیے آئے ہیں۔ ہم عافیت کے لیے آئے ہیں۔ اُس سے بڑا احسان فراموش کون ہوگا۔ جو راحت میں آقا کے ساتھ رہے اور جب مولا مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے تو جان بچانے کی فکر کرنے لگے۔ آقا آپ یہ نہ کہئے گا۔ غلام کے لیے یہ الفاظ قابل برداشت نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں شاید کہ آپ مجھے اجازت نہیں دے رہے ہیں تو اس کا راز یہ ہے کہ میرا رنگ سیاہ ہے۔ میرا نسب بنی ہاشم جیسا نہیں ہے میرے پسینہ سے بو آرہی ہے۔ تو مولا ایک بات میں بھی کہے دے رہا ہوں اگر میری محبت حقیقی ہے اگر میرا عشق آپ سے واقعی ہے تو یہ خون بھی وہیں رہے گا جہاں سب کا خون رہے گا۔

جون نے اپنی محبّت کے بھروسے پر یہ فقرہ کہہ دیا اور حسینؑ نے چاہنے والے کو گلے سے لگا لیا۔ جون میں تمہارے پسینے کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں تمہارے خون کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں تمہارے ایمان کو پہچانتا ہوں۔ میں تمہارے یقین کو پہچانتا ہوں۔ میں تمہارے کمال کو جانتا ہوں۔ تمہیں اس لیے روک لیا تھا کہ میرا بیٹا بیمار ہے جب سب مقتل میں کام آجائیں گے تو میرے بیٹے کی خدمت کون کرے گا۔ میں نے تمہیں عابدِ بیمار کی خدمت کے لیے روک لیا تھا۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو میں کچھ نہ کہوں گا۔ بس ایک مرتبہ جون مولا کے سامنے سے اٹھے۔ پشتِ خیمہ پر آکر آواز دی۔ فرزند رسولؐ

عابدؑ بیمار کے کانوں میں آواز آئی جون کی آواز کو پہچانا۔ جون خیر تو ہے کیوں آئے کہا مولا سے مرنے کی اجازت لینے گیا تھا۔ مولا نے فرمایا ہے کہ تم کو میں نے بیمار بیٹے کی خدمت کے لیے روکا ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ آپ کی خدمت کے لیے رہ جاؤں یا آپ کے بابا پر قربان ہو جاؤں۔ آواز آئی جون اگر میرے مقدر میں بابا پر قربان ہونا نہیں ہے تو جاؤ میری طرف سے تم بابا پر قربان ہو جاؤ۔

جون آئے۔ مولا کے سامنے۔ آقا اجازت لے کے آیا ہوں حسینؑ نے کہا جاؤ میں نے بھی اجازت دے دی۔ جون میدان میں آئے جہاد کرتے رہے۔ گھوڑے سے گرتے ہوئے آواز دی۔ مولا غلام کی خبر لیجئے۔ حسینؑ جونؑ کے سرہانے آئے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ وفا کا اعلان کیا۔ ہاں شاباش چاہنے والے وفادار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جون ہمارا اور جون یہ کہتے رہے۔ مولا آپ نے دیکھ لیا جو میں نے کہا تھا کہ اگر میری محبت سچی ہے تو یہ خون شہیدوں کے خون میں مل کے رہے گا۔ حسینؑ جون کے سرہانے سے اٹھے۔ چاہنے والے کا لاشہ اٹھایا اور محبت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد ایک غلام اور جب گھوڑے سے گرنے لگا تو مولا کو پکارا۔ مولا دوڑ کے مقتل میں آئے سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ جون سے تو باتیں بھی ہوئی تھیں لیکن یہ غلام تو بولنے کے قابل بھی نہیں تھا غش کے عالم میں تھا۔ اب حسینؑ کیسے پانی چھڑکیں کہ چاہنے والے کو ہوش آجائے۔ ایک مرتبہ زہراؑ کے لال نے اپنا رخسار رخسارہ پر رکھ دیا آنکھوں سے آنسو بہے۔ آنسوؤں کی گرمی محسوس ہوئی تو غلام نے آنکھیں کھول دیں۔ ارے مولا یہ کیا کر رہے ہیں آپ کا رخسارہ اور میرے رخسارہ پر آپ فرزند زہراؑ ہیں۔

فرمایا تو نے راہ حق میں قربانی دی ہے۔ یہ تیرا حق ہے کہ میرا رخسارہ تیرے رخسارہ پر رہے اور میں تیری محبت اور قربانی کا حق ادا کر دوں۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

□□

مجلس ۴

توحید و شرک

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ۔

ن قسم ہے قلم اور تحریر کی پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمتوں کی بنیاد پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپؐ کے لئے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون کون ہے اور دیوانہ کون ہے؟

آیاتِ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ کلام فضائل اور رذائل کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جارہا تھا اس کے چوتھے مرحلہ پر انسانی نفس کی ایک اور فضیلت اور انسانی نفس کے ایک اور عیب کی نشان دہی کرنا ہے۔

یقین کے بعد انسانی نفس کا سب سے بڑا کمال ہے توحید پروردگار کا اقرار اور انسانی نفس کی سب سے بڑی کمزوری کا نام ہے شرک۔

شرک اور توحید کا مسئلہ ہر دور میں اہمیت کا مالک رہا ہے اور آج بھی اہمیت کا مالک ہے لیکن آج کے دور میں یہ مسئلہ غالباً گذشتہ زمانوں سے زیادہ ہی اہمیت اختیار کر گیا ہے اس لئے کہ گذشتہ ادوار میں توحید کے وہ معنی نہیں تھے جو آج بیسویں صدی میں پیدا ہو گئے ہیں۔ کل عقیدۂ توحید رکھنے کے بعد بھی انسان کے لئے بہت سے اعمال کی گنجائش تھی

اور کسی نے ان اعمال کو عقیدۂ توحید کے خلاف نہیں قرار دیا تھا. مسلمان سرکار دو عالم کو سلام بھی کرتے تھے. مسلمان سرکار دو عالم کے لئے قیام بھی کرتے تھے. مسلمان اولیاء اللہ کے مرنے کے بعد بھی ان کا احترام کرتے تھے. مسلمان آستانوں کو بوسے دیا کرتے تھے. مگر ان میں سے کوئی بھی عمل توحید پروردگار کے خلاف نہیں سمجھا جاتا تھا. بیسویں صدی میں عقیدۂ توحید نے اتنی ترقی کرلی ہے اور اس میں اتنا جمود اور ایسی خشکی پیدا ہوگئی ہے کہ اب عقیدۂ توحید کے معنی فقط دنیا سے رابطہ توڑ لینا نہیں ہے بلکہ احسان فراموشی بھی ہے.

بزرگوں کی مخالفت کا نام ہے توحید. کسی آستانے کو بوسہ نہ دینے کا نام ہے توحید کسی انسان سے محنت لینے کے بعد اجرت رسالت نہ دینے کا نام ہے توحید. یعنی ہر وہ کام جو انسان کو اس کے حالات کے اعتبار سے اچھا دکھائی دے وہی مناسب توحید ہے اور جو کام اس کے سیاسی مصالح کے خلاف ہو جائے وہی مخالف توحید ہے.

ضرورت ہے کہ مسئلہ توحید کی واقعی وضاحت کی جائے اور اندازہ لگایا جائے کہ اس عقیدہ کے حدود کیا ہیں اور پھر عقیدہ کے بعد انسان کے اعمال میں کتنی گنجائش پائی جاتی ہے اور کن منزلوں پر آکر یہ عقیدہ انسان کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیتا ہے.

لیکن ان سارے مسائل کی وضاحت سے پہلے میں اپنے گذشتہ موضوع کی تکمیل کے لئے چند جملے گذارش کرنا چاہتا ہوں جو اسی عقیدۂ توحید سے وابستہ ہیں اور اس مسئلہ کا خاتمہ ہی در حقیقت اس سلسلہ کا آغاز ہے.

انسانی زندگی کی اصلاح کے لئے آٹھ وسائل اور آٹھ ذرائع ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کی اصلاح کیا کرتے ہیں اور انسان کو برائیوں سے روکتے ہیں. دیکھنا یہ ہے کہ ان سارے وسائل اور ذرائع کے درمیان یقین کی جگہ کہاں ہے؟ اور یقین کا مرتبہ اور اس کی عظمت کیا ہے.

یاد رکھئے کہ جو چیزیں انسان کو برائیوں سے روکتی ہیں اور انسانی معاشرہ میں اصلاح پیدا کرتی ہیں ان تمام چیزوں میں سب سے پہلی چیز کا نام ہے عقل.

دیوانے سے یہ توقع نہیں کی جاتی ہے کہ وہ اصلاح کرے گا. دیوانے سے یہ امید

نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ برائیوں سے پرہیز کرے گا۔ اس کے سامنے جو آئے گا اسے پتھر مارے گا چاہے پتھر مارنے کا حقدار ہو یا نہ ہو، دیوانے کے سامنے جو چیز آجائے گی اسے استعمال کرلے گا چاہے دنیا کا کوئی قانون اسکی اجازت دیتا ہو چاہے نہ دیتا ہو۔

اسی لئے دین اسلام نے بھی اپنے قوانین کو دیوانوں سے ہٹالیا ہے تاکہ انسانوں کو اندازہ ہو جائے کہ اسلام عقل والوں کے لئے آیا ہے دیوانوں کے لئے نہیں آیا ہے۔ اور عزیزان محترم یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے کہ وہ اسلام جو اپنے کسی قانون کو دیوانے سے وابستہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو اپنے سارے واجبات اور سارے محرمات، سارے احکام، سارے قوانین کو دیوانوں سے الگ رکھتا تھا کہ دیوانے کے لئے کوئی واجب نہیں ہے، کوئی شئی حرام نہیں ہے۔ اس کے لئے مستحبات نہیں ہیں۔ اس کے لئے مکروہات نہیں ہیں اسی اسلام کے پیغمبرؐ کے بارے میں کہا جانے لگا کہ ان کا دماغ بہک گیا ہے؟ اس سے بڑی دیوانگی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس سے بڑا جنون اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہ انسان ایسے دین کے ذمہ دار کے بارے میں ایسے مہمل تصورات رکھتا ہو۔

اسی لئے اللہ نے پیغمبرؐ کی زبان سے یہ پیغام پہنچایا: "قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ" پیغمبرؐ آپ ان سے کہدیجئے کہ میں کوئی طویل و عریض بات نہیں کہنا چاہتا ہوں تمہیں فقط ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ بس اتنی سی بات مان لو اس کے آگے کوئی مسئلہ نہیں ہے اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى۔ اللہ کے لئے اٹھو چاہے اکیلے اٹھو چاہے دو دو کی جماعت کے ساتھ اٹھو۔ فرادی اٹھو یا جماعت کے ساتھ اٹھو ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا اس کے بعد سوچو۔ اگر اکیلے سمجھ سکتے ہو تو اکیلے سمجھو۔ اگر تنہا عقل میں بات نہیں آتی تو دو دو مل کے اٹھو تاکہ مشترکہ عقل سے یہ بات سمجھ میں آجائے کہ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ تمہارا ساتھی پیغمبرؐ مجنون نہیں ہے۔ اللہ! وہ اسلام جس کے پاس لاکھوں احکام، وہ اسلام جس کے پاس کروڑوں احکام ہیں، وہ اسلام جس کے پاس اجتماعیات، اخلاقیات، عقائد، احکام، سیاسیات، معاشیات زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو دین اسلام میں نہ پایا جاتا ہو۔ اس اسلام کا پیغمبرؐ خدا کے

حکم سے کہتا ہے کہ بس مجھے صرف ایک نصیحت کرنا ہے۔ نہ نماز کی نصیحت، نہ روزہ کی نصیحت، نہ شراب چھوڑنے کی نصیحت، نہ زنا سے کنارہ کش ہونے کی نصیحت، نہ یہ کام کرنے کی نصیحت نہ وہ کام چھوڑنے کی نصیحت، ایک نصیحت فقط یہ کہ سب مل کے یہ طے کرو کہ تمہارا پیغمبرؐ دیوانہ نہیں ہے۔ آپ نے غور کیا کہ سارا زور ایک نصیحت پر کیوں ہے؟

بات یہ ہے کہ اگر پیغمبرؐ کے بارے میں جنون کا تصور بھی پیدا ہو گیا تو نماز کی کیا اوقات رہ جائے گی، روزے کی کیا حقیقت رہ جائے گی؟ واجبات کی کیا قیمت ہوگی؟ محرمات کا کیا وزن رہے گا؟ پوری شریعت کا دارو مدار تو ایک پیغمبرؐ کی عقل پر ہے۔ پورے قانون کا دارو مدار تو ایک پیغمبرؐ کے مجنون نہ ہونے پر ہے کہ یہ پیغمبرؐ اگر صاحب عقل ہے تو سارا دین قیمت رکھتا ہے، سارا قانون وزن رکھتا ہے۔ سارے واجبات کی اہمیت ہے، سارے محرمات کی اہمیت ہے ورنہ اگر پیغمبرؐ کے دماغ میں جنون شامل ہو جائے تو مذہب کے کسی قانون کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اللہ نے کہا پیغمبرؐ انھیں اتنا سمجھا دو کہ اتنا مان لیں کہ تم دیوانے نہیں ہو میرا دین خود ہی زندہ ہو جائے گا۔ ورنہ اگر تمہارے جنون کا خیال پیدا ہو گیا تو سارا دین مردہ ہو جائے گا۔ تو عزیز و اب مجھے ایک بات کہنے دیجئے، کہ جب سارے دین کا دارو مدار ایک پیغمبرؐ کی عقل پر ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبرؐ کی عقل کا اقرار دین کی عظمت کا اقرار ہے اور پیغمبرؐ کے دماغ سے اعتبار اٹھا لینا صرف ایک انسان کی توہین نہیں ہے بلکہ پورے اسلام کی توہین ہے کہ اگر نبی کا اعتبار نہیں ہے تو اسلام میں کسی شئی کا اعتبار نہیں ہے۔ صلوات

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ انسان کو برائیوں سے روکنے والی پہلی چیز کا نام ہے عقل یہی وجہ ہے کہ دیوانے سے کسی خیر و خوبی کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ کام صاحبان عقل کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جانوروں کی زندگی الگ ہوتی ہے اور انسانوں کی زندگی الگ ہوتی ہے۔ جانور کے سامنے جو غذا آ جاتی ہے اسے کھا لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اچھی ہے یا بری اپنی ہے یا پرائی لیکن انسان کے سامنے جب کوئی شئی آتا ہے تو پہلے سوچتا ہے کہ جائز ہے

یا ناجائز؟ پاک ہے یا نجس؟ مفید ہے یا مضر؟ اپنی ہے یا غیر کی ہے۔ یہ سارا تفرقہ کس نے پیدا کیا ہے؟ اسی عقل نے کہ انسان کو برائیوں سے روکنے والی پہلی چیز کا نام ہے عقل۔

مگر اہلِ عقل بھی دو طرح کے ہیں۔

وہ عقل والے جو جاہل ہوتے ہیں۔ وہ پاگل دیوانے نہیں ہوتے ہیں وہ بھی صاحبانِ عقل ہوتے ہیں اور جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہ بھی صاحبانِ عقل ہیں مگر دونوں میں فرق ہوتا ہی کہ ایک کے پاس دولتِ علم ہوتی ہے ایک کے پاس خالی عقل ہوتی ہے۔ علم والا جانتا ہے کہ برائی کیا ہے؟ عقل والے کو نہیں معلوم کہ برائی کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ برائی کو برائی سمجھتا ہو اور ہوسکتا ہے کہ اچھائی کو برائی سمجھتا ہو۔ سماج کی ساری خرابی یہی ہے کہ ہر آدمی نے اپنے گھر میں طے کر لیا ہے کہ یہ کام اچھا ہے اور یہ کام برا ہے اور جس کو اچھا سمجھ لیا کرنا شروع کر دیا اور جس کو برا سمجھ لیا چھوڑ دیا۔ دس برس کے بعد بیس برس کے بعد معلوم ہوا کہ جس کو بیس سال سے چھوڑے ہوئے تھے وہی مستحب تھا۔ ہم نے بچپنے میں اپنے بزرگوں کو دیکھا تھا کہ اگر کسی بچے کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا تو ڈانٹ دیا کہ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر پانی پینا اچھا کام ہے اور کھڑے ہو کر پانی پینا برا کام ہے۔ ہمارے دادا نے یہی کام کیا ان کی جگہ پر باپ آئے انھوں نے بھی یہی کام کیا ہم آئے ہم نے بھی یہی کام کیا۔ اس لئے کہ پڑھا تو کسی نے نہیں تھا۔ سب نے خالی گھر میں سیکھا تھا جس کو بتا دیا گیا کہ یہ کام اچھا ہے اور یہ کام برا ہے۔ اچھا کام اختیار کر لیا برے کام کو چھوڑ دیا لیکن جب علم درمیان میں آیا اور مسائل پڑھے۔ توضیح المسائل وغیرہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ معصومین علیہم السلام وغیرہ کی تعلیمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ رات کے وقت کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ ہے اور برا کام ہے اگرچہ حرام نہیں ہے لیکن دن کے وقت پانی پینا کھڑے ہو کر ہی بہتر ہے اور اچھا کام ہے تو اب سوچئے کہ ہم جو پچیس سال سے بیٹھ کے دن میں پانی پی رہے تھے اور اپنی دانست میں خیر و خوبی کا ریکارڈ توڑ رکھا تھا اسکی کیا قیمت تھی۔ درحقیقت ہم بھی اسی پانی میں ڈوب رہے تھے اور نسلوں کو بھی ڈبو رہے تھے۔ اس لئے کہ جس کو اچھا سمجھا وہ کرنے لگے اور جس کو برا سمجھا وہ چھوڑ دیا۔ یہ تو بہت سامنے کی مثال تھی جہاں واجب اور حرام

کا جھگڑا نہیں تھا اور نہ سیکڑوں مثالیں آپ کو ایسی ملیں گی کہ جہاں واجب اور حرام کے جھگڑے بھی ہیں مگر انسانوں نے حرام کو اختیار کر لیا اور واجبات کو چھوڑ دیا۔ مثال کے طور پر ایک انسان کا ایک انسان سے رشتہ ہونے والا ہے۔ اسلام اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اندھا رشتہ ہو کر کوئی آکے دھوکہ دے دے کہ یہ لڑکا بہت عمدہ ہے۔ کیا کہنا اس کے فضائل و کمالات کا اور پھر لڑکی کے فضائل کا بھی کیا کہنا؟ اور پھر رشتہ ہو جائے اور اس کے دوسرے ہی دن جھگڑا شروع ہو جائے اور جس کا جس سے رشتہ ہونے والا ہے وہ لڑکی لڑکے کو نہ دیکھنے پائے یا وہ لڑکا لڑکی کو نہ دیکھنے پائے کہ یہی معاشرہ کا کمال ہے۔ اس کے بعد جب عقد ہو جائے تو خاندان کے تمام افراد آئیں اور لڑکی کو دیکھ کر دس دس، بیس بیس روپئے دیتے جائیں اور نامحرم آکے دیکھ جائیں اور اسی کا نام اخلاق رکھ دیا جائے اور جس کو زندگی گذارنا ہے اس کے دیکھنے کو بدتمیزی قرار دیدیا جائے۔ دین اسلام نے اسی سماجی قانون کے مقابلے میں یہ قانون پیش کیا تھا کہ جس سے رشتہ طے ہو گیا ہو اگر ذرا شبہ ہے کہ یہ لڑکی میرے لئے قابل برداشت نہ ہو یا لڑکی کو شبہ ہے کہ شاید یہ لڑکا میرے واسطے قابل برداشت نہ ہو تو اسلام نے دونوں کو اجازت دی ہے کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ تفریحاً نہیں رشتہ کے لئے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر نہیں بلکہ جس سے رشتہ طے ہوا ہے اسے۔ ورنہ چوراہے پر کھڑے ہو کر نہیں کہ ہمیں شادی کرنا ہے لہٰذا کوئی ادھر سے گذرنے نہ پائے۔ ایسا کوئی قانون اسلام میں نہیں ہے

میں نے یہ سادہ مثال اس لئے دی ہے کہ اگر میں یہ کہہ دوں کہ بہت سی برائیاں ہیں جن کو لوگ اچھائی سمجھے ہوئے ہیں تو ہر شخص کہے گا کہ الحمدللہ ہمارے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پتہ نہیں مولانا کہاں سے خبر لے آئے ہیں۔ مشرق و مغرب ہر جگہ چکر لگایا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے یہ خبر لے کر آئے ہیں۔ نہیں میں آپ ہی کے گھر سے یہ خبر لے کر آیا ہوں۔ اپنے ہی معاشرہ سے یہ خبر لے کر آیا ہوں۔ آپ کا میرا خاندان کوئی الگ نہیں ہے۔ یہ ہمارے یہاں سماج کا حال ہے جس کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے اس کو سب نے مل کر حرام قرار دے دیا ہے اور جس کو اسلام نے حرام کیا ہے اس کو سب نے مل کر حلال بنا لیا ہے۔ ایک شخص نے حلال محمدؐ کو حرام

کردیا تھا تو آج تک دینار و رہی ہے اور پورا معاشرہ حلال محمد کو حرام بنا دے تو کوئی کہنے والا نہیں ہے جیسا جہیز کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں تھی اسکی جگہ واجبات کی ہوگئی ہے اور جو اسلام میں واجب تھا وہ مکروہات میں شامل ہوگیا ہے یہ کس بات کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ دیوانے نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ عقل سب کے پاس ہے علم کسی کے پاس نہیں ہے لہٰذا تنہا عقل کبھی معاشرہ کی اصلاح نہیں کر سکتی ہے۔ عقل کے ساتھ علم درکار ہے۔ یہ پڑھو کر پانی کیسے پیا جائے گا یہ پڑھو کہ کس کی شکل دیکھنا جائز ہے کس کی شکل دیکھنا ناجائز ہے۔ یہ پڑھو کہ کیا واجب ہے اور کیا غیر واجب ہے۔ جہیز واجبات میں نہیں ہے لیکن مہر واجبات میں ہے۔ جو واجبات ہیں ان کی پابندی کرو اور جو غیر واجب ہیں انھیں چھوڑنے کی فکر کرو۔

پڑھو تاکہ معلوم ہو کہ فوٹو گرافر کا گھر کے اندر آکر فلم بنانا کیسا ہے؟ زندگی بھر فلم رکھے رہو کہ یہ ہماری شادی کا ویڈیو ہے۔ ارے تم قبرستان کا ویڈیو بناؤ کہ جہاں جانا ہے۔ ۶۰ سال کی عمر ہوگئی اور شادی کے ویڈیو دیکھ کر کیا کرو گے۔ کسی کے گھر میں قبرستان کا ویڈیو نہیں ہے۔ سب کے گھر میں وہی ویڈیو بنے ہوئے ہیں اور سب کو دکھلا بھی دیتے ہیں کہ یہ فلاں خاتون ہیں یہ فلاں خاتون ہیں۔ یعنی جن جن کی شکل کو دیکھنا اسلام نے حرام قرار دیا تھا وہ سب اسی دن دیکھی گئیں اور پھر جب تک یہ چلتی رہے گی سارے خاندان کے دوست احباب ایک ایک نامحرم کی شکل دیکھتے رہیں گے یہ سماج میں حرام حلال نہیں ہو رہا ہے تو کیا ہو رہا ہے؟

یہ ساری باتیں میں اس لئے گذارش کر رہا ہوں کہ آپ اسے محسوس کریں کہ تنہا عقل انسان کو برائیوں سے روکنے کے لئے کافی نہیں ہے عقل کے ساتھ علم کا ہونا ضروری ہے تو پہلی شے جو برائیوں سے روکنے والی ہے اس کا نام ہے عقل اور دوسری چیز جو روکنے والی ہے اس کا نام ہے علم۔ مگر پروردگار جانتا تھا کہ تنہا علم اگر برائیوں سے روک سکتا ہوتا تو پڑھے لکھے انسان کیوں احمق بن جاتے اور وہ کیوں برائیاں کرتے ہیں لہٰذا اس نے انسان پر ایک نیا احسان کیا کہ اس کے نفس کے اندر، اس کی روح میں ایک ایسی طاقت رکھ دی کہ جیسے ہی برائی سامنے آئے فوراً اسے ٹوک دے اور یہی وجہ ہے کہ اگر انسان جھوٹ بولنا چاہے

تو بول تو لیتا ہے مگر خود ہی محسوس کرتا ہے کہ جیسے اندر سے کوئی ٹوک رہا ہے۔ باہر والے تو حسن تقریر سے مرعوب بھی ہو سکتے ہیں مگر اندر سے کوئی ہے جو برابر ٹوک رہا ہے یہ تم غلط کہہ رہے ہو یہ تم مکاری کر رہے ہو یہ تم عیاری کر رہے ہو یہ تم خیانت کر رہے ہو۔ یہ طاقت وہ ہے جو جاہل کو جہالت کا احساس دلاتی ہے اور بدکار کو بدکاری پر ٹوکتی ہے کہ اگر یہ طاقت نہ ہوتی تو علم بھی بیکار ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ نفس کی اس طاقت کو خدا نے اتنا بلند بنا دیا ہے کہ بہ نگاہ پروردگار میں قسم کھانے کے لائق ہو گیا ہے وَالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اللہ نے نفس کی قسم کھائی ہے جو ملامت کرنے والا ہے۔ جو برائیوں پر ٹوکنے والا ہے۔ تاریخ اسلام میں یہ واقعہ پایا جاتا ہے کہ جس دور میں ستر ہزار منبروں سے مولائے کائنات کو گالیاں دی جا رہی تھیں اور آپ کو برا بھلا کہا جا رہا تھا۔ خلیفۃ المسلمین اور اپنے علاقے کا حاکم منبر پر آ کے علیؑ کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا اور بیٹا زیر منبر بیٹھا ہوا سن رہا تھا جب خطبہ ختم ہو گیا اور سب نمازی چلے گئے تو بیٹے نے باپ سے کہا بابا جان میں نے ایک نئی بات محسوس کی ہے آج آپ کی زبان میں روانی نہیں تھی اور جیسے ہی آپ نے ابو تراب کا ذکر شروع کیا آپ کے لہجہ میں لکنت پیدا ہو گئی آپ کے انداز میں کچھ فرق پیدا ہو گیا اور لوگوں نے شاید محسوس نہ کیا ہو لیکن میں نے محسوس کیا ہے۔ آپ مجھے بتائیے کہ آپ کے لہجہ میں اور بیان کی روانی میں فرق کیوں پیدا ہو گیا تھا؟ اس نے کہا بیٹا یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے جب آدمی دل کی بات کہتا ہے تو لہجہ اور ہوتا ہے اور جب ضمیر کے خلاف بولتا ہے تو لہجہ اور ہوتا ہے۔

مولائے کائنات کے نمائندے کی حیثیت سے جب جناب طرماح بن عدی شام میں وارد ہوئے اور حاکم شام کے دربار میں گفتگو شروع کی تو جو سوال بھی حاکم شام کی زبان پر آیا اس کے مقابلہ میں ایک فصیح و بلیغ تقریر شروع کر دی۔

جناب طرماح اونٹ پر سوار تھے ماشاء اللہ طویل القامت تھے تو جیسے ہی حاکم شام نے دیکھا اپنے ساتھیوں کے درمیان مذاق اڑانے کا پروگرام بنا لیا جو آج کل کا بھی فیشن ہے کہ جب کسی آدمی کی شخصیت کو پامال کرنا ہوتا ہے تو سب مل کر مذاق اڑانے لگتے ہیں اور وہ

غریب خاموش ہو جاتا ہے۔ حاکم شام نے یہی لہجہ اور انداز اختیار کیا کہ جیسے ہی جناب طرماح کو دیکھا سوال کر دیا کیا آسمان کی کوئی خبر لے کر آئے ہو۔

جناب طرماح نے نہایت سکون اور اطمینان سے فرمایا۔ ہاں ہاں میں آسمان کی خبر لے کر آیا ہوں۔ آسمان میں کون سی جگہ ہے جہاں میرے مولا کی حکومت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر جو آسمان کی خبریں بیان کرنا شروع کر دیں تو دربار کے حالات منقلب ہو گئے۔ اس کے بعد حاکم جو بھی سوال کرتا رہا طرماح کا جواب پہلے سے تیار تھا اور جب ساری گفتگو ختم ہو گئی تو فرمایا کہ میں ایک خط لے کر آیا ہوں کس کا خط ہے؟ فرمایا ایسے آدمی کا خط ہے جس کے یہ فضائل ہیں اور فضائل کا سلسلہ شروع کر دیا اس نے پوچھا کس کے نام ہے۔ فرمایا ایک منحوس کے نام، ایک نالائق کے نام، ایک نااہل کے نام۔ کہا اچھا لاؤ وہ خط دے دو۔ فرمایا تیرا نجس ہاتھ اس قابل کہاں ہے کہ یہ طیب و طاہر خط اس پر رکھ دیا جائے۔ کہا مجھے نہیں دینا چاہتے تو میرے بیٹے کو دیدو فرمایا کہ جب باپ ایسا ہے تو بیٹا کیسا ہو گا؟ کہا میرے وزیر کو دیدو فرمایا جب حاکم ایسا ہے تو وزیر کیسا ہو گا۔ ایک اکیلا آدمی تھا جو بھرے مجمع میں تقریر کر رہا تھا۔ اس کے بعد جناب طرماح چلے گئے تو عاجز آ کر حاکم شام نے عمرو عاص سے کہا۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک فاقہ کش کا فاقہ کش نمائندہ تمہارے سامنے ایسی تقریر کر کے چلا گیا اور تم ہر وقت دسترخوان پر مرغن غذائیں کھانے والے مفت خور تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ اس نے کہا حضور اگر یہ روانی تقریر غذا سے آتی ہوتی تو طرماح کے ہوش بھی ٹھکانے لگ جاتے لیکن کیا کروں یہ بات غذا سے پیدا نہیں ہوتی ہے۔ یہ بات حقانیت سے پیدا ہوتی ہے اور تیرے پاس وہ حق نہیں ہے جو علیؑ کے پاس ہے۔ صلوات

تو عزیزان محترم پہلی شئے جو انسان کو برائیوں سے روکنے والی ہے وہ ہے عقل اور دوسری چیز ہے علم اور تیسری چیز وہ اپنے اندر کی طاقت ہے جو نفس کے اندر پروردگار نے رکھ دی ہے جس کا نام ہے لوّامہ مگر یہ ساری طاقتیں بھی برائیوں سے روکنے کے لئے کافی نہیں ہیں اور اسی لئے قانون کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قانون کا بنانا اسی لئے ضروری ہے کہ اکثر صاحبان عقل برائی کو نہیں چھوڑتے ہیں۔ لیکن جب قانون سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے تو بالکل سیدھے ہو جاتے ہیں

مثال کے طور پر مائک سے برابر اعلان ہو رہا ہے کہ آپ حضرات بیٹھ جائیے۔ فرش عزا پر بیٹھ جائیے۔ جب گھر سے آ ہی گئے ہیں تو آئیے بیٹھ جائیے ثواب ملے گا اجر ملے گا مگر آپ اپنی جگہ سے اٹھتے نہیں ہیں اس کے بعد جیسے ہی پولیس کا آدمی آکر کھڑا ہو گیا تو شرافت سے بیٹھ گئے (غور کیا آپ نے) اگر انسان واقعتاً شریف ہوتا تو قانون کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اگر انسان کی عقل اسے سدھار سکتی تو قانون کا کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ اگر انسان کا علم یہ کام کر سکتا ہوتا تو قانون کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی مگر جب ساری طاقتیں ناکام ہونے لگیں تو کوئی قانون سامنے آیا۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قانون بھی ناکام ہو جاتا ہے کہ انسان میں قانون کو ماننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی ہے۔ اس کام کے واسطے تربیت رکھی گئی ہے۔ آپ اپنے گھروں میں دیکھا کرتے ہیں کہ جب کسی باپ یا ماں نے بچے کو سمجھانا چاہا اور دیکھا کہ برخوردار ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو کہا بیٹا چین سے بیٹھ جاؤ ورنہ پولیس آرہی ہے اور یہی تربیت ہوتی ہے جو بعد میں پولیس کے سامنے آجانے کے بعد آدمی کو شریف بنا دیتی ہے ورنہ اگر ماں نے سمجھا دیا ہوتا خبردار ان کی پرواہ مت کرنا دہ لاکھ آکے کھڑے ہو جائیں مار ہی تو کھاؤ گے اور کیا ہوگا تو اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا گویا کہ انسان کی اصلاح کے لئے ایک اور عنصر ہے جس کا نام ہے تربیت۔ تربیت صحیح ہوتی ہے تو انسان جلد راستے پر آجاتا ہے اور تربیت غلط ہوتی ہے تو نہ قانون سیدھا کر سکتا ہے نہ علم، نہ عقل راستے پر لا سکتی ہے اور نہ طاقت۔ تربیت کا ایک بہت بڑا حصّہ ہے جس کے لئے میں ایک تاریخی حوالہ دے رہا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ تربیت کا اثر کتنا ہوتا ہے اور اگر صحیح تربیت درمیان میں آجائے تو یزید کا بیٹا بھی ملی ہوئی حکومت کو ٹھکرا سکتا ہے جس دن یزید کے بیٹے نے تاج و تخت کو ٹھوکر مار دی ہر ایک کو فکر ہو گئی کہ تاج و تخت کو ٹھکرانے کا حوصلہ اور یزید کے بیٹے میں؟ یہ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ تلاش شروع ہوئی تو اندازہ ہوا کہ جس کو معلّم بنایا تھا وہی خطرناک ثابت ہوا۔ ہم سمجھے تھے کہ اس کا کام خالی پڑھا دینا ہے یہ کیا معلوم تھا کہ وہ ایسا ذہن تیار کر دے گا جس کے بعد یزید کا بیٹا بھی منبر پر آکر یہ اعلان کر سکتا ہے کہ یہ غاصبوں کی حکومت ہے۔ میرا دادا غاصب تھا، میرا باپ غاصب تھا، میں غاصب نہیں

بن سکتا ہوں. یہ کون سا جذبہ بول رہا تھا. یہ وہی جذبۂ تربیت تھا کہ جب کبھی کوئی طاقت انسان کو برائی سے نہیں روک سکتی ہے تو تربیت یہ کام انجام دیتی ہے. پیام اعظمی نے کیا عمدہ شعر کہا ہے. شخصیت کو آپ پہچانئے گا کہ ماں کی تربیت انسانی زندگی پر کتنی اثر انداز ہوتی ہے.

اپنی اولاد کی تقدیر بدل دیتی ہے باپ کے خون کی تاثیر بدل دیتی ہے

(صلوات)

بس عزیزان محترم میں بات کو مختصر کرنا چاہتا ہوں. پہلی طاقت کا نام ہے عقل، دوسری طاقت کا نام ہے علم تیسری قوت کا نام ہے نفس لوامہ، چوتھی طاقت ہے قانون اور پانچویں طاقت ہے تربیت اگر یہ بھی ناکافی ہو جائے تو ایک نیا سہارا آگے بڑھے گا جس کا نام ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر. یہ اسلام نے جو امر و نہی کو واجب قرار دیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ پچھلے سارے مقدمات، سارے وسائل ناکافی ہو جائیں. تو اسلام یہ کہتا ہے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرے اور برائیوں سے روکے. یہ وجوب اسی لئے آیا ہے کہ اگر تنہا قانون نہ روک سکے، اگر تنہا تربیت نہ روک سکے تو روکنے والے روکیں گے اور ہدایت دیں گے انسان نیکی کو چھوڑ دے گا اور کوئی ٹوک دے گا تو اختیار کرے گا اور جب برائی کرے گا اور کوئی ٹوک دے گا تو برائی کو چھوڑ دے گا. یہ امر و نہی وہ طاقتیں ہیں جو انسان کے کردار کی اصلاح کرتی ہیں.

اس کے بعد ساتویں طاقت جو انسانی معاشرہ کی اصلاح کرتی ہے اس کا نام ہے ایمان ایمان انسان کو ہزاروں برائیوں سے روک دیتا ہے. مگر عزیزانِ قوم! ایمان کی بھی دو قسمیں ہیں.

ایک ایمان وہ ہے جو خالی عقل میں رہتا ہے اور ایک ایمان وہ ہے جو عقل سے اندر اتر کے دل تک آجاتا ہے. قرآن مجید کہتا ہے کہ ہمارے پیغمبر یہ کفار و مشرکین یہ بے دین یہ ملحد لَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ آسمان و زمین کا خالق کون ہے؟ تو لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ان کے پاس سوائے اس ایک لفظ اللہ کے

اور کوئی جواب نہیں ہے۔ ہر ایک کا ایک ہی جواب ہوگا "اللہ" اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہے لفظیں کچھ بھی استعمال کریں لیکن حقیقت وہی اللہ ہے اس کے علاوہ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے تو اللہ کا ایمان عقل کے اندر ہر ایک کے پاس ہے مگر یہ جاننے کے بعد بھی کہ خدا خالق ہے خدا کو نہیں مانتے ہیں بتوں کو مانتے ہیں اس لئے کہ ایمان ابھی عقل میں ہے اس کے بعد ایک آخری منزل باقی رہ گئی ہے کہ جب تک ایمان عقل میں رہے گا تب تک ایمان بھی انسان کو برائیوں سے نہیں روک سکے گا لیکن جب دھیرے دھیرے عقل سے آگے بڑھ کر دل کی گہرائی میں اتر جائے گا تو اب وہ منزل آجائے گی کہ جہاں انسان برائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے اور ایمان جب دل میں اتر جاتا ہے تو اسی کا نام ہوتا ہے یقین وَلٰکِن لِیَطمَئِنَّ قَلبِی ابراہیم کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ خدا مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ کیا تمہیں میرے احیائے موتیٰ پر ایمان نہیں ہے کہ میں مُردوں کو زندہ کر سکتا ہوں؟ کہا بَلیٰ خدایا ایمان تو ہے وَلٰکِن لِیَطمَئِنَّ قَلبِی مگر اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ یہ اطمینان کیوں چاہتا ہوں اس لئے کہ ایمان کے بعد آخری مرحلہ کا نام ہے اطمینان قلب۔ اور اطمینان قلب جب پیدا ہوگا تو یقین سے پیدا ہوگا شک سے نہیں پیدا ہوگا۔ تو اب مجھے کہنے دیجئے کہ جس کو عقل نہ روک سکے، جس کو قانون نہ روک سکے، جس کو علم نہ روک سکے، جس کو نفسِ لوّامہ نہ روک سکے، جس کو تربیت نہ روک سکے، جس کو امر و نہی نہ روک سکیں اسے روکنے والا ہے یقین۔ تو جس کے پاس یقین نہیں ہے اسے ساری طاقتیں مل جائیں تو بھی غلطی کا امکان رہے گا لیکن اگر یقین میدان میں آجائے تو پھر برائی کا امکان نہیں رہ جاتا ہے لہٰذا جب کبھی کسی انسان کی اچھائی یا برائی کو دیکھنا ہو تو اس کی عقل کو نہ دیکھو اس کے علم کو نہ دیکھو اس کی تربیت کو نہ دیکھو اس کی قوتِ یقین کو دیکھو کہ کس کے پاس کتنا یقین ہے جس کے پاس جتنا یقین ہوگا اس کے پاس اتنا ہی خیر ہوگا اور یقین اس طاقت کا نام ہے جو شک کو برداشت نہیں کر سکتا ہے تو ہر خیر وہاں ہوگا جہاں یقین ہوگا اور خیر ہمیشہ خطرے میں رہے گا اگر یقین نہ ہوگا اور یقین نہ ہونے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ شک ہوگا تو جہاں جہاں شک نہیں ہے وہاں خیر یقینی ہے۔ واضح لفظوں میں کہا جائے کہ اگر زندگی بھر کے بعد آج آپ کو شک

پیدا ہو جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ کا خیر خطرے میں پڑ گیا اور اگر ساری زندگی شک ہی میں گذر جائے صرف چھوٹے بڑے کا فرق رہے کہ جیسا آج ہوا ہے ویسا کبھی نہیں ہوا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہاں خیر بہر حال یقینی نہیں ہے۔ اب آیئے یقین و شک کے دو مرحلے سن لیجئے۔ یہ دو لفظیں تاریخ میں آج تک گونج رہی ہیں۔ شک کی طرف سے آواز آتی ہے جیسا شک آج ہوا ہے ویسا کبھی نہیں ہوا تھا اور یقین کی طرف سے آواز آرہی ہے جیسی نیند آج آئی ہے ویسی کبھی نہیں آئی۔ صلوات۔

اسی لئے میں نے کل عرض کیا تھا کہ انسانی زندگی کے سب سے بڑے کمال کا نام ہے یقین:

اس کے بعد اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ یقین کس بات کا ہو۔ تو عزیزو سب سے بڑا اور سب سے پہلا یقین ہے ذات واجب کا یقین۔ کہ انسان کو اس کے وجود اور کمالات کا یقین ہو جائے اور دل میں اس کی عظمت کا احساس راسخ ہو جائے ورنہ اگر ذہنوں میں خدا ہے اور دلوں میں وجود خدا اور عظمتِ خدا کا احساس نہیں ہے تو انسان اہلِ یقین میں نہیں ہے۔ اہلِ یقین کی منزل اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے کہ جہاں وجود خدا کا ایسا اطمینان ہو کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی نہ ہو سوائے پروردگار کے۔

مالک نے اپنے بندوں کو کتنا شرف دیا تھا جس دن اعلان کیا تھا قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ مومن کا دل پروردگار کا عرش ہے۔ عرش الٰہی کے معنیٰ کیا ہیں۔ پروردگار عالم نے جس جگہ کو اپنی منزل بنا دیا ہے وہی عرش ہے۔

یعنی اگر اس کے عرش کی عظمتوں کو نہیں پہچاننا چاہتے ہو اور نہیں پہچان سکتے ہو تو اتنا پہچان لو کہ میں نے مومن کے دل کو اپنا عرش بنالیا ہے میں کہیں نہ ملوں گا۔ نہ منافق کے دل میں نہ کافر کے دل میں۔ نہ بے دین کے دل میں۔ اگر میں ملوں گا تو مومن کے دل میں۔ اگر تم اپنے دل کے اندر مجھے پالو تو سمجھو کہ مومن ہو اور اگر تمہارے دل میں میری جگہ نہیں ہے تو تم صاحبِ ایمان نہیں ہو۔ اس لئے کہ میں نے صاحبِ ایمان کے دل کو اپنا عرش بنایا ہے لہٰذا صاحب

ایمان وہی ہے جو توحید پروردگار کا اعتراف بھی رکھتا ہو اور توحید پروردگار کی طرف سے اطمینان بھی رکھتا ہو۔ منزل یقین پر فائز بھی ہو کہ دنیا کی کوئی شئی قابل یقین ہو یا نہ ہو مگر یقین کا سرچشمہ وہ ذاتِ اقدس ہے کہ جس سے کل کائنات کا وجود ہے۔ یہ توحید پروردگار جو اسلام کا پہلا پیغام ہے قولوا لا الٰہ اِلَّا اللہ تفلحوا۔ لا الٰہ الا اللہ کہو اسی میں فلاح ہے۔ اسی میں نجات ہے اسی میں کامیابی ہے اس کے علاوہ انسانی زندگی کی کامیابی کا کوئی راز نہیں ہے سوائے توحید پروردگار کے۔ اور اس توحید پروردگار کے چار حصے ہیں۔ ہمارا پہلا عقیدہ جہاں سے مذہب شروع ہوتا ہے توحید ہے کہ جب اصول دین بچوں کو یاد کرائے جاتے ہیں تو ان کو بھی یہی بتایا جاتا ہے کہ اول توحید یعنی اصل بنیاد توحید الٰہی ہے کہ اگر توحید نہیں ہے تو نہ رسالت ہے، نہ امامت ہے، نہ قیامت ہے، کوئی شئی شئی نہیں ہے۔ یہ سب اسی توحید کے شعبے ہیں۔ اسی کے نتائج ہیں۔ تو پہلا نظریہ توحید پروردگار کا ہے۔ توحید کے بارے میں چار طرح کے عقائد درکار ہیں جن کو ہمارے دلوں کے اندر رہنا چاہئے اس کے بغیر کوئی مسلمان مسلمان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ پہلا عقیدہ توحید ذات کا کہ پروردگار عالم کی ذات اقدس ایک اور ایسی اکیلی ذات ایسی یکتائی ایسی وحدانیت ایسی اکائی جہاں کسی طرح کے دو کا کوئی تصور بھی نہیں پایا جاتا ہے توحید کے بارے میں پہلا ایمان یہ ہے کہ ذاتِ پروردگار ایک ہے اس میں کسی طرح کے دو کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہمارے یہاں تو شاید ایک پیالی چائے کا نام بھی ایک ہی ہے کہ اگر کوئی آدمی آپ کے یہاں آیا اور آپ نے چائے پلا دی اور کسی نے کہا کہ ماشاءاللہ آج تو آپ کی بڑی خاطر ہوئی تو آپ کہیں گے کیا خاطر ہوئی؟ خالی چائے ہی تو پلائی ہے۔ حالانکہ یہ خالی چائے نہیں ہے۔ اس میں چائے ہے۔ پانی ہے، شکر ہے، دودھ ہے۔ چار چار نعمتیں لا کر رکھ دی ہیں اور آپ اس کو خالی ایک چائے کہہ رہے ہیں لیکن کیا کریں ہمارے یہاں اس کو بھی ایک ہی کہا جاتا ہے جو چار سے مل کر بنی ہے۔ کہ اگر کوئی کہہ دے کہ فلاں صاحب میرے یہاں آئے تھے میں نے چار چیزیں ان کو دی ہیں اور بعد میں تحقیق سے معلوم ہو کہ خالی ایک پیالی چائے پلا کے روانہ کر دیا ہے تو ہر آدمی یہ کہے گا کہ بڑے جھوٹے ہیں حالانکہ

بیچارہ بالکل سچا ہے۔ وہ ایک پیالی چائے جو لے کے آیا ہے اس کے اندر چائے کی پتی بھی شامل ہے۔ اس کے اندر دودھ بھی ہے اس کے اندر شکر بھی ہے اور اگر ذرا چائے کی ورائٹی کچھ اور بڑھ جائے تو کہیں لونگ بھی شامل ہے، الائچی بھی شامل ہے۔ کہیں بالائی بھی شامل ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دسترخوان ہے نعمتوں کا جس کا نام ہے چائے۔ تو ہمارے یہاں اس کو بھی ایک کہتے ہیں جس کا یہ حال ہو کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ خدا ایک ہے تو وہ بھی ایسا ہی ہوگا کہ دس بیس کو ملا کے تیار کیا گیا ہوگا۔ خبردار یہ نہ سوچنا۔ توحید ذات کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ذات ایسی اکیلی ہے جہاں کسی طرح کے دو کا تصور نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ ہے توحید صفت کا کہ سب کی صفتیں ان سے الگ ہیں اور آکے ملی ہیں کہ ہم آپ جاہل پیدا ہوئے ہیں علم آ کے مل گیا ہے۔ کمزور پیدا ہوئے ہیں طاقت آکر مل گئی ہے۔ خالی ہاتھ تھے۔ پیسہ آگیا غنی ہو گئے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے ساتھ ملتی چلی گئی ہیں۔ ورنہ ہماری ذات میں کیا تھا کچھ بھی نہیں تھا لیکن پروردگار کی ہر صفت اس کی ذات ہے ذات سے الگ نہیں ہے اس کا علم اپنا علم ہے اس کی طاقت اپنی طاقت ہے۔ اس کی حیات اپنی حیات ہے۔ اس کا کمال اپنا کمال ہے۔ یہ بھی انسان کو ماننا ہوگا کہ اس عقیدہ کے نہ ہونے کے بہت سے اثرات ہوتے ہیں جو میں گذارش کروں گا۔

تیسرا مرحلہ توحید عبادت کا ہے کہ پروردگار ہی وہ اکیلی ذات ہے جو عبادت کے قابل ہے اس کے علاوہ اور کوئی ہستی ایسی نہیں ہے۔ عبادت فقط خدا کے لئے ہے لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی ہے۔ اب خدا کے مقابلہ میں کتنے معبود کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو بھی لے لیا تو توحید چلی گئی جب سب کو ٹھکرائیں گے تب توحید مکمل ہوگی۔ توحید عبادت انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہیں سے فتنے بھی شروع ہوتے ہیں۔

توحید عبادت یعنی معبود فقط خدا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ کسی کو کچھ بنا دے گا تو کچھ ہو جائے گا ورنہ اس کے سامنے اور اس کے مقابلہ میں کسی کی کوئی

حیثیت نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ کوئی قابل اطاعت بھی نہیں ہو سکتا ہے جب تک خدا قابل اطاعت نہ بنادے۔ اگر خدا قابل تعظیم نہ بنائے تو کوئی قابل تعظیم بھی نہیں ہو سکتا ہے کوئی قابل مدح بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر خدا قابل مدح نہ بنادے تو جو کچھ انسان کے پاس ہے سب خدا ہی کا کرم ہے اور اسی کی مہربانی ہے۔

جب ایسا یقین پیدا ہو جائے گا تب توحید مکمل ہوگی ورنہ خدا بھی ہے اور صنم بھی ہے خدا بھی ہے اور کرسی بھی ہے۔ خدا بھی ہے اور دولت بھی ہے خدا بھی ہے اور اقتدار بھی ہے یہ شرک ہے توحید نہیں ہے کہ خدا کو سجدہ ہو رہا ہے مگر اقتدار کے سائے میں۔ خدا کو سجدہ ہو رہا ہے مگر دولت کے سائے میں، خدا کو سجدہ ہو رہا ہے مگر خواہشات کے سائے میں یہ سب شرک کی قسمیں ہیں اس کا توحید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر توحید والوں کو دیکھنا ہے تو کربلا میں آکر دیکھو نماز میں تو اُدھر بھی ہیں۔ سجدے تو اُدھر بھی ہیں۔ عبادت تو اُدھر بھی ہو رہی ہے۔ کلمہ تو اُدھر بھی پڑھا جا رہا ہے مگر دوہرے عقائد کے ساتھ کہ خدا کا بھی سجدہ ہے اور یزید کے حکم کا بھی۔ خدا کے سامنے بھی سر جھکا ہوا ہے اور اقتدار کے سامنے بھی مگر وہ بہتر جو حسینؑ نے منتخب کئے تھے وہ بارگاہِ خدا میں سجدہ کرنے والے تھے جن کی نگاہ میں نہ دولت سجدہ کے قابل تھی نہ حکومت، نہ جبر و سلطنت سجدہ کے قابل تھے نہ کوئی اور۔ بس تنہا ذات معبود ہے جو سر جھکانے کے قابل ہے، یہ توحید کے مرقع تھے جو کربلا کے میدان میں جمع ہو گئے تھے اور یہی ایمان مردوں میں تھا۔ یہی عورتوں میں بھی۔ یہی ایمان بچوں میں تھا۔ جوانوں میں بھی کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے اگر فکر ہے تو ایک پروردگار کی کہ وہ ہم سے راضی ہو جائے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ زندگی کی وہ نعمتیں جن کو کوئی نہیں چھوڑ سکتا ہے کربلا والوں نے سب کو ٹھکرا دیا۔ کون ہے جو خدا کی خاطر پانی سے بے نیاز ہو جائے۔ کون اللہ کا ماننے والا ہے جو پیاس میں پانی کو چھوڑ دے۔ صرف حکم خدا کے لئے کون ایسا ہے جو بھوک کے مقابلہ میں حکم خدا کے سامنے سر جھکا دے۔

کربلا نے یہ سارے مرقع جمع کر دئے۔ کھانے کو ٹھوکر ماردی خدا کے لئے۔ پانی کو

ٹھکرا دیا خدا کے لئے راحت و آلام کو ٹھکرا دیا خدا کے لئے اور اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ بس ایک خدا کے بندے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی ہمیں نبکا نہیں سکتا ہے۔

ساری تاریخ کربلا اگر میں آپ کے سامنے گذارش کروں تو ہفتے اور مہینے درکار ہوں گے مگر چونکہ انصار حسینؑ بن علیؑ کا ذکر کرنا ہے لہٰذا ایک منزل ایمان پر دو کرداروں کا تذکرہ کروں گا ایک سب سے پرانا کردار اور ایک سب سے نیا کردار تاکہ اندازہ ہو جائے کہ حسینؑ کی بارگاہ میں آنے کے بعد انسان اس منزل عقیدہ پر فائز ہو جاتا ہے جس کے لئے سن و سال درکار نہیں ہے مدت اور زمانہ درکار نہیں ہے۔ اس کا کردار بھی کربلا میں دیکھا جو بچپنے کا جانثار ہے اور اسے بھی دیکھا جو ابھی حسینؑ کی خدمت میں آیا ہے مگر منزل عقیدہ میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا ہے منزل ایثار میں کوئی تفرقہ نظر نہیں آتا ہے۔ ایک حسینؑ کے قدموں میں آنے کا اثر یہ ہوا کہ حرؑ کے ایمان میں وہ کمال پیدا ہو گیا جو کمال ایمان کل ہم نے حبیب میں دیکھا تھا۔ زہیر میں دیکھا تھا، مسلم اور بریر میں دیکھا تھا وہی منزل ایمان آج حر میں نظر آ رہی ہے۔ ایک عقیدہ کی خاطر اور ایک ایمان کی خاطر کتنی قربانیاں ہیں۔ چاہنے والا دسترخوان پر بیٹھا ہے کسی نے دروازہ پر آ کر دق الباب کیا، پوچھا کون؟ کہا انا برید الحسینؑ میں حسینؑ کا قاصد ہوں۔ حسینؑ کا نام آ جائے اور اس کے بعد کھانے والا دسترخوان پر بیٹھا رہے ناممکن ہے۔ اٹھے۔ دوڑ کے گئے خط لیا آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا لفافہ چاک کیا من الحسین بن علی الی الرجل الفقیہ یہ خط حسینؑ بن علیؑ کا ہے ایک مرد فقیہ کے نام۔ حبیب تم تو دین پہچانتے ہو تم تو مذہب جانتے ہو تم تو اسلام کی تعلیمات سے آشنا ہو۔ اے حبیب تم تو وہ قرابت بھی جانتے ہو جو میرے اور پیغمبرؐ کے درمیان ہے۔ تم وہ رشتہ بھی جانتے ہو جو میرے اور نبیؐ کے درمیان ہے۔ میں نبی کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ تم سب جانتے ہو صرف ایک بات نہیں جانتے تو میں بتا دوں کہ میں نرغۂ اعدا میں گھرتا جا رہا ہوں۔ حبیب میں مصیبتوں میں مبتلا ہوتا جا رہا ہوں اگر ممکن ہو تو آؤ میری مدد کو آؤ۔ حبیب نے خط کو پڑھا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دسترخوان پر کھانا نہیں کھا سکتے۔ زوجہ نے کہا حبیب کس کا خط ہے۔ کہا نبیؐ کے لال حسینؑ بن علیؑ کا خط

ہے. کہا کیا لکھا ہے؟ کہا حسینؑ نے لکھا ہے کہ میں نرغۂ اعداء میں گھرتا جا رہا ہوں۔ حبیب اگر ممکن ہو تو میری مدد کو آؤ۔ زوجہ نے کہا حبیب تو کیا ارادہ ہے؟ کہا تمہیں تو معلوم ہے. زمانہ پر آشوب ہے۔ دنیا کے حالات خراب ہو گئے ہیں. ایسے حالات میں کون کس کی مدد کے لئے جا سکتا ہے؟ ایسے حالات میں کون جذبۂ ایثار کا مظاہرہ کر سکتا ہے. یہ سننا تھا کہ مومنہ کو جلال آ گیا۔ حبیب بڑے افسوس کی بات ہے نبیؐ کا لال بلائے اور تم حالات کا حوالہ دے رہے ہو۔ نبیؐ کا لال آواز دے اور تم زمانے کا رنگ دیکھ رہے ہو. کہا مومنہ اگر میں تجھے چھوڑ کے چلا جاؤں تو تیرا کیا ہوگا؟ کہا میری کوئی فکر نہ کرو اگر تم نہیں جا سکتے ہو تو تم گھر میں بیٹھو میں جاؤں گی. منزل ایمان میں مرد و عورت کا کوئی فرق نہیں ہوا کرتا. یہ سننا تھا کہ حبیب نے کہا مومنہ! بھلا میرا مولا بلائے اور میں نہ جاؤں. زہراؑ کا لال آواز دے اور میں نہ جاؤں؟ یہ کیسے ممکن ہے میں چاہتا تھا کہ تیری منزل ایمان کا بھی اعلان ہو جائے. یہ کہکر حبیب اٹھے چلے. غلام کو بلایا. یہ رہوار ہے اسے لے کے جانا اور فلاں مقام پر میرا انتظار کرنا. زمانہ پُر آشوب ہے. ہر طرف سے راستے بند کر دئے گئے ہیں. میں کسی نہ کسی بہانے اس منزل تک پہونچ جاؤں گا (ارباب عزا) غلام گھوڑے کو لئے ہوئے اپنے آقا کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک مرتبہ غلام نے دیکھا کہ گھوڑے کے آنکھوں سے آنسو جاری ہیں. دل بے چین ہو گیا. آواز دی رہوار پریشانی کی کیا بات ہے اگر میرا آقا نہ آ سکا. اگر حبیب کسی وجہ سے نہ آ سکے تو میں تیری پشت پر سوار ہو کر جاؤں گا فرزند فاطمہؑ کی مدد کے لئے. بس اسی لمحہ حبیب پہونچ گئے یہ منظر دیکھا تو ایک مرتبہ بے قرار ہو کر آواز دی زہراؑ کے لال مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ پر یہ وقت آ گیا ہے کہ جانور آنسو بہا رہے ہیں اور غلام جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں. یہ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوئے کہا اے غلام تو نے بڑی خدمت کی ہے۔ جا میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کر دیا. ایک مرتبہ قدموں سے لپٹ گیا آقا یہ بھی خوب انصاف ہے کہ جب تک اپنی خدمت کا معاملہ تھا مجھے ساتھ رکھا اور جب فرزند رسولؐ کی خدمت کا وقت آیا تو مجھے الگ کرنا چاہتے ہیں. میں چلوں گا آپ کے ساتھ. کہا چلو. دونوں ساتھ چلے. ادھر حسینؑ نے آواز دی. میرے چاہنے والو. میرے بچپن کا جاں نثار آ رہا ہے.

۔ اب حبیب جو آئے تو اصحابِ حسینی میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اس لئے کہ اب تک جو آرہا تھا جب زینبؑ نے پوچھا فضہ کون آیا ہے؟ تو کہا کہ بی بی لشکر آرہے ہیں۔ فوجیں آرہی ہیں، رسالے آرہے ہیں۔ آپ کے بھائی کے قاتل آرہے ہیں۔ مولا کے جان کے دشمن آرہے ہیں لیکن اس مرتبہ دیکھا کہ اصحاب میں ایک ہلچل دکھائی دے رہی ہے۔ فرمایا خبر لے کر آؤ اب کون آیا ہے؟ اب جو فضہ پلٹ کے آئیں کہا بی بی مبارک ہو۔ مولا کا بچپنے کا جاں نثار، آقا کا بچپنے کا حبیب آیا ہے۔ بس جیسے ہی زینبؑ نے یہ فقرہ سنا فرمایا فضہ جلدی جاؤ جا کے حبیب سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حبیب تم نے بڑا کام کیا کہ ایسے وقت میں میرے ماں جائے کی مدد کے لئے آگئے۔ فضہ دوڑ کے آئیں کہا حبیب مبارک ہو۔ زہراؑ کی بیٹی نے تمہیں سلام کہلوایا ہے۔ روایت کہتی ہے کہ حبیب یہ سنکر خاک پر بیٹھ گئے منہ پر طمانچے مارنے لگے۔ اللہ! سیدانیوں پر یہ وقت آگیا ہے کہ نبیؐ کی اولادِ زہراؑ کی بیٹیاں سلام کہلا بھیجیں۔ اے عزیزو! یہ آلِ محمدؐ کے گھرانے کی قدر دانی ہے کہ اگر ایک حبیب آگیا تو زینبؑ نے سلام کہلوا دیا یہ بہن کا سلام تھا حبیبؑ کے نام جس کے ساتھ کوئی پیغام نہیں تھا مگر ایک سلام آپ کے نام بھی ہے جو تنہا سلام نہیں ہے بلکہ سلام کے ساتھ ایک پیغام بھی ہے کہ میرے لال جب قیدِ شام سے چھٹ کے مدینہ جانا تو میرے چاہنے والوں سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا چاہنے والو جب ٹھنڈا پانی پینا تو میری پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب مظلوم کا ذکر آئے تو مجھ پر آنسو بہانا ویسے جیسے میری ماں فاطمہؑ زہرا۔ واحسیناہ واحسیناہ۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ۔

□□

P-10

مجلس ۵

ذکر و غفلت

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔

نٓ اور قلم کی قسم اور تحریروں کی قسم یہ قلم گواہ ہے یہ تحریریں گواہ ہیں کہ میرے حبیب آپ اپنے پروردگار کی نعمتوں کی بنیاد پر مجنون نہیں ہیں۔ آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون کون ہے؟

فضائل اور رذائل کے عنوان سے جو سلسلہ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے پانچویں مرحلہ پر کچھ باتیں ذکر اور غفلت سے متعلق گذارش کرنا ہیں کہ انسانی کمالات میں ایک عظیم ترین کمال کا نام ہے تفکّر۔ سوچنا، فکر کرنا، سمجھنا اور ایک بد ترین کمزوری ہے غفلت، بے ہوشی بدحواسی، کسی بات کو نہ سمجھنا، کسی بات کی طرف متوجہ نہ ہونا۔ اس سلسلے میں کچھ باتیں گذارش کرنے سے پہلے تھوڑی دیر آپ کے ذہنوں پر بوجھ ڈالنا چاہتا ہوں تاکہ آپ ایسے علمی بار اٹھانے کے عادی ہیں تو مزید عادی ہو جائیں۔

میں نے روزِ اول عرض کیا تھا کہ انسان دو چیزوں سے ملا کر بنایا گیا ہے۔ ایک کا نام روح ہے اور ایک کا نام جسم اور بدن رکھا گیا ہے۔

ایک حصّہ ہے جو ہر ایک کی نگاہ کے سامنے آتا ہے اور ایک حصّہ ہے جو کسی کی نظر کے

سامنے نہیں آتا ہے ذکر اور غفلت کا کوئی تعلق انسان کے جسم سے نہیں ہے۔ نہ جسم کا کام ہے سوچنا، نہ جسم کا کام ہے غافل ہو جانا۔ یہ دونوں کام وہ ہیں جن کا تعلق انسان کے نفس اور اس کی روح سے ہے۔ یہی روح کبھی محو تفکر ہو جاتی ہے تو سوچنا شروع کر دیتی ہے اور کبھی حقائق سے غافل ہو جاتی ہے تو حقیقت نگاہ کے سامنے ہوتی ہے مگر دیکھنا نہیں چاہتی ہے۔

اسی کے اندر تفکر بھی ہے اور اسی کے اندر تغافل بھی ہے۔ یہی سوچنے والی بھی ہے اور یہی غافل ہو جانے والی بھی ہے۔ قرآن مجید میں اس کے بیس نام بیان کیے گئے ہیں۔

بدن کو سب جانتے ہیں سب دیکھ رہے ہیں لہٰذا جو چاہئے اس کا نام رکھ لیجئے۔ جسم کہئے بدن کہئے، باڈی کہئے کوئی اور چیز کہئے مگر وہ جس کو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ اگر بنانے والے نے اس کا تعارف نہ کرایا ہوتا تو ہمیں اس کا اندازہ بھی نہ ہوتا کہ پس پردہ کوئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جن کا ایمان پیدا کرنے والے پر نہیں ہے وہ انسان کے سارے وجود کو مادی سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں روح کوئی شئی نہیں ہے۔ روحانیت کوئی چیز نہیں ہے ان کی ساری دنیا اسی مادیت پر گذارا کر رہی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ بیچارے مجبور ہیں یہ سوچنے پر کہ اگر انسان اسی مادی جسم کا نام ہے تو انسان کی کل قیمت اتنی ہی ہونی چاہئے جتنی اس کے گوشت، ہڈی، خون، پوست اور اجزاء بدن کی ہوتی ہے جبکہ دنیا جانتی ہے کہ کسی سماج نے، کسی معاشرے نے، کسی قانون نے انسان کی قیمت اس بدن کی قیمت کے اعتبار سے نہیں لگائی ہو بلکہ انسان کی قیمت اس سے کچھ زیادہ ہے تو اگر یہ کوئی قیمتی مخلوق ہے تو اسکی قیمت کو بڑھایا کس نے ہے؟ انسان کی اس اہمیت اور عظمت کو کس نے بڑھا دیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا ہے اور کسی نے نہیں پہچانا ہے۔ صرف بنانے والا ہے جس نے اس کو پیدا کیا اور وہ جانتا ہے کہ اسکی قدر و قیمت کیا ہے اور اس نے پہچنوایا ہے کہ تمہارے اندر جسم کے علاوہ جو طاقت ہم نے رکھی ہے وہ طاقت اپنے خیر و شر کے اعتبار سے اپنی اچھائی اور برائی کے اعتبار سے دس نام رکھتی ہے۔

دس نام اچھائیوں کے اعتبار سے ہیں اور دس ہی نام برائیوں کے اعتبار سے ہیں یعنی ایک انسانی

طاقت ہے جس کو قرآن مجید نے بیس طرح کے نام دیے ہیں۔

میں سارے نام آپ کے سامنے گذارش نہیں کروں گا۔ صرف ایک بات عرض کرنا ہے جس کے لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں کہ یہی نفس، یہی روح، یہی طاقت جو انسان کے اندر ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید اسی طاقت کو خالی نفس کہتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (سورۂ والشمس) اس سورہ میں پروردگار عالم نے مختلف چیزوں کی قسم کھائی ہے اور جن چیزوں کی قسم کھائی ہے ان میں سے ایک نفس بشر بھی ہے قسم ہے اس نفس کی اور اس کے بنانے والے کی۔

یہ نفس کیا ہے؟ یہ بدن نہیں ہے جسم نہیں ہے۔ جسم کے علاوہ ایک اور طاقت ہے جس کا نام رکھا گیا ہے نفس۔ بنانے والے نے بنایا تو ایسا بنایا کہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا اسے سب کچھ سمجھا دیا۔ فسق و فجور کیا ہے؟ تقویٰ اور پرہیز گاری کیا ہے؟ پروردگار نے نفس کو جاہل نہیں بنایا۔ نفس کو بے خبر نہیں بنایا بلکہ جب بھیجا تو اللہ نے یہ ساری باتیں دے کر بھیجا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب بنایا تھا تو اس کا نام تھا نفس اور جب اسے نیکی برائی کا الہام کر دیا تو اس کا نام ہو گیا نفس مُلہَم، یعنی وہ نفس جس کو اچھائی برائی کا الہام کیا گیا ہے۔ اچھائی برائی سمجھا دی گئی ہے۔ اس کے بعد یہی نفس جب برائیوں پر ٹوکنے لگتا ہے تو اسی کا نام ہو جاتا ہے نفسِ لوّامہ۔ ملامت کرنے والا نفس۔ اور یہی نفس جب ان منزلوں پر آجاتا ہے جس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے تو اس کا نام ہو جاتا ہے "نفسِ مطمئنہ"۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ نفس جب تک نفس رہتا ہے جنت کی آرزو میں رہتا ہے۔ جب تک لوامہ رہتا ہے جنت کی فکر میں رہتا ہے۔ جب تک الہام کی منزل میں رہتا ہے عاقبت کی فکر میں رہتا ہے۔ مگر جب نفس مطمئنہ کی منزل میں آجاتا ہے تو وہ جنت کی تلاش میں نہیں رہتا ہو اس کیلئے آواز آتی ہے پلٹ آ۔ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ صلوٰۃ۔

تو آرزوئے جنت، تلاش جنت، جستجوئے جنت یہ نفس کے ابتدائی مرحلوں کا کام ہے اور جہاں جنت آرزو رکھتی ہو، جنت مشتاق ہو، جنت تڑپ رہی ہو کہ ان کے قدم یہاں آجائیں وہ "نفسِ مطمئنہ" کی منزل ہے۔

ہم نے اس منزل میں ایک ہی شخصیت کو دیکھا ہے اور وہ ہیں حسینؑ بن علیؑ. اگرچہ بہت سے افراد ہیں جو اس گھرانے کے طفیل میں اس منزل پر فائز ہو گئے ہیں اور اسی لیے حدیث مبارک میں وارد ہوا ہے جسے سارے عالم اسلام نے نقل کیا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا کہ اِنَّ الْجَنَّةَ تَشْتَاقُ اِلٰی اَرْبَعَةٍ چار افراد ایسے بھی ہیں کہ جن کے اشتیاق میں جنّت تڑپ رہی ہے۔

یعنی باقی وہ ہیں جو جنّت کے اشتیاق میں تڑپ رہے ہیں اور چار ایسے ہیں جن کے اشتیاق میں جنّت بے چین ہے کہ کب ان کے قدم یہاں آجائیں۔

آگے حضورؐ یہیں پر چپ ہو جاتے تو سننے والوں کی بن آتی لہٰذا سرکارؐ نے چاہا کہ بتا دیں کہ وہ افراد کون ہیں جن کے اشتیاق میں جنّت تڑپ رہی ہے۔

فرمایا سلمان، ابوذر، مقداد اور چوتھا ان سب کا رئیس جو سارے عالم اسلام کا سردار ہے ہو سکتا ہے کہ کسی آدمی کو اعتبار نہ ہوتا کہ شاید یہ روایت بنائی گئی ہو اور یہاں بھی لکھ دی گئی ہو اور وہاں بھی لکھوا دی گئی ہو تو ضرورت تھی کہ سرکار دو عالمؐ اپنی حیات میں تجربہ کرا دیتے کہ جو جنّت کے مشتاق ہوتے ہیں وہ کیسے ہوتے ہیں اور جن کی جنّت مشتاق ہوتی ہے وہ کیسے ہوتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں پہلا نام حضورؐ نے سلمان کا لیا تھا تو چاہا کہ ایک کو پہچان لیا جائے تو باقی کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا چنانچہ آپؐ نے ایک دن کہہ دیا کہ جو فتح کی خبر لائے گا میں اس کی جنّت کا ضامن ہوں۔ جو آج میدانِ خندق میں علیؑ کی فتح کی خبر لائے گا میں اسکی جنت کا ذمہ دار ہوں گا۔ اب جتنے مشتاق جنّت تھے دوڑ پڑے۔ کیسے جنگ ختم ہو اور جا کے خبر لے آئیں۔ اگر لڑے نہیں تو خبر دینے میں کیا تکلیف ہے؟ تلوار نہیں چلائی تو بشارت دینے میں کیا زحمت ہے۔ اگر ہاتھ نہیں چل سکے تو پیروں کے چلنے میں کیا تکلیف ہے۔ حضورؐ کو بشارت دیں اور جنت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ سب چلے گئے جنگ کا نقشہ دیکھنے کے لیے صرف ایک اکیلے سلمان تھے جو پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر تھے وہیں سرکار دو عالمؐ اور وہیں سلمان۔ جیسے ہی سلمان نے لوگوں کی دوڑ کو دیکھا۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کے آنے کا مطلب کیا ہے چنانچہ دوڑتے ہوئے مجمع کو دیکھ کر سلمان نے کہا حضورؐ بھائی کی فتح مبارک ہو اور اس کے بعد جس نے بھی یہ خبر سنائی حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی نئی خبر سناؤ یہ تو سلمان پہلے ہی بتا چکے

ہیں۔

اب اور کوئی خبر کیا ہو سکتی ہے جو آتا ہے وہ یہی دوڑ دوڑ کر سناتا ہے کہ حضور بھائی کی فتح مبارک ہو اور آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو سلمان پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ عزیزو! یہ نقطہ تاریخ کا منظر نہیں ہے۔ یہ سرکار دو عالمؐ کے بیان کی تصدیق ہے۔ اب اگر کوئی سلمان سے پوچھتا کہ سب جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں علیؑ کی فتح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟ کیا تمہیں میدانِ خندق کے نقشے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جاؤ جا کے دیکھو کیا ہو رہا ہے؟ کہا میں کیوں جاؤں جنّت کے لیے؟ جب مالکِ جنّت کے قدموں میں کھڑا ہوں تو جنّت تو خود ہی مجھے ملے گی اس کے لیے دوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہاں افراد کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا پیغمبرؐ کے بیان کا اعلان ہے کہ کچھ وہ ہیں جو جنت کے اشتیاق میں تڑپ رہے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کی مشتاق جنّت ہے۔ جو جنّت کے لیے بے چین ہیں وہ جا رہے ہیں اور جن کے اشتیاق میں جنّت ہے وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ہے۔ صلوات۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ جسے نفس کہتے ہیں اسی کا دوسرا نام قلب ہے۔ اگرچہ عربی زبان میں قلب دل کو کہتے ہیں اور دل کا مطلب بدن کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے لیکن قرآن جسے قلب کہتا ہے وہ یہ نہیں ہے۔ اسی لیے پروردگار عالم نے کہا کہ یہ میرے حقائق، یہ دین کے مطالب، یہ میرے بیانات لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ ان کے لیے ہیں جن کے پاس دل ہوگا۔ تو کیا کافروں کے پاس یہ ٹکڑا نہیں ہے۔ یقیناً ہے اور شاید کچھ زیادہ ہی ٹھیک ٹھاک ہو۔

تو اللہ نے جس کو قلب کہا ہے وہ بدن کا ٹکڑا نہیں ہے یہ وہی روح ہے جس کو ہم کبھی روح کہتے ہیں اور کبھی قلب۔ تو جس کے پاس قلب ہوگا وہ حقائق کو سمجھے گا اور جس کے پاس دل ہی نہ ہوگا وہ کیا پہچانے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی آدمی ذرا سختی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس پر کسی دردناک خبر کا اثر نہیں ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ دل ہوتا تو اثر ہوتا تو کیا ان کا دل کہیں اڑ گیا ہے۔ نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس دل سے مراد کبھی یہ ٹکڑا ہوتا ہے جو سینے کے اندر ہے اور کبھی اس سے مراد کوئی اور دنیا ہوتی ہے جس دنیا کو ہم پہچانتے نہیں ہیں مگر یہ جانتے ہیں کہ کچھ ہے ضرور۔ قرآن مجید نے اسی کا ایک نام رکھا ہے قلب اور اسی کا ایک نام ہے

روح. وہی ایک طاقت ہے جو سارے بدن کو چلا رہی ہے. عقل بھی کوئی الگ چیز نہیں ہے. اسی کا ایک نام عقل بھی ہے بلکہ اسی کا ایک نام سینہ بھی ہے اگرچہ ہمارا دل سینے کے اندر ہوتا ہے مگر قرآن مجید اسے سینہ بھی کہتا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ پناہ مانگو شر شیطان سے یہ شیطان کمبخت لوگوں کے سینوں میں وسوسہ پیدا کرتا ہے تو اگر سینہ اسی کا نام ہے تو اگر کوئی وسوسہ پیدا کرتا ہے یا شبہ پیدا ہوتا ہے تو یا دل میں ہوگا یا دماغ میں ہوگا. سینہ میں کیا ہوگا. سینہ تو ہڈی اور چمڑہ کا نام ہے مگر قرآن مجید جب صدر کہتا ہے تو صدر سے مراد ہڈیاں نہیں ہوتی ہیں. چمڑا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد بھی وہی روح ہوتی ہے.

گویا سارے نام اسی ایک طاقت کے ہیں جو ایک انسان کے بدن کو چلا رہی ہے مگر یہ سارے ٹائٹل کب ملتے ہیں جب اچھا کام کرے اور صحیح فکر کے راستے پر چلے. ورنہ کہیں اگر سوچ غلط ہوگئی تو اس کے مقابلے میں دس نام اور آتے ہیں. اسی کا نام نفس شیطانی ہوتا ہے کہ نیکیوں کو چھوڑ کر برائیوں کے راستے پر چلاتا ہے اور برائی ہی کو اچھا بنا کے پیش کرنے لگتا ہے وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا پیغمبرؐ آپ ان سے کہہ دیں هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر سنائیں جو اپنے اعمال میں بہت گھاٹے میں ہیں. یہ بے عمل نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی و کوشش زندگانی دنیا میں بہک گئی ہے اور جس راہ پر ہونی چاہئے تھی اس سے دوسری راہ پر چلی گئی ہے نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کہ یہ زندگی بھر یہی سمجھتے رہے کہ اچھا کام کر رہے ہیں اور جب میدانِ حشر میں گئے تو معلوم ہوا کہ ساری محنت برباد ہو چکی ہے. پروردگار جن کی سعی و کوشش غلط راستے پر لگ جاتی ہے ان کی تو مذمت کر دیتا ہے تو جن کی سعی صحیح راستے پر لگی رہے ان کی تعریف بھی تو ہونی چاہئے ایسا نہ ہو کہ نیک بندوں کے دل ٹوٹ جائیں کہ برائیوں پر تو قرآن تنقید کرتا ہے لیکن اچھائیوں کی تعریف نہیں کرتا ہے. آواز آئی ہمارے بیان میں ہمیشہ اعتدال رہتا ہے جب کوئی بہک جائے گا تو کہوں گا ضَلَّ سَعْيُهُمْ ان کی سعی بہک گئی، ان کی سعی برباد ہوگئی اور جب صحیح راستے پر چلے گا تو کہوں گا.

كَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُوْرًا تمہاری سعی تو شکریہ ادا کرنے کے قابل ہے۔ صلوات۔

تو ایک وہ نفس ہے جو نفس شیطانی ہے گمراہ کرنے والا۔ برائی کو اچھا بنا کے پیش کرنے والا۔ اور ایک نفس ہے جو مکاری کرنے والا ہے مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ یہ لوگ مکاری کرتے ہیں تو خدا کو بھی جواب دینا آتا ہے۔ یہ لاکھ تدبیریں کریں۔ یہ لاکھ مکاری کریں خدا کو ان کے مکر کو توڑنا آتا ہے۔

تیسرا نفس ہے جس کا کام ہے فقط فسق و فجور جو آدمی کو ہر وقت برائی پر آمادہ کرتا رہتا ہے کہ کیسے آدمی کو غلط راستے پر لگا دے اور برائی کو اتنا حسین بنا کر پیش کر دے کہ آدمی کے قدم آگے بڑھ جائیں۔

اس کے بعد ایک منزل وہ بھی آتی ہے جہاں نفس ملاوٹ کا کام شروع کر دیتا ہے۔ ایک پاؤ دودھ میں تین پاؤ پانی ملا دیا۔ یہ کاروبار بھی نفس ہی کرتا ہے۔ کاروباری آدمی نہیں کرتا ہے آدمی تو بہت سے بہت تین پاؤ میں ایک پاؤ ملائے گا لیکن جب نفس بہکانے پر آ جاتا ہے تو ایک پاؤ دودھ میں تین پاؤ پانی ملا دیتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کیا اچھا لگ رہا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

اور آخری عیب کی منزل وہ آتی ہے جہاں خدا آواز دیتا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اب ان پر کسی اصلاح کا اثر نہیں ہوگا۔ اب ان پر کسی تبلیغ کا اثر نہیں ہوگا۔ یہ نفس کے عیب کی آخری منزل ہے کہ جہاں مہر لگ گئی کہ اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں ہے تو نفس کے دس درجات ہیں خوبیوں کے اور دس درجات ہیں برائیوں کے اور سب کے مرکزی نقطہ کا نام ہے فکر۔ فکر صحیح راستے پر چلی جائے تو نفس تمام مدارج کو طے کر کے نفس مطمئنہ تک پہنچ جائے اور نفس برائیوں میں چلا جائے تو اتنا گمراہ ہو جائے کہ خدا کہے کہ ہم نے مہر لگا دی ہے اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اب ساری زندگیاں انھیں دونوں کے درمیان گذر رہی ہیں۔ سب سے اعلا نفس ہے نفس مطمئنہ اور سب سے پست ترین نفس کا نام ہے نفس مطبوع، مختوم جس پر مہر لگا دی جائے۔ اب اسی درمیانی کاروبار کے بارے میں چند باتیں گذارش کرنا ہیں جن کا بنیادی مسئلہ ہے تفکر۔ اسلام نے انسان کو دعوت فکر دی۔ پروردگار نے فرمایا کہ پیغمبرؐ آپ ان سے یہ کہدیں کہ میں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے اٹھو اکیلے اٹھو۔ دو دو کر کے اٹھو

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا اس کے بعد فکر کرو کہ فکر کے بغیر کوئی کام چلنے والا نہیں ہے۔ کوئی راستہ طے ہونے والا نہیں ہے سب سے بڑا کام انسان کا ہے تفکر۔

ایک شخص معصوم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ حضور یہ بتائیں کہ تفکر کیا ہے؟ جسے اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ۔ ایک سال کی بندگی اور ایک ساعت کی فکر، ایک ساعت سوچنا ایک سال عبادت کرنے سے بہتر ہے اور بعض روایات میں میں نے دیکھا ہے کہ تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ قِيَامِ لَيْلَةٍ ساری رات مصلے پر کھڑے رہنے سے بہتر ہے ایک ساعت کی فکر تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ سارے مسلمان مصلے چھوڑ دیں۔ لیٹ کے سوچنا شروع کر دیں کیا یہی فکر ہے جس کو اسلام نے ایک سال کی عبادت سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ رات بھر مصلے پر کھڑے رہنے سے بہتر قرار دیا ہے۔ عجیب نعرہ ارشاد فرمایا کہ کم سے کم ایک انسان میں اتنی فکر ہونی چاہیئے کہ کچھ نہ سوچ سکے خدا کے بارے میں سوچنے سے عاجز ہو۔ آسمان کے بارے میں نہیں سوچ سکتا، عاقبت کے بارے میں نہیں سوچ سکتا، پیغمبر کی عظمت کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تو کم از کم اتنی فکر تو کرے کہ قبرستان میں جا کے کھڑا ہو جائے اور دو سوال کرے۔ لے قبرستان أَيْنَ سَاكِنُوكَ تیرے بسنے والے کہاں رہتے ہیں؟ قبرستان کی آبادی شہر کی آبادی سے کم نہیں ہوتی، علاقے کی آبادی سے کم نہیں ہوتی مگر علاقے میں دس آدمی بستے ہیں تو سب دکھائی دیتے ہیں وہاں ہزار بستے ہیں تو کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ کہاں ہیں تیرے رہنے والے اور کہاں ہیں تیرے بسنے والے۔ یہ ساری عمارتیں پڑی ہوئی ہیں نہ رہنے والے ہیں نہ بنانے والے ہیں اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بسا کون ہے۔ اور اس کے بعد ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا کہ پہلے یہ سوال کرے کہ رہنے والے کہاں ہیں؟ یہ پوچھے کہ بنانے والے کہاں ہیں؟ اور پھر کم سے کم اتنا ہی کہے کہ آخر جواب کیوں نہیں دیتے ہو؟

یعنی ایک لمحہ کے لیے قبرستان میں کھڑے ہو گئے تو تین سوالات پیش کر دیئے۔ یہاں کے رہنے والے کہاں ہیں؟ اس کے بنانے والے کہاں ہیں اور تم جواب کیوں نہیں دیتے ہو۔ اس کے بعد یہ اندازہ ہو جائے گا کہ چاہے محلوں میں رہو یا گھروں میں۔ ایک دن ایسا ہی

ہونا ہے۔ جتنا چاہے اس زندگی میں بولتے رہو ہزار کے مجمع میں، لاکھ کے مجمع میں، کروڑوں کے مجمع میں۔ ایک دن وہ آئے گا کہ پوچھنے والا پوچھے گا اور جواب دینے کے لائق نہ رہ جاؤ گے۔

اتنا خیال اگر پیدا ہو جائے کہ نہ عمارتیں کام آئیں گی نہ بلڈنگ کام آئے گی، نہ دنیا کی باتیں کام آئیں گی۔ نہ دنیا کے کچھ کام آئیں گے تو انسان کے کردار میں خود بخود انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ سارا عیب اسی لیے ہے کہ انسان نے زندگی کے بارے بہت کچھ سوچا ہے موت کے بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحتیں کرتے ہوئے کہا تھا فرزند! ہر چیز کو بھول جانا مگر دو باتوں کو نہ بھولنا اللہ اور موت۔ خدا کو نہ بھولنا اور موت کو نہ بھولنا۔

خدا کو نہ بھولنا کہ وہیں سے سفر شروع ہوا ہے اور موت کو نہ بھولنا کہ وہیں سلسلۂ سفر تمام ہونے والا ہے۔ اپنا آغاز اور انجام ضرور نگاہ میں رکھنا کہ اگر اس سے غافل ہو گئے تو بندگی نہ کرو گے اور ظلم کے علاوہ کردار میں کچھ نہ رہ جائے گا۔ جن کی نگاہ میں موت نہیں رہ جاتی ہے ان کی نگاہ میں سوائے عیش کے کچھ نہیں رہ جاتا ہے اور جنھیں موت یاد رہتی ہے وہی جادۂ اعتدال پر چلا کرتے ہیں۔

یہ نفس انسانی جس کا کام ہے فکر کرنا۔ کم سے کم اتنی فکر تو کرے کہ اپنے آغاز کے بارے میں سوچے اور اپنے انجام کے بارے میں غور کرے۔ یہی فکر اگر پیدا ہو جائے تو ایک ساعت کی فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ایک ساعت کی فکر پوری رات مصلّے پر کھڑے رہنے۔ سے بہتر ہے یعنی اگر انسان میں فکر خدا پیدا ہو جائے تو دو رکعت نماز اس کے لیے بہت ہے۔ ایک سجدہ اس کے لیے بڑا قیمتی ہے لیکن اگر انسان ان ساری حقیقتوں سے بے خبر ہو جائے تو رات بھر پڑھتا رہے۔ مصلّے پر کھڑا رہے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

ابلیس جب بارگاہ خداوندی سے نکالا گیا تو کہا کہ میرے سجدوں کی قیمت کہاں ہے۔ میری اتنی عبادتوں کی قیمت کہاں ہے؟ گویا عبادت نہیں کر رہا تھا مزدوری کر رہا تھا۔

یہ ہے فکر کی کمزوری کہ اجرت مانگ رہا ہے۔ اجرت کس چیز کی ہے۔ بندگی کی تو اجرت نہیں ہوتی ہے۔ بندگی تو فریضہ ہے، بندگی تو ڈیوٹی ہے۔ بندگی اپنا کام ہے۔ اجرت مانگ رہا ہے تو اس کے

معنیٰ یہ ہیں کہ اتنے دن جو سجدے کیے ہیں وہ مزدوری کر رہا تھا بندگی نہیں کر رہا تھا۔

یہی فکر کی کمزوری تھی۔ ورنہ جو فکر والے ہوتے ہیں جن کی فکر صحیح راستے پر چلتی ہے وہ ساری زندگی عبادت کرتے رہیں تو بھی پروردگار سے یہ نہیں کہیں گے کہ اجرت چاہئے بلکہ ان کا دل آواز دے گا کہ خدایا تیرا حکم تھا تو نے مصلیٰ پر کہہ دیا تو وہاں آ کے کھڑا ہو گیا اور بستر پر کہہ دے گا تو وہاں جا کے سو جاؤں گا۔ میں اپنے فرض بندگی کو ادا کروں گا۔ وہ محراب میں بھی ہو سکتا ہے تہہ خنجر بھی ہو سکتا ہے۔

تو شیطان نے کہا مجھے اتنے دنوں کی اجرت چاہئے؟ فکر کی کمزوری نے بندگی کو مزدوری بنا دیا اور خدا نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ اگر تو مزدوری چاہتا ہے تو میں مزدوری دوں گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی میرا کام کرے اور میں اسے اجرت نہ دوں۔ میں اجرت دینے کے لیے تیار ہوں بتا کیا مانگتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ شیطان کے سامنے مسئلہ آ گیا کہ کس سے کم کیا مانگے۔ تو اب فکر کی دوسری کمزوری سامنے آئی کہا کہ قیامت تک کی زندگی چاہئے لوگوں کو بہکانے کے لیے۔ ہائے ظالم جب مانگنے کا وقت آ گیا تھا اور خدا نے کہہ دیا تھا کہ مانگ کیا مانگتا ہے تو کہہ دیتا پوری جنت پر قبضہ چاہئے۔ اگر تجھے مزدوری دینا ہے تو پوری جنت پر مجھے قبضہ چاہئے تاکہ سودا کرنے میں کوئی ایک حصہ ہی مل جائے اس لیے کہ اس نے جب کہا کہ قیامت تک کی حیات تو خدا نے کہا کہ نہیں اتنی نہیں ایک وقت معلوم تک کے لیے۔ یعنی سودا طے ہو گیا۔ زیادہ مانگا تھوڑا ملا۔ مگر ملا تو۔ تو اگر کہہ دیتا کہ مجھے پوری جنت چاہئے تو پروردگار کہتا کہ پوری جنت تو نہیں۔ آدھی، تہائی، چوتھائی مل سکتی ہے۔ کہیں رہنے کی جگہ تو مل سکتی تھی۔ جنت تو حاصل ہو جاتی مگر یہ بات تو اس وقت ہوتی جب فکر صحیح راستے پر ہوتی۔ جب فکر ہی صحیح نہیں ہے تو سجدے کیا کریں گے۔ بندگی کیا کرے گی، عبادت کیا کرے گی فکر صحیح نہیں تھی تو پہلی خرابی یہ ہوئی کہ بندگی کو مزدوری بنا دیا اور پھر جب مزدوری مانگنے کا وقت آیا تو کم بخت بجائے آخرت کے دنیا مانگنے لگا۔ اب آپ نے فکر شیطانی کو پہچان لیا کہ جب فکر بہک جاتی ہے تو نہ عبادت کام آتی ہے نہ سجدے۔ عاقبت بھول جاتی ہے اور دنیا یاد رہ جاتی ہے۔ مجھے جنت نہیں چاہئے۔ مجھے یہاں کی زندگی چاہئے۔ ایک مرتبہ یہ آواز آسمان پر سنی تھی اور ایک مرتبہ یہ آواز اسی زمین پر دو، آئی گئی کہ مجھے جنت نہیں چاہئے وہ ادھار ہے۔ مجھے تو ملک رے

چاہئے جو نقد ہے۔ اب اندازہ ہوا کہ شیطانی فکر وہاں سے پہنچ کر یہاں تک آگئی ہو۔ یہ فکر جنات میں چلی جائے تو ابلیس بن جائے اور انسانوں میں آجائے تو ابن سعد پیدا ہوجائے۔ صلوات۔

اتنے دنوں کی عبادتیں، تلاوتیں، صدقات، خیرات، کارِ خیر، سجدے، رکوع، قیام قعود، ان سب باتوں کا فائدہ کیا ہوا جب فکر ہی بہک گئی جب فکر ہی صحیح راستے پر نہ رہی نتیجہ کیا ہوا کہ جب وقت تھا جنت کمانے کا اور کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ صرف قتل حسینؑ کے لیے نہ جائے اور جنت قدموں میں ہے لیکن بدبخت نے کہا کہ مجھے جنت نہیں چاہئے۔ ادھار سودا ہے۔ مجھے ملک رے چاہئے جو نقد ہے یعنی ظالم نے جنت کو ٹھکرا دیا۔ دنیا کے اقتدار کے لیے۔ پھر ابن سعد کے الفاظ کو پہچانئے۔ مجھے جنت نہیں چاہئے۔ مجھے ریاست چاہئے۔ مجھے حکومت چاہئے، مجھے اقتدار چاہئے۔

اے خدا ہم نے کربلا میں ایک بہکی ہوئی فکر کو تو دیکھ لیا کہ اسے جنت نہیں چاہئے اقتدار چاہئے اب کوئی ایسا منظر بھی دکھلا دے جہاں صحیح فکر والا آواز دے مجھے لشکر یزید کی سرداری نہیں چاہئے مجھے سردار جوانانِ جنت کی خدمت چاہئے

کربلا انہیں دونوں فکروں کا مرقع ہے۔ کربلا میں دونوں فکریں اکٹھا ہوگئیں جس سے یہ اندازہ ہوا کہ فکر بہکتی بھی ہے اور راستے پر بھی آتی ہے۔ اونچی بھی ہوتی ہے اور پست بھی ہوتی ہے۔ فکر بلند ہوتی ہے تو انسان حرؑ بن جاتا ہے اور فکر پست ہوجاتی ہے تو پھر ابن سعد بن جاتا ہے۔ کربلا قیامت تک یہ ایک اعلان عام ہے کہ جس کا دل چاہے فکر کو بلند کرلے اور حرؑ کی منزل پر آجائے صلوات۔

قرآن مجید نے فکرِ صحیح کی ترجمانی اس انداز سے کی ہے کہ۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یہ زمین و آسمان کی تخلیق، یہ دن و رات کا آنا جانا اس میں اللہ کی نشانیاں ہیں ان صاحبانِ عقل کے لیے اولی الالباب۔ یہ لُب بھی اسی روح کا نام ہے۔ بہترین عقل کا نام ہے جو خدا کو یاد کرتے ہیں۔ کھڑے ہوتے ہیں تو یاد کرتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں تو یاد کرتے ہیں حد یہ ہے کہ بستر پر لیٹ جاتے ہیں تو یاد خدا میں محو رہتے ہیں۔

وَيَتَفَكَّرُونَ اور فکر کرتے ہیں تخلیق ارض و سما میں اور پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً پروردگار تو نے اس کائنات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے سُبْحَانَكَ تو بے نیاز ہے فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہم کو عذابِ جہنم سے بچائے رکھنا۔

اسلام کا سارا زور فکر پر ہے۔ اب اگر آپ نے اہمیت فکر کو پہچان لیا ہو تو خاتمۂ کلام میں چند جملے اور یاد رکھئے گا کہ فکر کرنے کی مخالفت ہمیشہ وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں اپنی کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے اور فکر کرنے کی دعوت ہمیشہ وہ دیتے ہیں جن کو اپنی بات پر اعتماد ہوتا ہے۔ ہم ساری دنیا کو دعوتِ فکر کیوں دیتے ہیں؟ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر انسان فکر کرے گا تو کبھی نہ کبھی راہِ حق پر آجائے گا لیکن دوسرے جو لوگ کہتے ہیں کہ کچھ سوچو نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں وہی سنو۔ کچھ سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ جو ہوتا چلا آرہا ہے وہی ٹھیک ہے۔ تحقیق نہ کرو جو ہم کہتے جائیں وہی مانتے جاؤ۔ جو ہوتا چلا آرہا ہو وہی کرتے چلے جاؤ۔ تو جہاں کمزوری کا احساس ہوتا ہے وہاں فکر پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں اور جہاں بات کی حقانیت کا اعتبار ہوتا ہے وہاں فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔

یاد رکھئے گا کہ قرآن مجید میں جن آیتوں میں احکام بیان ہوئے ہیں ان کی تعداد ۵۱۳ ہے انشاء اللہ اگر میری کتاب آپ کی دعا سے جلد ہی منظر عام پر آگئی تو آپ پڑھیں گے کہ میں نے ساری آیتوں کو جمع کر دیا ہے جہاں احکام کا ذکر کیا گیا ہے اور ان ساری آیتوں کو بھی جمع کر دیا ہے جہاں اہلبیت علیہم السّلام کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ قرآن کا مطالعہ کرنے والے پہچان لیں کہ اعمال کیا ہیں اور صاحبان اعمال کون ہیں۔ احکام کیا ہیں اور عمل کرنے والے کون ہیں؟ احکام کیسے ہوتے ہیں اور عمل کرنے والے کیسے ہوتے ہیں۔ تو ساری شریعت ۵۱۳ آیتوں میں ہے اور سات سو سے زیادہ آیتیں خالی فکر کے لیے ہیں۔ فکر کرو۔ غور کرو، سوچو، پڑھو لکھو، حد یہ ہے کہ پہلی وحی جب آئی تو سامیں یہ کہہ دیا گیا۔ اِقْرَاْ پڑھو۔ یہ پیغمبرؐ سے تو صرف خطاب کیا گیا ہے ورنہ پہلے ہی دن اسلام نے اپنا مزاج بتا دیا ہے کہ یہاں پڑھنے والوں کا کام ہے جاہلوں کا کام نہیں ہے۔ اگر سوچنے کی عادت نہ پڑے گی تو شریعت کا کیا ہوگا۔ اور اگر قوم غور و فکر سے محروم ہوگئی تو شریعت میں صرف رسموں کا نام رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جن کے پاس فکر نہیں ہے خالی اعمال ہیں۔ ان کے

اعمال بھی رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ ایک طواف کیا دو طواف کیے۔ تین طواف کئے، سات طواف کئے۔ سال بھر طواف کیا زندگی بھر طواف کئے۔ ہزار چکر کعبہ کے لگائے نہ کعبہ کو پہچانا نہ مولود کعبہ کو پہچانا اور اس شان سے طواف کیا کہ رکن عراقی دکھائی دیا، رکن یمانی نظر آیا، رکن شامی دکھائی دیا مگر وہ جگہ نہ دکھائی دی جہاں مالک نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا تھا اور پروردگار نے دیوار میں در بنا دیا تھا ایسی عبادت سے کیا فائدہ ہے۔ اصل تو انسان کی زندگی میں فکر ہے۔ اصل تو غور کرنا ہے کہ خدا ہمیں ہمارے گھروں سے نکال کے مکہ تک کیوں لایا ہے؟ ہمیں اس گھر کے گرد چکر لگانے کا کیوں حکم دیا گیا ہے اس گھر میں کیا خاص بات پائی جاتی ہے۔ اگر انسان فکر سے محروم ہو جائے گا تو سارے اعمال رسم بن جائیں گے۔ عبادتیں عادتیں بن جائیں گی۔ اعمال طریقے بن جائیں گے۔ عمل عمل نہ رہ جائے گا۔ روح ختم ہو جائے گی بندگی فنا ہو جائے گی اسی لئے اسلام نے اتنا زور دیا ہے تو اگر آپ نے قرآن میں، روایات میں، اسلام کے احکام میں، فکر کی اہمیت پر غور کر لیا ہے تو چار فقرے اور سن لیجیے جو میری تقریر کا خلاصہ ہیں اگر انسان کے پاس فکر نہ ہو گی تو پتھر کو خدا کہے گا۔ اگر فکر کا استعمال نہ کرے گا تو درخت کو خدا کہے گا۔ اگر فکر کو چھوڑ دیا تو پہاڑ کو خدا کہے گا، ستارے کو خدا کہے گا۔ سورج کو خدا کہے گا۔ اس لیے کہ یہ خالق اور مخلوق کا فرق ہی نہیں سمجھے گا مگر جب فکر کو استعمال کرے گا تو یہ سوچے گا کہ وہ خدا کیسے ہو گا جو ٹھوکر میں آ جائے جس کو ابھی لات ماری تھی وہ بھی خدا ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے اسی لیے پیغمبر بار بار کہتے رہے ارے ان کو خدا کہتے ہو اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔ یہ خدا کیسے ہو جائیں گے؟ یہ تو ابھی ٹھوکروں میں تھے۔ یہ درخت تو کاٹ کے پھینک دیا جاتا ہے تو اگر خدا ہی کٹ جائے گا تو بچے گا کیا؟ یہ بغیر فکر والے ہیں جو انھیں خدا کہہ رہے ہیں جن کے پاس اتنی فکر بھی نہیں ہے کہ جو ٹھوکر میں آ جائے وہ خدا نہیں ہو گا جو درخت کاٹ دیا جائے وہ خدا کیسے ہو گا۔ جس کا راستہ روک دیا جائے وہ خدا کیسے ہو گا۔ خدا کا راستہ اگر رک جائے تو خدائی کیسے چلے گی۔ وہ ستارہ جو اتر آئے وہ خدا کیسے ہو گا وہ چاند جو ٹکڑے ہو جائے وہ خدا کیسے ہو گا اور وہ سورج جو پلٹا دیا جائے وہ خدا کیسے ہو گا۔

(صلوات)

اگر انسان کے پاس فکر ہے تو وہ یہ سوچ سکتا ہے کہ یہ سب خالق بننے کے لائق نہیں ہیں لیکن اگر فکر بہک گئی تو مخلوق کو خالق بنا دے گا۔ پیدا ہونے والے کو خدا بنا دے گا۔ ٹھوکروں میں آنے والے کو معبود بنا دے گا۔ یہ سب فکر کے انحرافات ہیں اسی لیے اسلام نے کہا تھا کہ پہلے فکر استعمال کرو تاکہ حق و باطل کا اندازہ ہو جائے اور پیغمبرؐ نے کہا کہ فکر کرو اور سوچو کہ ہم دیوانہ نہیں ہوں تو مذہب کی عظمت کا خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

سوچو کہ جو خود جاہل ہوگا وہ لوگوں کو کیا پڑھائے گا۔ جو خود گنہ گار ہوگا وہ لوگوں کی کیا اصلاح کر سکے گا۔ جو خود ہی بہکا ہوا ہوگا۔ وہ راہنما کیسے بنے گا جو اپنی جہالت کا خود اقرار کرے گا وہ لوگوں کو راستہ کیسے بتائے گا۔ ارے کچھ تو سوچو فکر پر تو وہ پابندی عاید کرے کہ جس کے گھر میں کمزوری پائی جاتی ہو۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ کچھ تو سوچو تا کہ فرق معلوم ہو جائے کہ گھر کی عورتوں سے کم لکھا پڑھا کیسا ہوتا ہے اور سلونی کا خطیب کیسا ہوتا ہے۔ صلوات۔

کچھ فکر کرو تا کہ اندازہ ہو کہ میدان چھوڑ کے چلے جانے والے افراد کیسے ہوتے ہیں اور اکیلا میدان میں ثابت قدم رہنے والا کیسا ہوتا ہے۔ کچھ سوچو تاکہ اندازہ ہو کہ نبی کی پناہ میں رہنے والا کیسا ہوتا ہے اور تلواروں کی چھاؤں میں سونے والا کیسا ہوتا ہے۔ یہ سارے مسائل فکر سے طے ہوں گے۔ فکر پر پہرے بٹھا دینا اپنی کمزوری کا اقرار ہے اور فکر کی دعوت دینا ہی حقانیت کا اعلان ہے۔ صلوات۔

جس نے فکر کو استعمال کیا اس نے حق و باطل کو پہچان لیا اور جس نے فکر کو استعمال کیا اس نے صحیح اور غلط کو پہچان لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہب نے فکر کو صحیح طریقے سے استعمال کیا تو انقلاب پیدا ہو گیا کہ وہ اپنے راستے جا رہے تھے اور یہ اپنے راستے جا رہے تھے۔ وہ عیسائیت کا راستہ تھا اور یہ اسلام کا راستہ تھا۔ وہ عیسیٰ کے ماننے والے کا راستہ تھا۔ یہ پیغمبرؐ کے وارث کا راستہ تھا۔ اگر جیسے ہی ماں نے کہا بیٹا اس گرمی کے زمانے میں اس لو اور دھوپ میں ہم لوگ تو اپنا راستہ اس لیے طے کر رہے ہیں کہ تیری شادی کی ہے۔ تیری زوجہ کو لے کے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ یہ لوگ کیوں نکل پڑے ہیں۔ گرمی کے زمانے میں یہ قافلہ کیوں نکل پڑا ہے۔ صحراؤں میں،

بیابانوں میں، ریگستانوں میں۔ اس قافلے میں تو بچّے بھی نظر آتے ہیں۔ اس قافلہ میں تو عورتیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ کہاں کے لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ بیٹا ذرا جا کے پتہ لگاؤ۔ اب نکرا آ رہی ہے راستہ پر۔ اَب عقل استعمال ہو رہی ہے۔

آیا پلٹ کر بیٹا ماں کے پاس اماں یہ مسلمانوں کے پیغمبرؐ کا نواسہ ہے۔ یہ مسلمانوں کے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہے اسے نانا کا کلمہ پڑھنے والوں نے وطن میں رہنے نہیں دیا ہے۔

تو بیٹا یہ قافلہ کہاں جا رہا ہے؟ اماں مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس قافلے کی منزل کہاں ہے۔ یہ قافلہ کدھر جا رہا ہے مگر اتنے بڑے گھرانے کے لوگ۔ اتنے مقدس اور محترم گھرانے کے لوگ اس گرمی میں، لو دھوپ میں، صحراؤں کا سفر کیوں کر رہے ہیں۔ ماں نے کہا بیٹا تو اب ہمارا سفر بھی تمام ہو گیا چلو حسینؑ کے پاس چلو، بیٹے کو لیا، بہو کو لیا۔ آ گئی مولا کی خدمت میں۔ نبیؐ کے لال اَب یہ قافلہ آپ کے ساتھ رہے گا۔ اگر آپ مصیبتوں میں رہیں گے تو ہم بھی مصیبتوں میں رہیں گے۔ اگر آپ بلاؤں میں رہیں گے تو ہم بھی بلاؤں میں رہیں گے۔

اَب کون پوچھتا کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق ہے۔ تمہارا مذہب الگ، ہمارا مذہب الگ تمہارا راستہ الگ ہمارا راستہ الگ مگر ایک لمحہ جو سوچنے کا موقع ملا تو سوچ لیا۔ ایک لمحہ جو تفکّر سے کام لیا تو سارا قافلہ آ گیا خدمتِ حسینؑ میں۔

یہ پہلا قافلہ تھا جو حسینؑ کے ساتھ آیا تفکّر صحیح کے نتیجہ میں۔ دوسرا قافلہ حسینؑ مکّہ سے چلے، ایک قافلہ اور چل رہا تھا مگر دور دور۔ سردار قافلہ خود کہتا ہے کہ میں اس فکر میں تھا کہ جہاں حسینؑ ٹھہریں گے وہاں نہیں ٹھہروں گا۔ اس لیے کہ بہر حال یہ میرے پیغمبرؐ کے نواسے ہیں۔ اگر کہیں انھوں نے مجھے بلا لیا تو میں انکار نہ کر سکوں گا۔ یہ بلاؤں میں مصیبتوں میں جا رہے ہیں۔ میں مصیبتوں میں ساتھ نہیں جا سکتا لہٰذا میں نے اپنے قافلے کو الگ رکھا۔ ان کا قافلہ الگ رہا مگر ایک مقام پر دونوں قافلے ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک مرتبہ نبیؐ کے لال نے اپنے کسی چاہنے والے سے کہا۔ جاؤ اس قافلے کے سردار کو بلا کر لاؤ۔ آنے والا آیا۔ آواز دی سردار قافلہ کون ہے۔ معلوم ہوا زہیر ابن قین ہیں۔ کہا آپ کو فرزند رسولؐ نے بلایا ہے۔ آئے مولا کی خدمت میں۔ کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں مصیبتوں میں گھرا

جا رہا ہوں ۔ دنیا والوں نے مجھے حرم خدا میں بھی پناہ نہیں لینے دی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم میری مدد کرو

زہیر نے کہا کہ حضور ایک لمحہ کی مہلت دیں۔ میری زوجہ میرے ساتھ ہے۔ میرے گھر والے، خاندان والے میرے ساتھ ہیں۔ زوجہ کو خاندان والوں کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ آجاؤں گا اس لیے کہ عالم غربت و مسافرت میں اس کا کیا انجام ہو گا نہیں معلوم ہے۔ بہتر ہے کہ میں اسے روانہ کر دوں۔ زہیر زوجہ کے پاس آئے اور آکر خبر بیان کی۔ فرزند رسولؐ نے بلایا تھا اپنی مدد کے لیے۔ اب میں جا رہا ہوں۔ تم جاؤ اپنے وطن چلی جاؤ۔ قافلے والوں کے ساتھ زوجہ کو رخصت کیا اور خود آگئے مولا کی خدمت میں۔ ابھی تک زہیر حسینی نہیں تھے۔ اب یہ تاریخ یاد رکھئے گا کہ ادھر سے وہب آرہا ہے، ادھر سے زہیر آرہے ہیں اور عاشور کی صبح ہوتے ہوتے حر بھی آگیا چاروں طرف سے صحیح فکر والے حسینؑ کی خدمت میں اکٹھا ہو رہے ہیں۔ مگر جو آیا اسکی فکر میں عجیب انقلاب دیکھا۔ وہ پہلی عورت تھی جو اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی کہ بیٹا وہ مسلمانوں کے پیغمبرؐ کا نواسہ ہی۔ مگر مصیبت میں مبتلا ہے لہٰذا ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ رہیں۔

یہ آغاز تھا مادر وہب کی تبلیغ کا۔ اس کے بعد جب عاشورہ کی رات آئی تو یہ کربلا کی خواتین تھیں جو اپنے بچّوں کو سامنے بٹھائے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔ بیٹا کل جب قربانی کا وقت آجائے تو بنی ہاشم کا کوئی بچّہ نہ جانے پائے۔ پہلے تم چلے جانا ورنہ میں سیدانیوں کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی۔ اللہ میرے عزیزو! میرے دوستو! بھائیو! بچّو! اے میری بہنو۔ ایک جملہ تمہارے سمجھنے کا ہے۔ دنیا میں عورت کو دو چیزوں سے زیادہ کوئی شئی عزیز نہیں ہوتی ہے۔ ایک اس کو اپنا سہاگ، ایک اس کے لیے اپنی اولاد مگر کربلا میں دوسرے انقلابات دیکھے۔ نہ کسی کو سہاگ کی فکر ہے نہ کسی کو گود کے پالے کی فکر ہے۔ زوجہ کہتی ہے والی پہلے تم جانا۔ ماں کہتی ہے بیٹا پہلے تم جانا، رات بھر یہی تذکرے ہوتے رہے یہاں تک کہ قربانی کا وقت آگیا۔ تو ماں نے پھر بلا کے کہا بیٹا وقت آگیا ہے مرنے کا۔ علی اکبرؑ نہ جانے پائیں تم جانا۔ قاسمؑ نہ جانے پائیں تمہیں جانا ہے۔ عونؑ و محمدؑ سے پہلے تمہیں جانا ہے۔

آئے وہب مولا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ آقا مرنے کی اجازت دے دیجئے

مولا مرنے کی اجازت دے دیجیے۔ حسینؑ نے وہب کو سر سے پیر تک دیکھا۔ جوان انسان ابھی شادی کر کے آیا ہے۔ جوانی کی آرزوئیں، امنگیں، تمنائیں۔ مگر اب وہب کو کسی بات کی فکر نہیں ہے مولا مرنے کی اجازت دے دیجئے فرزند رسولؐ سوچ رہے ہیں اور وہب کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ بالآخر اجازت دی پلٹ کے آئے، ماں کو خبر سنائی۔ اماں مولا نے اجازت دے دی ہے۔ ماں نے مسکرا کے بیٹے کو دیکھا۔ کیا کہنا میرے مقدر کا۔ نبیؐ کے لال نے قربان ہونے کی اجازت دے دی ہے تو بیٹا اب کیا آئے ہو جاؤ میدان میں جاؤ، وہب میدان میں آئے۔ جنگ کرتے رہے ۸۰ ظالموں کو قتل کیا اور پلٹ کر آئے اس عالم میں کہ زخمی ہیں۔ خون میں نہائے ہوئے ہیں۔ ماں کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے۔ هَلْ رَضِيتِ عَنَّا يَا أُمَّاهُ اماں اب خوش ہو گئیں۔ اب راضی ہو گئیں یہ آپ کا بیٹا خون میں نہا کے آیا ہے۔ ماں نے منہ موڑ لیا۔ اماں اپنے لال کا ذرا حال تو دیکھئے میں کتنے زخم کھا کے آیا ہوں۔ کیسے خون میں نہا کے آیا ہوں۔ آپ مڑ کے نہیں دیکھنا چاہتی ہیں کہا بیٹا کیا زندہ واپس آنے کے لیے بھیجا تھا۔ جاؤ جلدی جاؤ میں تمہیں نہیں دیکھنا چاہتی ہوں جب قربان ہو جاؤ گے تب ماں راضی ہوگی بس یہ سننا تھا کہ وہب چلے۔ اب جو در خیمہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ زوجہ سر جھکائے کھڑی ہے۔

مومنہ یہاں آ کے کیوں کھڑی ہو گئی۔ کہا والی آپ میدان میں جا رہے ہیں مجھے معلوم ہے تھوڑی دیر میں آپ شہید ہو جائیں گے۔ آپ جاتے ہیں تو میں آپ کو روکتی نہیں ہوں لیکن میری ایک آخری خواہش ہے۔ کہا مومنہ بتا کیا ہے؟ کہا یوں نہ کہوں گی پہلے مولا کے پاس چلئے۔ وہب زوجہ کو لے کر مولا کی خدمت میں آئے۔

فرمایا وہب کیوں آئے ہو۔ کہا مولا میں نہیں آیا ہوں۔ یہ مومنہ لے کر آئی ہے۔ یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ فرمایا مومنہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ کہا مولا یہ جا رہے ہیں۔ قربان ہو جائیں گے جنت میں چلے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے سامنے وعدہ کریں کہ میرے بغیر جنت میں قدم نہ رکھیں گے۔ فرمایا مومنہ یہ وہب سے کیوں کہہ رہی ہے۔ سردار جوانانِ جنت تو میں ہوں یہ میرا وعدہ ہے کہ یہ جنت میں تیرے بغیر قدم نہ رکھیں گے۔

عرض کی مولا آپ سے اس لیے نہیں کہا تھا کہ آپ سے مجھے ابھی کچھ اور کہنا تھا۔ فرمایا کیا کہنا ہے۔ کہا مولا عاقبت کا انتظام تو ہو گیا اب اجازت دیجئے کہ میں سیدانیوں کے خیمے میں چلی جاؤں تاکہ وہب کے بعد عالم غربت میں میرا پردہ تو رہ جائے۔

حسینؑ نے سُنا اور سر جھکا لیا۔ اے زوجۂ وہب تجھے کیا معلوم ہے۔ وہب چلے اور میدانِ جنگ میں آئے۔ ماں منتظر ہے کہ کب بیٹے کے مرنے کی خبر آتی ہے۔ زوجہ منتظر ہے کہ کب میرا وارث راہِ خدا میں، راہِ حسینؑ میں قربان ہوتا ہے اور وہب میدان میں جہاد کر رہے ہیں کہ ایک مرتبہ آہٹ محسوس کی مڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ زوجہ چوب خیمہ لیے چلی آ رہی ہے۔ ماں میرے والی راہِ خدا میں جہاد کرو میں آ رہی ہوں۔ وہب نے مڑ کے دیکھا کہا مومنہ تجھے تو معلوم ہے کہ عورتوں سے جہاد ساقط ہے تو میدان میں کیوں آ گئی؟ کہا والی جو منظر میں نے دیکھا ہے اگر تم نے دیکھ لیا ہوتا تو کبھی نہ پوچھتے کہ میدان میں کیوں آ گئی؟ کہا جلدی بیان کر کیا تو نے دیکھا؟ کہا تمہارے میدان میں جانے کے بعد جب میں سیدانیوں کے خیمے میں گئی تو دیکھا کہ مولا کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سر جھکائے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ فرما رہے ہیں وَاغُرْبَتَاهُ وَاقِلَّةَ نَاصِرَاهُ ہائے میرے چاہنے والے مرتے جا رہے ہیں۔ میرے مددگار کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے عالم میں کیسے خیمہ میں بیٹھتی۔ عزیزو! یہ وہ عورت ہے جو کربلا میں سہاگ لٹا رہی ہے۔

بس دوسرا اور آخری منظر ایک خاتون نے اور یہ منظر دیکھا جب حسینؑ مسلم کے سرہانے سے اٹھے۔ ابن عوسجہ کو رو کے چلے۔ خیمہ کا رخ کیا۔ حبیب ساتھ تھے۔ دیکھا کہ خیمہ کا پردہ اٹھا اور ایک کمسن بچہ چلا آ رہا ہے۔ فرمایا حبیب بچہ کو روکو یہ کون ہے۔ یہ بچہ کہاں جا رہا ہے۔ حبیب نے آ کے روکا بیٹا کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کہا میں مسلم کا لال ہوں میرا بابا میدان میں گیا ہے۔ میں بھی جا رہا ہوں جہاد کرنے کے لیے۔ حسینؑ نے کہا بیٹے کو قریب لاؤ کلیجہ سے لگایا کہا بیٹا شاید تجھے نہیں معلوم ہو کہ میں تیرے باپ کے سرہانے سے آ رہا ہوں۔ میرے لال میدان میں جانے کا ارادہ نہ کر۔ تیری ماں کے لیے تیرے باپ کا غم بہت کافی ہے۔ اب نیا صدمہ نہ برداشت کر سکے گی۔ ایک مرتبہ تڑپ کے بچہ نے کہا۔ مولا آپ مجھ سے یہ کیا فرما رہے ہیں۔ یہ تلوار کمر سے کس نے لگائی ہے۔ یہ میدان میں

جانے کے لیے مجھے کس نے سجایا ہے۔ میری ماں نے مجھے سجا کے بھیجا ہے۔ حسینؑ مڑ گئے خیمہ کی طرف تاکہ بیوہ مسلم کو کچھ سمجھائیں کہ ایک مرتبہ آواز آئی۔ مولا ایک بیوہ کا ہدیہ ہے رد نہ کیجیے گا۔ میرا لال آپ کے قدموں پر قربان ہو جائے تو میں سمجھوں گی کہ زندگی کی کمائی کام آگئی۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ۔

□□

P-14

مجلس ۶

صدق وکذب

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

ن قلم اور تحریر کی قسم آپ اپنے پروردگار کی نعمت کی بنیاد پر مجنون نہیں ہیں۔ آپ کے لئے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلندترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون اور دیوانہ کون ہے۔

آیاتِ کریمہ کے ذیل میں "فضائل اور رذائل" کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے چھٹے مرحلہ پر انسانی زندگی کی ایک اور فضیلت اور ایک کمزوری کا تذکرہ کرنا ہے۔ فضیلت کا نام ہے صدق اور کمزوری کا نام ہے کذب۔

اب تک جو باتیں میں نے آپ کے سامنے گذارش کی ہیں ان کا تعلق انسان کے کمال کے اس حصہ سے تھا جو براہ راست روح، نفس، عقل اور فکر سے تعلق رکھتا ہے۔

آج جس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے اس کا واقعی تعلق تو انسان کی روح اور اس کے نفس ہی سے ہے مگر اس کا ظاہری تعلق انسان کی زبان سے ہے۔ صدق اور کذب، سچ اور جھوٹ یہ وہ صفتیں ہیں جن کا اظہار انسان کے کلام اور بیان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر کلام اور بیان حقیقت کے مطابق ہوتا ہے تو اسے صدق اور سچائی کہا جاتا

ہے اور اگر کلام اور بیان حقیقت کے خلاف ہو جائے تو اسے کذب اور جھوٹ کہا جاتا ہے۔ آپ جو خبر بھی کسی کو سنائیں گے اگر وہ خبر واقعہ کے مطابق ہے تو آپ کو اس خبر میں سچا کہا جائے گا اور اگر خدا نہ کردہ آپ کی بیان کی ہوئی خبر واقعہ کے خلاف نکل جائے تو آپ کو جھوٹا کہا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صداقت اور کذب کا تعلق انسان کے کلام، انسان کے بیان اور انسان کی زبان سے ہے۔ اسی لئے جب ہمارے بچوں کو مالک کائنات۔ کے اوصاف پڑھائے جاتے ہیں اور پروردگار عالم کی ان صفتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو صفتیں پروردگار عالم میں پائی جاتی ہیں یعنی اسکی ذات کے شایانِ شان ہیں تو ان میں علم و قدرت و حیات کے علاوہ آخر میں دو صفتوں کا تذکرہ اور ہوتا ہے۔ ایک صفت کا نام ہے متکلم اور ایک صفت کا نام ہے صادق۔ یعنی صفات ثبوتیہ میں ساتویں متکلم اور آٹھویں صادق کہا جاتا ہے۔ یہ ترتیب خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر متکلم نہ ہو تو صادق ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے یعنی اگر اس کے پاس کلام نہ ہوتا، اگر اس کے پاس بیان نہ ہوتا تو اس کے صادق ہونے کے کوئی معنی ہی نہ تھے اس لئے کہ صدق اور کذب بیان ہی میں ہوتا ہے۔ کلام ہی کے ذریعہ کوئی صادق یا کاذب کہا جاتا ہے۔ تو پہلے پروردگار کو متکلم ثابت کیا جائے گا۔ اس کے بعد اس بات کا اعلان کیا جائے گا کہ وہ صاحبِ کلام ہونے کے بعد بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیتا ہے بلکہ اس کا ہر بیان حقیقت اور واقعہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

اب چونکہ صفات الٰہی کا تذکرہ آگیا ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ اس نکتہ کو بھی یاد رکھیں کہ ہمارے بچوں کو جو کچھ دینیات میں پڑھایا جاتا ہے یہ کوئی رٹا یا ہوا سبق نہیں ہے۔ یہ فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ معصومینؑ کی تعلیم ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ کا دیا ہوا دین اقدس ہے جس کا ہر قانون اور ہر عقیدہ عین عقل اور عین فکر ہے۔ ہمارے یہاں عقائد نہ گھڑ میں بنائے جاتے ہیں اور نہ بلا وجہ بچوں کو رٹائے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک بنیاد ہوتی ہے جس کے عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اس نکتہ

کو پہچانیں کہ پروردگار عالم کے ہزاروں لاکھوں صفات میں سے متکلم اور صادق ہی کو کیوں صفاتِ ثبوتیہ میں شمار کیا گیا ہے۔

پروردگار کے کتنے صفات ہیں اگر ہم اور آپ اس کا حساب کرلیں تو خود بھی پروردگار ہو جائیں گے جس کی عقل میں خدا سما جائے وہ صاحب عقل بڑا ہو جائے گا اور خدا چھوٹا ہو جائے گا اسی لئے صادق آل محمدؐ نے فرمایا تھا کہ انسانی فکر ذاتِ واجب کا ادراک نہیں کر سکتی ہے کلما میزتموہ باوہامکم فہو مخلوق لکم مردود الیکم

پروردگار کے بارے میں جس دقیق ترین مقصد تک تمہارا ذہن جا سکتا ہے اور جو عظیم ترین خیال تمہارا ذہن ایجاد کر سکتا ہے وہ تمہارے ذہن کی پیداوار ہے اور ذہن کی پیداوار مخلوق ہے خالق نہیں ہے خالق وہ نہیں ہے جس کو ذہن پیدا کرتا ہے۔ خالق وہ ہے جو ذہنوں کو پیدا کرتا ہے لہٰذا پروردگار عالم کی حقیقت کا کسی ذہن میں سما جانا ناممکن ہے نہ ہم اسکی ذات کو پہچان سکتے ہیں اور نہ اس کے کمالات کو پہچان سکتے ہیں مگر مالکِ کائنات نے از راہِ رحم و کرم جن اپنے نیک بندوں کو اپنی معرفت کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ ان بندوں نے ہمیں پروردگار عالم کے ایک ہزار صفات سے آشنا بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور صفتیں کتنی ہیں وہ تو معبود خود ہی جانتا ہے لیکن ایک ہزار صفتیں تو ہمیں بھی بیان آل محمدؐ میں مل گئی ہیں۔ یہ نقطہ بھی یاد رکھئے گا کہ عالم اسلام میں پروردگار عالم کے اسماء حسنیٰ حضرت بغدادی کے قواعد میں بیان کئے گئے تو ایک سو سے آگے نہ بڑھ سکے یعنی بغدادی قاعدہ کے آخر میں جب پروردگار عالم کے صفات پہچنوائے گئے تو یوں کہا گیا کہ وہ اللہ ہے رحیم ہے کریم ہے رحمٰن ہے حنان ہے، منان ہے غفار ہے ستار ہے قہار ہے اور کل ملا کے سو صفات ہوئے۔ جب سرکار دو عالم نے دعائے جوشن کبیر میں پروردگار عالم کے ایک ہزار صفات کا اعلان کر دیا تو معلوم ہوا کہ بغدادی قاعدہ صرف بغدادی تھا اسلامی نہیں تھا۔ یہاں ایک ہزار صفات ہیں اور ہر دس صفات کے بعد سبحانک یا لا الٰہ الا انت الغوث الغوث خلّصنا من النار یا رب۔

کل سو فصلیں ہیں دعائے جوشن کبیر میں اور سو کو دس سے ضرب دیا جائے گا تو ایک ہزار صفات خود بخود سامنے آجائیں گی۔ یہ صفات تو وہ ہیں جو پروردگار عالم کے بارے میں بیان کرنے والوں نے بیان کر دیئے ہیں اور ہم نے سن لئے ہیں۔ واقعتاً خدا کی صفتوں کو کوئی نہیں جانتا ہے اور کوئی ان کا ادراک نہیں کر سکتا ہے۔ جس کے سامنے مرسلِ اعظمؐ کھڑے ہو کر اعلان کر رہا ہے مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ پروردگار تیری معرفت کا حق ادا نہیں کر سکا تو اس کے سامنے ہم اور آپ کیا جانتے ہیں۔ مگر یہاں ایک لفظ گذارش کرنا ہے کہ ایک ہزار صفتوں میں سے ان دو صفتوں کا انتخاب کیوں کیا گیا کہ خدا متکلم ہے اور خدا صادق ہے۔ متکلم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ زبان سے بولتا ہے۔ زبان تو بولنے کا ایک ذریعہ ہے۔ زبان متکلم نہیں ہے متکلم آدمی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مجلس کے بعد کوئی آدمی باہر نکل کر کسی سے بیان کرے کہ مولانا کی زبان بہترین تقریر کر رہی تھی۔ تو لوگ پوچھیں گے کیا مولانا نہیں آئے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ متکلم آدمی ہی ہوتا ہے متکلم زبان نہیں ہوتی ہے مگر چونکہ ہمارا کلام زبان ہی کے ذریعہ سامنے آتا ہے لہٰذا ہمارا کلام زبان کا پابند ہو گیا ہے۔ ورنہ اگر کوئی قادر مطلق ہو جس نے ہماری زبان کو قوت گویائی دی ہو تو وہ کسی کو بھی قوتِ گویائی دے سکتا ہے۔ ہمارا کلام، ہمارا بیان، ہمارا قول خدا نے ہماری زبان کے ذریعہ پیدا کیا ہے جب وہ خود بولنے پر آجائے گا تو وہ کسی کا محتاج نہیں ہے جہاں چاہے گا کلام پیدا کر دے گا۔ موسیٰؑ سامنے آکے کھڑے ہو جائیں گے تو درخت میں کلام پیدا کر دے گا۔ اور امام سجادؑ سامنے آجائیں گے تو حجرِ اسود میں کلام پیدا کر دے گا۔ صلوات۔

تو پروردگار عالم کی صفتوں میں جس صفت پر آلِ محمدؐ نے زور دیا ہے وہ صفت ہے متکلم یعنی ایسا قادر مطلق ہے کہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو نبیؐ کے ہاتھ پر سنگریزے آکر تسبیح پڑھ سکتے ہیں۔ وہ چاہے تو حضور کے سامنے جانور آکر کلمۂ شہادتین جاری کر سکتے ہیں اور وہ جو چاہے تو حجرِ اسود امام زین العابدینؑ کی

امامت کی گواہی دے سکتا ہے یہ تو قدرت کی بات ہوئی لیکن آخر متکلم کو صفات ثبوتیہ میں اتنا اہم کر کے اتنا نمایاں بنا کے پیش کیا گیا ہے۔

اس راز کو آپ اس وقت پہچانیں گے جب اس دور کا جائزہ لیں گے جس دور میں اسلام پیش کیا گیا تھا۔

میں بیان توحید کی منزل سے آگے گزر چکا ہوں لیکن بہر حال توحید کے مطالب کو آپ کے سامنے پیش ضرور کرتا رہوں گا تو جس دور میں سرکار دو عالمؐ نے خدائے وحدہ لاشریک کا عقیدہ پیش کیا تھا ایسا نہیں تھا کہ اس دور میں مذاہب نہیں تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں لوگ خدا نہیں جانتے تھے خدا کے معنی نہیں جانتے تھے، خدا کو مانتے نہیں تھے۔ آپ کے پاس تو ایک خدا تھا۔ ان کے پاس خداؤں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ساڑھے تین سو خدا تو ایک گھر میں لا کے رکھے گئے تھے۔ اتنے خداؤں کے درمیان پیغمبرؐ نے خدائے وحدہٗ لاشریک کا پیغام سنایا اور یہ کہہ کر سنایا کہ خدا کے صفات میں ایک صفت ہے متکلم۔ اب اس کا راز آپ کو تب معلوم ہوگا جب آپ ان خداؤں کا جائزہ لیں گے جو عرب سماج میں اس وقت پائے جاتے تھے۔

اس وقت پتھر خدا تھے، درخت خدا تھا، پہاڑ خدا تھا، ستارہ خدا تھا، چاند خدا تھا سورج خدا تھا۔ حد یہ ہے کہ جانور خدا تھا مگر سب گونگے خدا تھے۔ پتھر خدا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ جناب ابراہیمؑ نے یہی تو کہا تھا کہ جب بتوں کو بتکدے میں جا کر توڑ دیا اور لوگ آئے کہ یہ ہمارے خداؤں کا حشر کس نے کیا ہے۔ ہمارے خداؤں کو کس نے توڑا ہے سنا ہے کہ کوئی نوجوان ہے یُقَالُ لَہٗ اِبْرٰھِیم جس کا نام ابراہیمؑ ہے وہی اکثر ان کا ذکر کیا کرتا تھا کہ یہ خدا نہیں ہیں۔ یہ واقعی خدا نہیں ہیں، یہ اچھے خدا نہیں ہیں۔ وہی ہوگا جس نے آکے ان کو توڑ دیا ہوگا۔ جناب ابراہیمؑ کی تلاش میں چلے اور جب جناب ابراہیمؑ ان کے قبضہ میں آگئے تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کام آپ نے کیا ہے؟ فرمایا بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُم یہ ان کے بڑے نے کیا ہے۔ بعض مسلمانوں نے جناب ابراہیمؑ کا یہ جملہ سنا

تو کہہ دیا کہ ابراہیم اللہ کی نظر میں بہت سچے تھے مگر وقت آنے پر بالآخر جھوٹ بول گئے بلکہ بعض محدثین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ابراہیمؑ زندگی میں تین مرتبہ تو کم سے کم جھوٹ بولے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے توڑا ہے تو فرما دیا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ ان کے بڑے نے کیا ہے۔ حالانکہ اس جملہ میں غلط بیانی نہیں ہے اور نہ انھوں نے بڑے بت کا نام لیا تھا۔ وہ تو اس امر کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ ان کے بڑے نے کیا ہے اور یہ ہم سے کیوں پوچھتے ہو کہ کس نے مارا ہے۔ تمہارا بچہ اگر روتا ہوا گھر میں آتا ہے تو تم بچے سے پوچھتے ہو کہ کس نے مارا ہے؟ اتنی عقل تو ہر صاحبِ عقل کے پاس پائی جاتی ہے کہ اگر کسی کا بچہ روتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم مار کھا گئے ہیں۔ تو پہلا سوال بچے سے ہوتا ہے کہ بیٹا تمہیں کس نے مارا ہے۔ تو جناب ابراہیمؑ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو کہ کس نے توڑا ہے۔ انھیں سے پوچھ لو کہ کس نے توڑا ہے۔

کہاں ان سے کیسے پوچھیں یہ تو بول نہیں سکتے ہیں۔ تو اسلام نے چاہا کہ حق و باطل کے خدا الگ ہو جائیں کہ اتنی بڑی قوم نے خدا مانا مگر اس اقرار کے ساتھ کہ یہ بولنے کے لائق نہیں ہیں۔ پتھر خدا بنے مگر بولنے کے قابل نہیں، درخت خدا بنے مگر بولنے کے لائق نہیں، پہاڑ خدا بنے مگر کلام کے قابل نہیں۔ چاند سورج ستارے خدا بنے مگر کوئی بولنے والا نہیں تو اسلام نے اپنے خدا کے صفات میں متکلم کو شامل کر دیا کہ باطل کا وہ خدا ہے جس میں قوت گفتار نہیں ہے اور حق کا خدا وہ ہے جو جہاں چاہے کلام پیدا کر سکتا ہے۔ صلوات۔

اور یہیں سے اس جملہ کو آپ اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیں اگر گونگے خدا نہ بنے ہوتے تو اسلام نے اپنے خدا کو متکلم نہ کہا ہوتا۔ اگر جھوٹے خدا نہ بنے ہوتے تو اسلام نے اپنے خدا کو صادق نہ کہا ہوتا۔ اسلام نے اس نکتہ پر اسی لئے زور دیا کہ اندازہ ہو جائے سماج میں گونگے خدا بھی پائے جاتے ہیں اور سماج میں جھوٹے خدا بھی پائے جاتے ہیں۔ اسلام کا

خدا وہ ہے جو خدائے متکلم ہے اور خدائے صادق ہے اور وہ جو بات درمیان میں آگئی تھی اسے بھی ایک لفظ میں گذارش کر دوں۔ ظاہر ہے کہ وہ آپ کے ذوق سے متعلق ہے آپ سوچئے کہ اس مسئلہ پر کہ ابراہیمؑ زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے۔ جب لوگ بلانے کے لئے آئے کہ چلئے چلیں عید منانے کے لئے کہا اِنِّی سَقِیمٌ میں بیمار ہوں نہیں جاسکتا ہوں حالانکہ اچھے خاصے تھے بیمار ہوتے تو وہ بتکدے میں جاکر بتوں کو توڑتے۔ جو اتنا صحت مند ہو کہ خداؤں کو توڑ سکتا ہے وہ اپنے کو بیمار کہہ رہا ہے یعنی معاذاللہ ابراہیمؑ نے غلط بیانی سے کام لیا جب ستارے چاند سورج کو دیکھ کر کہا ھٰذا ربّی یہ میرا خدا ہے۔ اس کے معنی ہیں غلط بیانی سے کام لیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں محدثین نے راویوں نے معاذاللہ حیات جناب ابراہیمؑ میں تین جھوٹ تلاش کر لئے اور کہا ٹھیک ہے جناب ابراہیمؑ بہت اچھے تھے لیکن ان تین مقامات پر تو غلط بیانی کر ہی گئے۔ تین مقامات پر غلط بیانی ہو ہی گئی۔ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پروردگار عالم نے قرآن میں کہا وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِبْرٰھِیْمَ پیغمبر اس کتاب میں ابراہیمؑ کو بھی یاد کرو۔ یعنی ابراہیمؑ کی یاد دلاؤ لوگوں کو۔ ابراہیم کا سبق یاد کراؤ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا۔ دیکھئے یہ موضوع صداقت ہے جو میں گذارش کر رہا ہوں۔ پیغمبر ابراہیمؑ کو یاد دلاؤ اور صفت کے ساتھ یاد دلاؤ ابراہیمؑ نبی صدیق تھے۔ میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا ابھی تو ہمارے بارے میں یہی طے ہو رہا ہے کہ ان کا ایمان قرآن پر ہے یا نہیں۔ میں تو ان کی بات کر رہا ہوں جن کا ایمان قرآن پر ہے بلکہ قرآن ہی پر ہے۔ کیا قیامت ہے کہ قرآن اور حدیث کا حسین ٹکراؤ قرآن اور روایت کا اتنا خوبصورت ٹکراؤ۔ قرآن کہے اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا اور محدث کہے مگر تین جھوٹ بولے مگر تین جگہ غلط بیانی کی۔ تو میں تو محدث سے ہاتھ جوڑ کے کہوں گا کہ اگر خدا کا بنایا ہوا صدیق تین جھوٹ بول سکتا ہے تو حضور آگے حد ادب ہے میں تو سوال ہی کر سکتا ہوں جواب دینے کے موقف میں نہیں ہوں۔ صلوات۔

تو صفت صدق سچ بولنا۔ صداقت یہ اتنا عظیم کمال ہے کہ اس کو پروردگار عالم

ے صفات ثبوتیہ میں شمار کیا گیا ہے یعنی اللہ کے صفاتِ کمالات میں ایک سچائی بھی ہے اب تو سچائی کی عظمت کا اندازہ ہوا۔ حدیث قدسی میں پروردگارِ عالم نے کہا کہ اگر صاحبِ اخلاق بننا چاہتے ہو تو تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ اللہ کے اخلاق اختیار کرو جو خدا کے صفات ہیں انھیں اختیار کرو اور خدا کے صفات میں ایک صفت ہے صادق لہٰذا سچ بولو تاکہ کمال پیدا ہو جائے جس کمال کو پروردگارِ عالم نے اپنا کمال قرار دیا ہے۔ تو صداقت کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا ذات واجب سے۔ پہلا صادق پہلا سچا پروردگار۔ اس کے بعد خدائے صادق نے جب سلسلۂ ہدایت شروع کیا تو سلسلۂ ہدایت کے دو شعبے تھے ایک شعبہ تھا ناطق ایک شعبہ تھا صامت۔

ناطق شعبہ کا نام تھا نبی، رسول، صاحبِ شریعت، راہنما، ہادی، راہبر یعنی انسان اور صامت شعبہ تھا کتاب، صحیفہ، پیغامات، رسالت۔ جو کچھ وہاں سے آرہا ہے۔ کتاب ہدایت کے لئے آئی، صحیفے ہدایت کے لئے آئے، پیغامات ہدایت کے لئے آئے رسالت ہدایت کے لئے آئی اور رسول وہ بھی ہدایت کے لئے آیا۔ تو پروردگارِ عالم نے اپنے دین کو اور اپنے نظامِ ہدایت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک حصہ تھا نظامِ ہدایت کا ناطق جس کو نبی رسول وغیرہ کہا جاتا ہے اور ایک حصّہ تھا صامت جس کو کتاب اور صحیفہ وغیرہ کہا جاتا ہے تو جب صامت انتظام کے لئے قرآن بھیجا تو اعلان کیا وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وہ انسان جو صدق لے کر آیا وَصَدَّقَ بِهِ اور وہ انسان جس نے اس صدق کی تصدیق کی أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ یہی لوگ ہیں جو متقی کہے جانے کے لائق ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو پرہیزگار کہے جانے کے قابل ہیں۔ تو لانے والا صدق لیکر آیا۔ تو اب قرآن کا نام کیا ہے صدق، اسلام کا نام کیا ہے صدق۔ کیونکہ پروردگارِ عالم کی طرف سے لانے والا یہی اسلام اور یہی قرآن لے کر آیا ہے تو خدائے صادق نے جب نظامِ ہدایت کے لئے شعبۂ صامت میں کوئی صحیفہ، کوئی دین، کوئی پیغام، کوئی کتاب بھیجی تو اس کا نام رکھا صدق اور شعبۂ ناطق میں جب کوئی نبی بھیجا تو جس کو پیغام دے کر بھیجا اسے بھی اتنا سچا

بنا کر بھیجا کہ جو کچھ نہیں مانتے تھے وہ بھی صادق مانتے تھے۔ جنھوں نے رسول نہ مانا، نبی نہ مانا صاحبِ کرامت نہ مانا انھوں نے بھی بہر حال پیغمبرؐ کو صادق اور امین تو مانا۔ تو اس کے معنی ہیں کہ خدا صادق تھا تو جو اس کا پیغام آیا وہ بھی بالکل صدق۔ جو اسلام آیا وہ بھی صدق، جو قرآن آیا وہ بھی مجسّم صداقت اور جو لے کر آیا جس پر نازل ہوا وہ نبی بھی صادق۔ تو اسلام کا سلسلہ توحید سے لے کر نبوت تک اور خدا سے لے کر کلام خدا تک سب صداقت کا ہی سلسلہ ہے تو اب اسلام جب آگے بڑھے گا تو ناطق کی جگہ پر کوئی ناطق آئے گا اور صامت کے لئے کوئی محافظ آئے گا۔ اگر صامت کا محافظ کوئی جھوٹا ہو جائے تو لانے والے کے سچا ہونے کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔ اگلی صدیوں میں تو سب جھوٹ ہو ہی جائے گا سب غلط ہو ہی جائے گا۔ تو ضرورت تھی کہ ایسے افراد ہوں کہ جن کے حوالے سے یہ پیغام عام کیا جائے اور وہ ویسے ہی صادق ہوں گے جیسا پیغمبر صادق تھا اس لئے کہ خدا اپنے دینِ صدق کو، اپنے قرآن صدق کو اپنے اسلام صدق کو کسی جھوٹے کے حوالے نہیں کر سکتا۔ تو پروردگار یا تو اس دین کو واپس بلائے گا کہ نبی جا رہے ہیں تو اپنے قرآن کو ساتھ لے جائیں اور اگر ایسا نہیں ہے اور اس قرآن کو رکھنا ہے تو جیسے پہلے دن اس کے پاس رکھا جو صادق تھا۔ اس کے بعد بھی ایسے ہی افراد درکار ہوں گے جو سچے ہوں ورنہ اس کے بغیر یہ کلام جھوٹوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا ہے۔

عجیب بات ہے اور خدا ہی جانے کہ اس کو یہ صفت صدق کتنی پسند ہے کہ جب اپنے ساتھ دینے کا اعلان کیا تو کہا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اللہ متقین کے ساتھ ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُحْسِنُوْنَ خدا نیک عمل والوں کے ساتھ ہے یعنی خود تو رہتا ہے صابرین کے ساتھ، متقین کے ساتھ، صالحین کے ساتھ، محسنین کے ساتھ مگر جب ہمیں ساتھ رہنے کا حکم دیا تو ہم سے یہ نہ کہا کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّابِرِیْنَ، ہم بھی صابروں کے ساتھ ہیں تم بھی صابروں کے ساتھ ہو جاؤ، ہم بھی متقین کے ساتھ ہیں تم بھی متقین کے ساتھ ہو جاؤ۔ نہیں بلکہ اعلان ہوا یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ

خدایا اپنے لئے اعلان کیا کہ ہم صابرین کے ساتھ ہیں متقین کے ساتھ ہیں اور ہم سے کہتا ہے کہ صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔ کہا میرے ساتھ دینے کا معیار اور ہے اور تمہارے ساتھ ہونے کا معیار اور ہے۔ صلوات۔

آخر صادقین ہی میں کیا خاص بات ہے اور صادقین کے لفظ پر اتنا زور کیوں ہے اس صداقت کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ تو نے پورے عالم اسلام کو متقی بنا کے صادقین کے ساتھ لگا دیا کہ سچوں کے ساتھ رہو۔ ایسا کیوں ہے۔؟

بات بہت طویل ہے لیکن ایک لفظ یہاں گذارش کرنا ہے کہ اسلام کے بارے میں اور دین کے بارے میں پورے عالم اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ دین کا قانون کسی گھر میں نہیں بنتا۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے دین کا کوئی قانون بنایا نہیں ہے اگر بنایا ہوتا تو خدا ہوتے رسول نہ ہوتے۔ رسولؐ پیغامبر کو کہا جاتا ہے پیغام بنانے والے کو نہیں کہا جاتا ہے۔ تو پوری دنیا کا ایمان ہے کہ کوئی قانونِ اسلام سرکار دو عالمؐ کے گھر میں نہیں بنا ہے تو پھر کس گھر میں بنے گا اور کون سا گھر اس قابل ہے کہ جہاں اسلام کا قانون تیار کیا جائے۔

دنیا میں بنا ہوا قانون بگاڑا تو کسی گھر میں جا سکتا ہے مگر بنایا کہیں نہیں جا سکتا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ حلال کا پیغام لے کر آئے اور کوئی صاحب اسے حرام بنا دیں اور وہ حرام کا پیغام لے کر آئے اور کوئی صاحب اسے حلال بنا دیں۔ یہ توڑ پھوڑ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن قانونِ اسلام کوئی بنا دے یہ نہیں ہو سکتا۔ اب میں پھر وہ آیت یاد دلاؤں گا۔ وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ جو صداقت لے کر آیا ہے یعنی اسلام نبی کے گھر میں بنا نہیں ہے حضور پیغام لے کر آئے ہیں۔ سرکار نے پیغام پہونچایا ہے۔

اس لئے کہ جب کوئی قانون بنایا جاتا ہے تو بنانے والے کی فکر دیکھی جاتی ہے۔ بنانے والے کی عقل دیکھی جاتی ہے اس کا علم دیکھا جاتا ہے۔ اس کا کمال دیکھا جاتا ہے اور جب کوئی پیغام پہونچایا جاتا ہے تو پہونچانے والے کی سچائی دیکھی جاتی ہے

دنیا کے تجربات سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جب کسی ملک میں قانون ساز افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان میں پڑھے لکھے کتنے ہیں۔ ڈگری ہولڈر کتنے ہیں۔ انھوں نے سندیں کتنی حاصل کی ہیں۔

اِس لئے کہ قانون بنانے کے لئے علم چاہئے۔ قانون بنانے کے لئے فکر چاہئے قانون بنانے کے واسطے سمجھ چاہئے۔ سمجھدار تو ہیں چاہے جھوٹ بولیں چاہے سچ بولیں کوئی حرج نہیں ہے تو جہاں قانون بنایا جاتا ہے۔ وہاں فکر والے علم والے ہی تلاش کئے جاتے ہیں جاہل بے چارہ کیا بنائے گا۔ لیکن جہاں بات بنائی نہیں جاتی ہے بلکہ پہونچائی جاتی ہے وہاں چاہے کتنا ہی قابل ہو اسکی قابلیت کا کام نہیں ہوتا ہے۔ گویا کہ پیغام بنانے والے کے لئے علم دیکھا جاتا ہے اور پیغام پہونچانے والے کے لئے صداقت دیکھی جاتی ہے۔ اب آپ نے اندازہ کیا کہ اسلام نے صداقت پر اتنا زور کیوں دیا ہے۔ نبی کی صداقت کا اعلان کیوں کیا ہے۔ صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم کیوں دیا ہے تاکہ یہ احساس پیدا ہو جائے کہ جن کے ساتھ رہنا ہے ان کی زندگی کا معیار صداقت ہے۔ ان میں کوئی قانون بنانے والا نہیں ہے۔ سب قانون کے لانے والے اور بچانے والے ہیں۔ گویا ایک لفظ صداقت میں اسلام نے اپنے پیغام کو خدائی پیغام ثابت کر دیا کہ یہ پیغام الٰہی پیغام ہے۔ اس کے پہونچانے والے کے لئے صداقت درکار ہے۔ سچائی درکار ہے۔ یہ بات اور ہے کہ سچائی اور صداقت کے علاوہ وہ علم و فکر کے اعتبار سے بھی اِتنے باکمال ہیں کہ جہاں تک نہ کسی کا علم پہونچا نہ کسی کی فکر پہونچی اور اب کیا پہونچے گا۔ اب کوئی ان بلندیوں تک کیا جائے گا: اب تو کہنے والا کہہ کر چلا گیا یَنحَدِرُ عَنّی السَّیلُ وَ لَا یَرقیٰ اِلَیَّ الطَّیرُ علم کا سیلاب میرے بیانات سے بہہ کے نکلتا ہے وَ لَا یَرقیٰ اِلَیَّ الطَّیرُ اور کسی کا طائر فکر میری بلندیوں تک نہیں جا سکتا ہے بھلا کون ہے جو ان صداقت کی بلندیوں تک جائے گا تو اسلام کا خدا صادق، اسلام کا نبی صادق، اسلام کا پیغام قرآن صداقت، اسلام خود سراپا صداقت سراپا سچائی از اول تا آخر اسلام میں سوائے صداقت اور سچائی کے کچھ نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ خلیل خدا نے

اللہ کی بارگاہ میں دعا بھی کی کہ پروردگار جو خدمات میں نے تیری بارگاہ میں پیش کی ہیں تجھے تو معلوم ہیں کہ تیرا گھر بنایا ہے۔ اپنے بیٹے کو قربان کیا ہے۔ اب میں ایک بات چاہتا ہوں وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ پروردگار ان خدمات کے صلہ میں اگر یہ خدمتیں قابل قبول ہیں تو مجھے جنت کے وارثوں میں قرار دیدے۔

خلیل خداؑ کے بارے میں عالم اسلام کا عقیدہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے بعد افضل انبیاء ہیں یعنی سرکار کے بعد جو ایک کم ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں ان میں جناب آدمؑ کے مقابلہ میں افضل، جناب نوحؑ سے افضل، جناب موسیٰؑ سے بہتر، جناب عیسیٰؑ سے بہتر۔ گویا سرکار دو عالمؐ کے بعد افضل انبیاء اور افضل مرسلین جناب ابراہیمؑ اور جناب ابراہیمؑ جیسا پیغمبر دعا کر رہا ہے کہ پروردگار مجھے جنت کے وارثوں میں قرار دیدے۔ اے ابراہیمؑ اب آپ سے بالا تو ایک ہی آدمی بچا ہے۔ آپ سے بلند تر تو ایک ہی آدمی ہے تو آپ خدا سے دعا کریں کہ خدایا ان کا دوسرا مجھے بنا دے۔ ایک جنت کا وارث دیا ہے دوسرا جنت کا مالک مجھے انہیں کے ساتھ رکھ دے وہ مجھ سے افضل ہیں۔ ان کے اختیارات کچھ زیادہ ہوں گے میرے اختیارات کچھ دو چار فیصد کم ہوں گے لیکن مجھے انہیں کے ساتھ بنا دے لیکن یہ بھی نہیں کہا کہ مجھے وارث جنت بنا دے۔ خلیل کی دعا ہے وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ مجھے جنت کے وارثوں میں سے قرار دیدے۔ گویا خلیل خدا کی نگاہ میں جنت کا کوئی ایک وارث نہیں ہے کہ وہ ایک کے دوسرے ہو جائیں بلکہ جنت کے متعدد وارث ہیں اور میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انہیں میں سے قرار دیدے۔ اللہ وہ کون سے افراد ہیں؟ جب سرکار دو عالمؐ کے علاوہ ابراہیمؑ سے افضل کوئی نہیں ہے تو یہ "وارثوں" کون صاحب ہیں کہ جن میں سے ابراہیمؑ اپنے کو بھی شمار کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کو نہ اندازہ ہوگا کہ جب سرکار دو عالمؐ کے بعد جناب ابراہیمؑ ہیں تو اس آیت کے کیا معنی ہیں۔ اور یہ وارثان جنت کہاں سے آ گئے یہ کون افراد ہیں جو ابراہیمؑ سے پہلے جنت کے وارث ہو گئے کہ ان میں سے ایک یہ بھی ہو جائیں کسی کو نہ معلوم ہوتا اگر حضورؐ نے ایک جملہ نہ فرما دیا ہوتا اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی زہراؑ کا

کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ نہ آدمؑ اور نہ غیر آدمؑ۔ گویا کہ جہاں منزل خلیل ہے اس سے بالاتر بہت سے افراد ہیں تو اب خلیل کو کہنے کا حق ہے کہ خدایا وارثانِ جنت میں سے مجھے بھی قرار دیدے اور اگر نہ پہچانا ہو تو نبی کی لفظوں میں پہچان لو۔ سرکار نے اپنے کو سردار جنت نہیں کہا بلکہ فرمایا اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔ صلوات۔

اور لفظ یاد آگیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس لفظ کی بھی ایک جملہ میں وضاحت ہو جائے اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حسنؑ و حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں وَاَبُوْهُمَا اَفْضَلُ مِنْهُمَا اور ان کے باپ تو ان سے بھی بہتر ہیں۔ اب تو عدد پورا ہو گیا۔ عربی میں جمع کے صیغہ کے لئے تین چاہئیں۔ اردو میں تو دو کو بھی جمع کہتے ہیں لیکن عربی زبان میں تین افراد اگر اکٹھا ہو جائیں تو اس کو صیغۂ جمع کہا جاتا ہے۔ ورثہ صیغۂ جمع ہے یعنی وارثوں میں سے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ دس ہیں بارہ ہیں، پندرہ ہیں۔ کم سے کم تین تو ہونے ہی چاہئیں تاکہ ابراہیمؑ کہیں خدایا مجھے وارثوں میں سے قرار دیدے۔ تو سرکار نے کہا کہ یہ سردار وہ سردار اور وہ ان سے بھی افضل۔ تو مجھے الگ کرنے کے بعد بھی وارثان جنت موجود ہیں اور خلیل خدا دعا کر رہے ہیں کہ خدایا مجھے وارثانِ جنت میں سے قرار دیدے مگر یہ تو آخرت کا مسئلہ ہے وارث تو وہاں بنیں گے۔ دنیا میں خلیل کیا چاہتے ہیں وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ پروردگار اور آنے والے زمانہ میں میرے واسطے ایک لسان صدق قرار دیدے۔ آخرت میں وراثتِ جنت اور دنیا میں لسان صدق۔ خدا نے ابراہیمؑ کی دعا کو قبول کر لیا آواز آئی وَجَعَلْنَا لَهٗ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ابراہیمؑ تم زبان صداقت مانگ رہے تھے تم لسانِ صدق مانگ رہے تھے۔ ہم نے ان کے واسطے لسان صدق علیؑ کو قرار دے دیا ہے۔ اب چاہے علی صفت ہو چاہے علی نام ہو، یہ تو مفسرین طے کریں گے میں تو خالی قرآن کی لفظوں کو دہرا رہا ہوں۔ ابراہیمؑ کی دعا قبول ہو گئی اور لسان صدق علیؑ ہے۔

صلوات۔

بس عزیزو! .... گفتگو بہت مفصّل تھی اور ابھی تو میں نے صدق کے

فضائل و کمالات کا ذکر بھی نہیں شروع کیا۔ روایات ہی میں صداقت اور سچائی کے اٹھارہ فضائل اور کمالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر ان سارے صفات کے بیان کرنے کا وقت نہیں رہ گیا ہے صرف ایک بات عرض کرنا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں صداقت اتنی اہم ہے کہ اسلام کا خدا صادق، اسلام کا پیغام صادق، اسلام کے راہنما صادقین، اسلام کا پورا نظام صداقت ہے اور چونکہ اسلام کا دار و مدار صداقت پر ہے کہ صداقت نہیں تو خدا خدا نہیں سچائی نہیں تو نبی نبی نہیں۔ صداقت نہیں تو قرآن قرآن نہیں۔ سچائی نہیں تو اسلام اسلام نہیں صداقت نہ ہو تو رہنما رہنما نہیں۔ تو شاید یہی راز تھا کہ اسلام نے ہر برائی کو برداشت کر لیا مگر جھوٹ کو برداشت نہیں کیا۔ پتھر مارے گئے حضورؐ کو مگر حضورؐ نے بد دعا نہ کی کانٹے بچھائے گئے راستے میں مگر حضورؐ نے بد دعا نہ کی۔ مجنون کہا گیا مگر بد دعا نہ کی۔ جادوگر کہا گیا مگر بد دعا نہ کی۔ حد یہ ہے کہ بڑھیا نے کوڑا پھینک دیا مگر بد دعا نہ کی۔ لوگوں نے کیا نہیں کہا اور کیا کیا برتاؤ نہ کیا مگر حضورؐ برداشت کرتے رہے اور بد دعا کے لئے تیار نہ ہوئے مگر جب سچ کو جھوٹ بنایا گیا۔ جب صداقت کے مقابلے میں جھوٹ بولنے کا لوگوں نے ارادہ کیا تو اب یہ بات مزاج اسلامی پر اتنی بھاری ہو گئی کہ پروردگار نے کہا میرے حبیب اگر یہ سچ کے مقابلہ میں جھوٹ لائیں گے تو ہم سچ کے سامنے جھوٹ کو برداشت نہ کریں گے ان سے کہہ دو کہ اپنے بچوں کو بھی لاؤ، اپنی عورتوں کو بھی لاؤ، اپنے نفسوں کو بھی لاؤ۔ اب بد دعا کرنے کا وقت آ گیا ہے ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ آؤ سب مل کر جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔ جھوٹ اسلام کی نگاہ میں اتنا بد ترین کام ہے کہ جس کے واسطے سرکار دو عالمؐ سر میدان آنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے بعد کسی مسلمان میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہو۔ اس کے بعد کسی شریف انسان میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ پیدا ہو تو یہ تو ایک قانون عام ہے فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ آؤ سب مل کر جھوٹوں پہ اللہ کی لعنت قرار دیں۔ اب یہ مباہلہ کے تذکرہ کا موقع نہیں ہے لیکن ایک لفظ یاد دلا دوں جس کی تفصیل پہلے مباہلہ کے موقع پر گذارش کر چکا ہوں کہ

مقابلہ ہے سرکارؐ دوعالم میں اور نجران کے عیسائیوں میں۔ وہ کہتے ہیں ہم سچے ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہم سچے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہمارا پیغام صدق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے ہیں۔ عیسیٰ اللہ کے بندے نہیں ہیں بلکہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ تو مقابلہ تو دو آدمیوں کا ہو رہا ہے کہنا تو یہی چاہئے تھا کہ آؤ میدان میں آجاؤ ہم تمہارے حق میں بددعا کریں اور تم ہمارے حق میں بددعا کرو۔ ہم تم پر لعنت کریں اور جو تمہاری سمجھ میں آئے تم کرو جو مستحق ہوگا خود ہی فنا ہو جائے گا۔ مگر نہ ہم نہ تم۔ نہ ہم تمہیں کچھ کہیں اور نہ تم ہمیں کچھ کہو۔ ان جھگڑوں سے کیا فائدہ۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ سب مل کے جھوٹوں پر لعنت کریں۔ اب لعنت خود ہی ڈھونڈھے گی کہ اس کے حقدار کہاں ہیں؟ اگر رحمت اپنے حقدار کو ڈھونڈ لیتی ہے کہ جس ملک میں بھی بیٹھ کر آدمی صلوات بھیجتا ہے تو یہ صلوات وہاں تک جاتی ہے ـــــــــ جب آپ نے کہا خدایا محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما تو ظاہر ہے کہ یہ رحمت اپنے حقدار کو ڈھونڈھ لیتی ہو۔ اور جب تلاش کرنے کو نکلتی ہے تو آدمی زمین کے اوپر ہو یا زمین کے اندر ہو یہ بہر حال ڈھونڈھ لیتی ہے۔ تو جیسے رحمت اپنے مستحق کو ڈھونڈھ لیتی ہے اب لعنت بھی اپنے حقدار کو تلاش کرے گی جہاں مستحق مل جائے گا وہ خود ہی پہونچ جائے گی۔ سارے میزائل زمین کے اوپر کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا اسلحہ ہے جو زمین کے اندر بھی پہونچ جاتا ہے۔ انسان کتنی اچھی جگہ پر جا کے کیوں نہ چھپ جائے لعنت سے نہیں بچ سکتا ہے۔ صلوات۔

دین خدا ہر مصیبت کو برداشت کر سکتا ہے مگر دین خدا جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہی صداقت اور سچائی اور یہی جھوٹ اور غلط بیانی کا معرکہ کربلا کہا جاتا ہے کہ ایک طرف صداقت کے پیکر، سچائی کے مرقع اور مجسّمے تھے اور دوسری طرف جھوٹ کذب غلط بیانی کے پتلے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ سرکار دوعالمؐ نے جب صدق و کذب کے معرکہ کو سر کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تلوار کا معرکہ ہوتا تو صرف بہادر آتے، سورما آتے، سادات آتے۔ تلوار چلانے والے آتے، تیغ آزما آتے مگر چونکہ یہ صداقت کا معرکہ ہے لہٰذا یہاں عورتیں

بھی آئیں گی۔ یہاں انگلی پکڑ کے چلنے والے بچّے بھی آئیں گے۔ یہاں گود میں اٹھایا جانے والا بچّہ بھی آئے گا۔ سرکار نے واضح کردیا کہ صدق و کذب کا معرکہ ہو رہا ہے تو اس معرکہ میں تنہا مرد نہیں ہوتے عورتیں بھی ہوتی ہیں تنہا بڑے نہیں ہوتے بچّے بھی ہوتے ہیں۔ تنہا اپنے پیروں پر چلنے والے نہیں ہوتے ہیں گودیوں میں جانے والے بھی ہوتے ہیں۔ کربلا کا معرکہ صداقت اور غلط بیانی کا معرکہ ہے۔ صدق اور کذب کی جنگ ہے تو یہاں بھی مباہلہ کی تاریخ دہرائی جائے گی لہٰذا اب جب حسینؑ جائیں گے میدان میں تو جیسے نانا گئے تھے ویسے ہی نواسہ بھی اٹھے گا۔ اگر نانا میری مادر گرامی زہراؑ کو لے کر گئے تھے تو میں ایک ثانی زہراؑ کو لے کر اٹھوں گا۔ اگر وہ حیدر کرار کو لے کر اٹھے تھے تو میں بھی ایک ثانی حیدرؑ کو لے کر جاؤں گا۔ اگر وہ بھیا حسنؑ کی انگلی پکڑ کر چلے تھے تو میں بھی ایک وارث حسنؑ کو لے کر جاؤں گا اور اگر وہ مجھے گودی میں لے کر چلے تھے تو میں بھی معرکۂ صدق و کذب اور معرکۂ حق و باطل میں کسی کو گودی لے کر جاؤں گا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ یہ تلواروں کی لڑائی نہیں ہے، یہ طاقتوں کا معرکہ نہیں ہے یہ صدق و کذب اور حق و باطل کا معرکہ ہے جہاں بچّے بھی ویسے ہی میدان میں دکھائی دیتے ہیں جیسے بزرگ نظر آتے ہیں۔ بلکہ عزیزو اگر جسارت نہ ہوتی تو میں ایک لفظ کہتا کہ معرکۂ حق و صداقت میں جہاں بڑے ہیں وہیں بچے بھی ہیں اور ہم نے تو مباہلہ میں یہ عجیب منظر بھی دیکھا ہے کہ بڑے بزرگ پیچھے ہیں اور بچّے آگے آگئے ہیں۔ مباہلہ نے یہ تاریخ طے کردی کہ جب صدق و حقانیت کا مقابلہ باطل اور غلط بیانی کذب سے ہوتا ہے تو بچّے آگے میدان میں چلتے ہیں اور بزرگ پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگر آپ مقتل کربلا دیکھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جب حق کی راہ میں قربانیوں کا وقت آیا تو بچے میدان جہاد میں آگے آگے رہے اور بزرگوں کی باری بعد میں آئی اور اسکی تیاری اسطرح ہوئی کہ وہ عاشور کی رات جب اصحاب کے خیموں میں انصار کی خواتین، کربلا کی عام بیبیاں اپنے بچوں کو قربانی کے لئے تیار کر رہی تھیں تو جس کا مانجایا نرغۂ اعداء میں تھا جس کا بھائی نرغۂ اعداء میں گھرا ہوا تھا وہ بھی خاموش نہیں تھیں۔ بلکہ آپ برابر سنتے رہتے ہیں کہ عاشور کی رات ثانی زہراؑ اپنی

گود کے پالوں کو سامنے بٹھا کے فرما رہی تھیں۔ میرے بچو! میرے لال تم کو بھی میں نے ہی پالا ہے اور علی اکبرؑ کو بھی میں نے ہی پالا ہے۔ اسی گود میں تم بھی پلے ہو اور میرا اکبرؑ بھی پلا ہے مگر علی اکبرؑ میرے بھیّا کا لال ہے میرے نانا نبی کا فرزند ہے۔ میرے نانا کی شبیہہ ہے میرے بابا کی یادگار ہے اور تم میرے لال ہو۔ میری گود کے پالے ہو۔ خبردار جب وقتِ جنگ آجائے تو اکبرؑ نہ جانے پائیں۔ تم قربان ہو جانا۔ بھیّا حسنؑ کی یادگار قاسمؑ نہ جانے پائے۔ تم پہلے چلے جانا اور تمہیں پہلے جنگ کرنے میں کیا تکلف ہے۔ تمہیں تو شجاعت ہر طرف سے ترکہ میں ملی ہے۔ تمہارے دادا کا نام ہے جعفر طیارؑ اور تمہارے نانا کا نام ہے حیدرِ کرار تم میدان میں نہ لڑو گے تو کون لڑے گا۔ بیٹا دیکھو جب میدان کارزار گرم ہو جائے تو یوں میدان میں تلوار چلانا کہ۔

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
خود بول اٹھیں کہ نواسے علیؑ کے ہیں

اجرکم علی اللہ۔ خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غم آل محمدؐ کے۔ یہ ثانی زہراؑ کا حوصلۂ قربانی ہے مگر بات نامکمل رہ جائے گی۔ اور حق تلفی ہوگی۔ اگر اس مقام پر ثانی زہراؑ کے ساتھ ان کے ہمسر کے جذبۂ قربانی کا ذکر نہ کیا جائے۔ جب عبداللہ بن جعفرؑ کو امام حسینؑ نے روک دیا کہ بھیا آپ نہیں جائیں گے۔ آپ یہیں رہیں گے۔

کچھ افراد تھے جن کو امام حسینؑ اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ یہ امامت کی مصلحت تھی محمد حنیفہ کو روک دیا۔ عبداللہ بن جعفر کو روک دیا۔ تم نہیں جاؤ گے باقی قافلہ جائے گا۔ جب چلنے کا وقت آیا اور ثانی زہراؑ تیار ہوئیں بھائی کے ساتھ جانے کے لئے تو یہ خانۂ رسالت کا ادب تھا۔ کہا بہن میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔ اسلام کو تمہاری ضرورت ہے میرے پیغام کو تمہاری ضرورت ہے۔ مگر بہن تم پر تمہارے شوہر عبداللہ کا بھی حق ہے جاؤ ان سے بھی رخصت ہو کے آؤ۔ ثانی زہراؑ آئیں عبداللہ بن جعفرؑ کے سامنے مگر آج عبداللہ بن جعفرؑ نے عجب منظر دیکھا کہ چہرہ اداس ہے۔ پریشانی کے آثار ظاہر ہیں۔ کہا دخترِ زہراؑ

بنت علیؑ! آپ اتنا پریشان کیوں ہیں۔ چہرے پر اداسی کیوں ہے۔ یہ پریشانی کا عالم کیا ہے کہا عبداللہ آپ نے تو سنا ہوگا کہ میرا بھیا جا رہا ہے۔ میرا ماں جایا وطن چھوڑ کے رخصت ہو رہا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ زینبؑ نے کبھی اپنے بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن آج جب میں بھیا کے پاس گئی اور میں نے گذارش کی کہ مجھے بھی آپ اپنے ساتھ لے کے چلیں تو فرمایا کہ پہلے جا کے عبداللہ سے رخصت ہو کر آؤ۔ جناب عبداللہ نے کہا ثانیٔ زہرا جب مولا آپ کو لے جانے کے لئے تیار ہیں۔ تو میں کون روکنے والا۔ مگر مجھے مولا کی گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس قافلہ کا مستقبل مصائب کے علاوہ کچھ نہیں ہے اگر مولا مجھے نہیں لے جا رہے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مصیبت کا وقت آ جائے اور میری طرف سے کوئی فدیہ نہ ہو۔ اے دختر زہراؑ آپ جا رہی ہیں تو میرے بچوں کو ساتھ لیتی جایئے اور اس کا خیال رکھئے گا کہ اگر آقا پر کوئی وقت آ جائے تو پہلے میرے بچوں کو قربان کر دیجئے گا۔ عزیزو! وہ عبداللہ کا حوصلۂ قربانی تھا یہ ثانیٔ زہراؑ کا جذبۂ قربانی ہے کہ عاشورہ کی رات مسلسل بچوں کو تلقین جہاد کی۔ حوصلۂ جہاد کو بلند تر بنایا یہاں تک کہ جب قربانی کا وقت آ گیا تو فرمایا جاؤ جا کر مولا سے اجازت لو شہزادے مولا کے سامنے آئے۔ دست ادب جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ آقا اب مرنے کی اجازت دے دیجئے۔ انصار تو کام آ چکے۔ اصحاب تو کام آ چکے چاہنے والے سب قربان ہو گئے۔ اب ہم کو بھی اجازت دیدیجئے۔ ہم بھی جا کے میدان میں آپ کے قدموں پر اپنا سر قربان کر دیں۔ حسینؑ سر جھکائے خاموش ہیں۔ کسی پر خدا نہ کرے کہ ایسا وقت پڑ جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے جب مرنے کی رضا لینے آئیں اور ایسے میدان میں جانا چاہیں جہاں تیس ہزار تلواریں ہوں۔ جہاں اتنا بڑا نرغۂ اعداء ہو وہاں کوئی انسان بچوں کو میدان میں بھیجنے کے لئے کیسے تیار ہو جائے گا۔ اگر یہ اسلام کا معاملہ نہ ہوتا تو خدا جانتا ہے کہ کوئی اپنی اولاد کو قربان نہیں کر سکتا تھا مگر امام حسینؑ کی نگاہ میں اور ثانیٔ زہراؑ کی نگاہ میں اسلام اتنا عزیز تھا کہ اس راہ میں ہر قربانی دی جا سکتی ہے۔ آ کے دیکھا کہ ماموں کوئی جواب نہیں دیتے ہیں مولا کچھ بولتے نہیں ہیں۔ پلٹ کے آ گئے اماں ہم نے جا کے ماموں سے گذارش کی مگر آقا

کچھ فرماتے نہیں ہیں. ثانی زہراؑ آگئیں سامنے۔ آکے کھڑی ہوگئیں۔ امام حسینؑ نے بہن کے چہرے کو دیکھا کہا بہن خیر تو ہے کچھ کہنا چاہتی ہو عرض کی بھیا یقیناً کچھ کہنا چاہتی ہوں اور اس اعتماد کے ساتھ کہ پوری زندگی کا تجربہ ہے کہ آج تک آپ نے زینب کی کسی بات کو ٹالا نہیں ہے۔ آپ نے میری کسی خواہش کو ٹھکرایا نہیں ہے اور مجھے اعتماد ہے کہ آج بھی آپ میری بات کو ٹالیں گے نہیں۔ کہا زینبؑ یہ کوئی بات ہے کہ تم کوئی بات کہو اور حسینؑ نہ مانے تمہاری بات کو حسینؑ ٹھکرا دے یہ ناممکن ہے کہو کہنا کیا چاہتی ہو کہا بھیا اگر میری بات کو نہیں ٹھکرایا جاسکتا ہے تو میری ایک خواہش ہے کہ ان بچوں کو مرنے کی اجازت دے دیجئے ہائے اب حسینؑ جواب دیں۔ کہا بہن آج تو قربانی کا دن ہے۔ آج تو سب ہی کو قربان ہونا ہے یہ کہہ کے فرمایا آؤ بچو آؤ۔ مولا نے اپنے ہاتھوں سے آراستہ کیا۔ ماں نے بچوں کو دعائیں دیں اور یہ کہہ کے بھیجا کہ بچو جاؤ راہ خدا میں جہاد کرو، زخم کھاؤ جان دے دو، خون میں نہاؤ مگر خبردار دریا کا رخ نہ کرنا۔ فرات کے پانی پر نگاہ نہ ڈالنا۔ دیکھو خیمہ میں چھ مہینے کا اصغرؑ پیاسا ہے، دیکھو کمسن سکینہؑ پیاسی ہے۔ بس رونے والو! بچے میدان میں آئے جہاد شروع کیا ادھر عونؑ کے حملے، اُدھر محمدؑ کا جہاد۔ ایک طرف حسینؑ حوصلے بڑھا رہے ہیں دوسری طرف عباسؑ داد شجاعت دے رہے ہیں۔ شاباش شیرو شاباش۔ تم نے اپنے استاد کے فن کی لاج رکھ لی۔ شاباش بیٹو شاباش تم نے وراثت کا حق ادا کر دیا۔ دونوں مصروف جہاد رہے اور زینبؑ اپنے لال کے جہاد کے نتیجہ کا انتظار کرتی رہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب زخموں سے چور ہو کے گھوڑے سے گرنے لگے تو آواز دی یا مولاہ ادرکنی۔ مولا آئیے اب غلاموں کی خبر لیجئے۔ حسینؑ نے کہا بھیا عباسؑ چلو۔ چلو میرے بھیا چلو۔ بس سنو عزیزو! آخری جملہ، بہت روئیں گے۔ آپ شبیہہ تابوت کی زیارت سے پہلے۔ یہ ایک فقرہ سن لیں۔ چلو بھیا، چلو عباسؑ چلے حسینؑ چلے مقتل میں آئے۔ اب جو پلٹ کے چلے تو ایک لاشہ کو حسینؑ اٹھائے ہوئے، ایک جنازہ کو عباسؑ لئے ہوئے۔ صحن خیمہ میں لائے جنازہ لا کر رکھ دیا۔ فضہ دوڑ کر آئیں۔ بی بی چلئے آپ کے لال آئے ہیں۔ شہزادی چلئے آپ کے لال

آئے ہیں۔ ثانی زہراؑ نے سر جھکا لیا میں نہ جاؤں گی میں کیا دیکھنے جاؤں۔ میں نے ان کو واپس آنے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔ میدان سے کیسے واپس آگئے۔ کہا بی بی چل کے دیکھ تو لیجئے اب جو آکے دیکھا تو ادھر عونؑ کا لاشہ، اُدھر محمدؑ کا جنازہ۔ زینبؑ نے سر سجدۂ شکر میں رکھ دیا خدایا تیرا شکر کہ میرے بچے میرے ماں جائے پر قربان ہو گئے ہیں۔ میرے شیر و تم نے ماں کی لاج رکھ لی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْن

□□

P-16

مجلس ۷

تواضع و تکبر

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

نٓ۔ قسم ہے قلم اور تحریروں کی۔ پیغمبر آپ اپنے پروردگار کی نعمت کی بنیاد پر مجنون نہیں ہیں آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون اور دیوانہ کون ہے۔۔

آج جو باتیں انسانی زندگی کے کردار و صفات سے متعلق گذارش کرنا ہیں ان میں ایک صفت کا نام ہے تواضع جو بہترین صفت ہے اور ایک صفت کا نام ہے تکبّر جو بدترین صفت ہے کل میں نے انسانی صفات کے ذیل میں صدق و کذب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو صفتیں واقعاً انسان کے نفس ہی سے متعلق ہیں لیکن ان کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوتا ہے اور آج جن دو صفتوں کا تذکرہ کر رہا ہوں ان کا تعلّق بھی انسان کے نفس اور اس کی روح سے ہے لیکن ان کا اظہار کسی ایک عضو اور جزو بدن سے نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کا اظہار انسان کے پورے وجود سے ہوتا ہے۔ تنہا زبان سے انکسار کے اظہار کا مطلب تواضع نہیں ہے۔ جس انسان میں تواضع، انکساری اور خاکساری پائی جاتی ہے۔ اس کا پورا وجود گواہی دیتا ہے کہ اس انسان کے وجود میں تواضع ہے اور جس انسان کی زندگی میں تکبّر اور غرور پایا جاتا ہے اس کا اظہار بھی مختلف انداز سے ہوتا ہے۔ کبھی نگاہوں سے

ہوتا ہے کبھی سر کے اونچے ہونے سے ہوتا ہے۔ کبھی زمین پر چلنے سے ہوتا ہے کبھی ہاتھوں کے اٹھنے سے ہوتا ہے یعنی پورا وجود انسانی تکبر کا ویسے ہی اعلان کرتا ہے جس طرح پورا وجود انسان کے تواضع کا اعلان کرتا ہے۔

میں اپنے بچوں کے ذہنوں کو قریب ترلانے کے لیے ایک لفظ کل کی تقریر سے متعلق گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ میری بات واضح ہو جائے کہ جن صفات کا تذکرہ میں ان مجالس میں کر رہا ہوں ان کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں ہے۔ ان سب کا تعلق انسان کے باطن سے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اظہار کے ذرائع الگ الگ ہیں۔ صدق و کذب کا کمال یا اس کا عیب زبان سے ظاہر ہوتا ہے۔ تواضع اور تکبر کا حسن اور اس کا عیب انسان کے پورے وجود سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ سب ظہور کے ذرائع ہیں اصل صفت باہر نہیں رہتی ہے صفت اندر ہی رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سچائی اور جھوٹ کا تعلق اگرچہ انسان کی زبان سے ہے کہ جو بات زبان سے نکلتی ہے اگر حقیقت کے مطابق ہے تو اسے سچ کہا جاتا ہے اور اگر حقیقت کے خلاف ہے تو اسے جھوٹ کہا جاتا ہے لیکن مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے بلکہ یہاں بھی انسان کے نفس، اسکی روح اور اسکی عقل کا دخل ہے جس کا بہترین گواہ خود قرآن مجید ہے۔ اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ اے میرے حبیب یہ منافقین آپکے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ اور خدا پہلے ہی سے جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں یعنی ان کی بات حقیقت کے مطابق ہے ان کی بات واقع کے مطابق ہے لیکن اس کے باوجود وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ۔ اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔

ہم نے تو جھوٹ کے بارے میں صرف اتنا پڑھا تھا کہ جو بات کہی جائے اگر حقیقت کے مطابق ہو تو سچ ہے اور اگر حقیقت کے خلاف ہو تو جھوٹ ہے لیکن منافقین کہتے ہیں إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ۔ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور خدا کہتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ تو کیا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟

سورۂ منافقون تو آپ سنتے ہی رہتے ہیں اور منافقوں کو پہچانتے بھی ہیں لیکن اس نکتہ کو پہچانیں۔ جو قرآن مجید نے استعمال کیا ہے کہ ایک طرف پروردگار ان کے بیان کی تائید کرتا ہے کہ اگر یہ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو یہ خدا بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں یعنی ان کی بات بالکل صحیح ہے اور اس کے بعد کہتا ہے مگر ہم اس بات کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ بات صحیح ہے لیکن یہ جھوٹے ہیں۔ تو کیا جھوٹ کی کوئی نئی تعریف ہے کہ ایک آدمی دو اور دو چار کہتا ہے تو اسکی بات تو صحیح ہے مگر وہ آدمی جھوٹا ہے۔ آخر سچ اور جھوٹ کا تعلق تو انسان کے بیان ہی سے ہے کہ بیان مطابق واقع ہے تو سچ ہے اور بیان واقع کے خلاف ہے تو جھوٹ ہے۔ اب اس کا کیا مطلب ہے کہ خدا کہتا ہے کہ جو بیان ہے وہ تو واقع کے مطابق ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

علماء ادب اور علماء تفسیر کے درمیان یہ ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ ساری دنیا کے لغت اور ہر زبان میں یہ بات طے شدہ ہے کہ بات حقیقت کے مطابق ہو تو سچ ہے ورنہ جھوٹ ہے تو کیا قرآن کوئی نیا لغت بنانے کے لئے آیا ہے کوئی نئی زبان ایجاد کرنے کے لیے آیا ہے وہ تو خود ہی اعلان کرتا ہے اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے۔ تو جو قرآن عربی میں آیا ہے اُسے عربی زبان کے مطابق گفتگو کرنا چاہئے۔ یہ نئی زبان کہاں سے آگئی کہ بات صحیح ہے لیکن آدمی جھوٹا ہے۔

درحقیقت یہ میری اس بات کی تصدیق ہے کہ سچ اور جھوٹ کا تعلق اگرچہ زبان سے ہوتا ہے مگر یہ صفت اندر بھی پائی جاتی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اگر بات یہ ہوتی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو بات صحیح تھی اور آدمی سچا تھا لیکن بات یہ ہے کہ نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

مسلمان جب گواہی دیتا ہے کہ پیغمبرؐ اللہ کے رسول ہیں۔ تو کیا یہ گواہی صرف مسلمان کی زبان پر ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ ہمارے دل میں بھی ہے تو جب ہم نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ تو گویا ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

یعنی یہ عقیدۂ رسالت ہمارے دل میں بھی ہے اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللهِ ہم گواہی دیتے ہیں کہ علی اللہ کے ولی ہیں یعنی ولایت کا عقیدہ ہمارے دل میں بھی ہے۔ نَشْهَدُ کے معنی ہی یہ ہیں کہ بات دل کے اندر ہے۔ اب اللہ کا کہنا ہے کہ اگر انھوں نے آپ کو رسول کہا ہوتا تو بات صحیح تھی اور یہ سچے تھے لیکن انھوں نے رسول نہیں کہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی آپ کی رسالت کی آڑ میں اپنے کو صاحب عقیدہ بنانا چاہتے ہیں اور اپنے کو مومن کہنا چاہتے ہیں اور ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ الفاظ کتنے ہی صحیح کیوں نہ ہوں یہ منافقین بہرحال جھوٹے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں دو خبریں پائی جاتی ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ آپ رسول ہیں اور ایک خبر یہ ہے کہ یہ عقیدہ ہمارے دل میں ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پروردگار نے فرمایا کہ پہلے مرحلہ میں یہ ٹھیک ہیں لہٰذا ہم بھی کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن دوسرے مرحلہ میں یہ جھوٹے ہیں اور چونکہ ان کے جھوٹ کا تعلق ان کی گواہی سے ہے پیغمبرؐ کی رسالت سے نہیں ہے لہٰذا جھوٹ کا اعلان کر دیا گیا اور گواہی کو گواہی سے ٹکرا دیا گیا وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ خدا بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ "وَاللّٰهُ يَقُوْلُ" خدا کہتا ہے کہ جھوٹے ہیں نہیں ایک گواہی ان کی ہے اور ایک گواہی ہماری ہے۔ پہلی بات پر دونوں کا اتفاق ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ رسول ہیں اور ہم بھی کہتے ہیں کہ آپ رسول ہیں لیکن گواہی میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ گواہی دیتے ہیں کہ ہم رسالت کے قائل ہیں اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ زبان پر کلمۂ رسالت ہے مگر دل میں عقیدہ نہیں ہے تو اب اندازہ ہو گیا کہ جب بھی زبان پر کوئی فقرہ آئے تو اگر دل میں وسعت نہیں ہے تو آدمی جھوٹا ہو گا۔ اگر کوئی آدمی خدا کو ایک کہتا ہے مگر دل میں وحدانیت کا عقیدہ نہیں ہے تو خدا کو ایک کہہ کے بھی جھوٹا ہے۔ اگر کوئی پیغمبر کو رسول کہتا ہے مگر دل سے نبی نہیں مانتا ہے تو سچی بات کہہ کے بھی جھوٹا ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ آپ مولا ہیں مگر دل میں مولائیت کا عقیدہ نہ ہو تو بات سچی رہے گی مگر آدمی جھوٹا ہو جائے گا۔ (صلوات)

یہ بات میں نے کل کی گفتگو کے تتمہ کے طور پر گذارش کی ہے اور اسی سے آج کے مطلب کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح صدق و کذب کا اظہار انسان کی زبان سے ہوتا ہے مگر واقعی

انسان کے اندر پائی جاتی ہے اسی طرح تواضع اور انکسار یا تکبّر اور غرور کا اظہار بھی اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے مگر واقعاً یہ جذبہ انسان کے اندر ہوتا ہے اور اسلام کی نگاہ میں غرور اور تکبّر بدترین صفت ہے جس طرح کہ تواضع بہترین صفت ہے۔

اور اتنی بہترین صفت ہے کہ پروردگار عالم نے جس مخلوق کو اشرف مخلوقات بنایا ہے اس کا تخلیقی مادہ بھی ایسا قرار دیا ہے کہ اس میں تواضع کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ پروردگار عالم نے ملائکہ کو بنایا تو مٹی سے نہیں بنایا۔ جنات کو بنایا تو خاک سے نہیں بنایا یہاں تک کہ ابلیس نے بھی کہہ دیا کہ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ مجھے آگ سے بنایا ہے اور آگ کا وجود بالاتر ہے تو جس سے ملک کو بنایا وہ مادّہ بھی انسانی مادّہ سے بہتر ہے اور جس سے جنّات کو بنایا وہ میٹیریل بھی انسانی میٹیریل سے بہتر ہے مگر جب انسان کو مٹی سے بنا دیا تو آواز دی لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ہم نے بنی آدم کو مکرّم قرار دیا ہے وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّا خَلَقْنَا تَفْضِيلًا اور ہم نے بنی آدم کو افضل مخلوقات بنا دیا ہے۔ تو خدایا اگر اسے افضل مخلوقات بنانا تھا تو کیا کوئی افضل مادہ نہیں تھا جو آگ سے بہتر ہوتا، نور سے بہتر ہوتا، روح سے بہتر ہوتا ہر شے سے بہتر ہوتا۔ بہتر کو بہتر مادہ سے بنانا کمزور مادہ سے کیوں بنا دیا۔ مٹی تو عناصر میں بھی سب سے پست ہے۔ ہمارے یہاں چار عناصر مشہور ہیں۔ آگ پانی مٹی ہوا۔ اور ان چاروں کا حساب لگائیے تو آگ رہتی ہے زمین کے اوپر۔

پانی رہتا ہے زمین کے اوپر، ہوا رہتی ہے زمین کے اوپر، سب سے نیچے مٹی ہے۔ آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ یعنی سب سے معمولی مادہ ہے مٹی۔ آگ کے مقابلے میں بھی پست، پانی کے مقابلے میں بھی پست، ہوا کے مقابلے میں بھی پست مگر پروردگار عالم نے جب اشرف مخلوقات کو بنانا چاہا تو نہ ہوا سے بنایا۔ نہ پانی سے بنایا اور نہ آگ سے بنایا۔ بنایا تو مٹی سے بنایا اِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ طِينٍ میں ایک بشر بنانے والا ہوں خاک سے مٹی سے۔ پروردگار جب اشرف کو بنانا تھا تو کسی اشرف سے بنایا ہوتا۔ یہ مٹی سے بنا کے کیوں کہتا ہے کہ یہ اشرف ہے۔ اب جنھیں ہوا سے بنایا ہے وہ اکڑ جائیں گے کہ یہ کیسے اشرف ہو گیا جو پانی سے بنے گا وہ اکڑ جائے گا اور جو آگ سے بنے گا وہ بھی اکڑ جائے گا کہ یہ کیسے افضل ہو گیا مگر پروردگار کہتا ہے کہ تم نہیں جانتے افضلیت کا

معیار کیا ہے۔ ہماری نگاہ میں خاکساری ہے۔ بہتر کوئی کمال نہیں ہے اور خاکساری اسی وقت پیدا ہو گی جب خاک سے بنایا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ابلیس کو یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم آگ سے ہیں ویسے ہی اکڑ گیا اور دماغ خراب ہو گیا یعنی جب مادہ اونچا ہوتا ہے تو غرور کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اُس مادّہ سے بنایا جس کی فطرت ہی خاکساری ہے تاکہ اس میں فطرتاً ہی سے تواضع پیدا ہو جائے۔ اب اگر یہ انسان بھی اکڑ جائے تو اس سے زیادہ ذلیل کوئی نہ ہوگا۔ اسی لیے میرے مولا نے ایک عجیب و غریب جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ انسان کو غرور کس بات کا ہے مالِابن آدمَ وَالکِبرَ یہ آدمؑ کے بیٹے میں کس بات کا غرور ہے۔ یہ کس بات پر اکڑ رہا ہے اس نے اپنے وجود کو نہیں پہچانا ہے "اَوَّلُہُ نُطفَۃٌ قَذِرَۃٌ وَّاٰخِرُہُ جِیفَۃٌ نَتِنَۃٌ" شروع وہاں سے ہوا ہے جو قابل ذکر بھی نہیں تھا یا اس کا ذکر بھی تہذیب مجلس کے خلاف ہے اور آخر میں جب زندگی ختم ہو گئی تو ایسا مردار ہو گیا کہ چاہنے والے بھی قریب نہ آئیں۔ وہ ابتدا بھی نجس اور یہ انتہا بھی نجس وہ ابتدا بھی ناقابل ذکر اور یہ انتہا بھی ناقابل ذکر۔ مگر انھیں دونوں حدوں کو بھول کر انسان اکڑ رہا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ طاؤس، مور جب اپنے پَروں کو دیکھتا ہے تو بھول کر اکڑ جاتا ہے اور جیسے ہی اکڑ کر پَروں کو پھیلایا اور سر جھکا کر اپنے پیروں کو دیکھا کہ ان پروں کا سارا بوجھ ان پیروں پر ڈالا گیا ہے تو شرمندہ ہو گیا۔ گویا مور میں کم سے کم اتنی صفت پائی جاتی ہے کہ اپنے کمزور پہلو کو دیکھتا ہے تو اس کا احساس کرتا ہے مگر یہ بشر اس قدر نالائق ہے کہ درمیان ہی سے اکڑتا جا رہا ہے نہ اوّل کو دیکھتا ہے اور نہ آخر کو دیکھتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بشر کی اس خباثت پر تنقید کرنے والے مولا نے نہج البلاغۃ میں مور کی تعریف میں پورا ایک خطبہ ارشاد فرما دیا ہے (صلوات)۔

تاکہ انسان میں پروں کا غرور نہ پیدا ہو اور وہ اپنے پیروں کو بھی دیکھتا رہے۔ ابتدا بھی نگاہ میں رہے اور انتہا بھی نگاہ میں رہے۔ ابتدا بھی ناقابلِ ذکر اور انتہا بھی ناقابلِ برداشت۔ انسان کس بات پر اکڑے گا۔ عالمِ انسانیت میں واقعاً کسی کو غرور کا حق ہو سکتا ہے اور واقعاً کسی کو یہ حق تھا کہ سر اٹھا کے چلے تو وہ انسان ہے جسکی ابتدا بھی پاک ہو اور انتہا بھی طیّب و طاہر ہو۔

آغاز ایسا طیب وطاہر ہو کہ خدا عورت بھی بنائے تو جنت کے سیب سے بنائے تاکہ مادیت کمزور نہ ہونے پائے اور مرد بنائے تو اپنے گھر میں پیدا کر دے تاکہ مادیت کی پاکیزگی کا احساس رہے (صلوٰۃ)

ایسے افراد جن کے وجود کی بنیادیں اتنی طیب وطاہر اور پاک و پاکیزہ ہوں۔ وہ اگر غرور کرتے تو یہ بات ان کے شایان شان تھی۔ ان کی طہارت کا تو یہ عالم ہے کہ ان کے جوار میں بھی آ کے کوئی دفن ہو جائے تو سو سال بعد، دو سو سال کے بعد ہزار برس کے بعد بھی اگر قبر کو کھولا جائے تو جسم طیبؑ و طاہر اور تر و تازہ ہی دکھائی دے گا ان افراد کے شایان شان تھا کہ ان میں غرور پیدا ہوتا۔ نہ ان کی ابتدا خراب تھی نہ انتہا خراب تھی۔ نہ ان کی ابتدا میں کمزوری تھی اور نہ ان کی انتہا میں کوئی کمزوری تھی مگر اس کے باوجود جو دونوں طرف سے کمزور تھے ان میں غرور دیکھا۔ اور جو ہر طرف سے بلند و بالا تھے ان میں کمال تواضع ہی دیکھا۔

اب جملہ یاد دلاؤں کہ مولائے کائنات سے کسی شخص نے آ کر گذارش کی تھی کہ یا علیؑ پروردگار نے آپ کو اتنے صفات دیے ہیں۔ اتنے کمالات عطا کئے ہیں۔ امیر المومنین، امام المتقین، یعسوب الدین، قائد الغر المحجلین، قاتل المشرکین۔ اتنے صفات، اتنے خطابات، اتنے القاب اب یہ بتائیے کہ ان سارے خطابات، اور القاب میں آپ کو کون سا لقب زیادہ پسند ہے؟ اگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو میں کہتا کہ امیر المومنین، امام المتقین۔

لیکن جب مولائے کائنات سے پوچھا گیا کہ ان سارے خطابات اور القاب میں آپ کو سب سے زیادہ کون سا لقب عزیز ہے تو فرمایا ابو تراب۔

سرکار دو عالمؐ نے مجھے اتنے خطابات دئے مگر میرا سب سے عزیز لقب ہے ابو تراب۔ اب آپ نے پہچانا کہ اتنے بلند افراد جن کی ابتدا بھی اتنی پاکیزہ اور انتہا بھی اتنی طیب وطاہر انھیں کوئی لفظ اتنا پسند نہ آیا جتنا لفظ ابو تراب پسند آیا کیوں؟ اس کے لیے کہ امیر المومنین سے اپنے اقتدار کا اعلان ہوتا ہے امام المتقین سے اپنی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، یعسوب الدین سے اپنی سرداری کا اعلان ہوتا ہے قائد الغر المحجلین سے اپنی قیادت کا اعلان ہوتا ہے لیکن ایک لفظ ابو تراب ہے جس میں خاکساری کا اعلان پایا جاتا ہے گویا علیؑ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھ کو پہچاننا ہو تو میری خاکساری سے پہچانو۔ میری

میری بڑائی سے نہ پہچانو (صلوات)

عزیزان محترم یہ ساری سیرتیں، یہ سارے کردار، یہ سارے تذکرے، یہ سارے واقعات اسی لیے ہیں کہ انسان اپنی اوقات کو پہچانتا رہے اور اپنی حدوں کے اندر رہے۔ اب انسان میں خاکساری کے معنی کیا ہیں؟

معصوم نے فرمایا کہ کم سے کم تواضع کا درجہ یہ ہے اَنْ تَجْلِسَ فِي الْمَجْلِسِ دُوْنَ مَقَامِكَ یعنی کسی بھی مجلس میں کسی بھی جگہ پر اگر بیٹھو تو جو اپنی جگہ ہے اس سے کمتر جگہ پر بیٹھو وَاَنْ تَرْضٰى بِالْجُلُوْسِ دُوْنَ الْمَجْلِسِ اور اس بیٹھنے کے لیے راضی رہو۔

مثال کے طور پر ہم نے طے کیا کہ ہماری جگہ منبر پر ہے۔ ہم ذاکر ہیں، ہم عالم ہیں، ہم خطیب ہیں تو ہماری تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا منبر پر بیٹھے تو زیر منبر بھی بیٹھنے کا حوصلہ رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ جہاں پڑھنے کا چانس مل جائے وہاں تو سب سے پہلے حاضر ہیں اور جہاں دوسرا پڑھنے لگے وہاں حاضری کی فرصت ہی نہ رہے کہ جب زیر منبر بیٹھ جائیں گے تو لوگ کہیں گے کہ وہ پڑھ رہے ہیں اور یہ بیٹھے ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ اونچے ہیں اور یہ ان سے کمتر ہیں۔

کتنے افراد ہیں جو فرش عزا پر بھی اسی لیے نہیں بیٹھتے ہیں کہ اپنی برتری پر حرف آجائے گا جبکہ ائمہ طاہرینؑ کے دور میں خود وہ حضرات زیر منبر بیٹھتے تھے اور دوسرے کو حکم دیتے تھے کہ منبر پر جا کر میرے جد کے مصائب بیان کرو۔ اس کے منبر پر بیٹھ جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ امام پست ہو گئے ہیں اور وہ بلند ہو گیا ہے۔ جو بلند ہے وہ بہرحال بلند رہے گا کسی کے اوپر یا نیچے بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو بالکل وہی عقیدہ ہو گیا کہ اگر کوئی کرسی پر بیٹھ گیا تو گویا اونچا ہو گیا حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حکیم نصرانی نے کوفہ میں آکر علیؑ کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا یَا عَلِیُّ مَا زَیَّنَتْكَ الْخِلَافَةُ بَلْ زَیَّنْتَهَا اے علیؑ خلافت نے آپ کو زینت نہیں دی ہے بلکہ آپ نے خلافت کو آراستہ کیا ہے (صلوات)

تخت کی عظمت یہ ہے کہ آپ کے قدم وہاں تک آجائیں۔ آپ کو ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تو تواضع کی چار صفتیں ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ انسان اپنی جگہ سے کم جگہ پر بیٹھنے کے لیے راضی رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وَاَنْ تُسَلِّمَ عَلیٰ مَنْ تَلْقیٰ اور جس سے ملاقات کرو اسے سلام کرو، سلام کا انتظار نہ کرو۔ چھوٹا ہو یا بڑا جو بھی سامنے آجائے سلام کرو یہی تواضع ہے۔

یاد رکھیے کہ اسلام میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ یہ صرف ہماری تہذیب کا ایک حصّہ ہے ورنہ اسلام میں کوئی ایسا قانون نہیں ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے آجائیں تو بڑا انتظار میں کھڑا رہے کہ یہ چھوٹے ہیں لہٰذا یہ سلام کریں گے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ سلام شروع کریں گے تو چھوٹا سلام سیکھے گا۔ تربیت یہ نہیں ہے کہ بابا آئے ہیں سلام کرو، چچا آئے ہیں سلام کرو، انکل آئے ہیں سلام کرو۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ آپ خود ہی سلام کریں تاکہ اسکی بھی عادت پڑ جائے۔ مثال کے طور پر آپ جب بیٹے کو سلام کریں گے تو بیٹا اتنا بے غیرت نہیں ہو گیا ہے کہ آپ کو سلام نہ کرے گا۔ آپ چھوٹے کو سلام کریں گے تو وہ آپ کو خود ہی سلام کرے گا لیکن آپ پہلے سلام کرنے کی عادت توڑ دیں۔ سلام کرنے کی فضیلت تو پہچانیں۔ یہ سارا غرور اس لیے پیدا ہو گیا ہے کہ انسان یہی نہیں جانتا ہے کہ دولت مند کون ہے اور فقیر کون ہے۔ یاد رکھیے کہ پروردگار عالم نے سلام میں سو ثواب رکھے ہیں۔ ننّانوے سلام کرنے والے کے لیے ہیں اور ایک جواب دینے والے کے لیے۔ اب اگر آپ کا میرا سامنا ہو گیا۔ میں نے آپ کو سلام کر لیا تو اب ننانوے کس کے پاس ہیں؟ میرے پاس۔ ایک ثواب کس کے پاس ہے آپ کے پاس۔ اب بتائیے بڑا آدمی کون ہے جس کی جیب میں ننانوے ہیں وہ بڑا آدمی ہے یا جس کی جیب میں صرف ایک ہے وہ بڑا آدمی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑی دیر پہلے تک اگر آپ بڑے تھے تو تھے لیکن میں نے سلام کر کے اپنے کو اتنا اونچا بنا لیا کہ آپ پیچھے رہ گئے۔ شاید اسی لیے سرکارِ دو عالمؐ نے چاہا کہ عظمتوں کا اعلان بھی ہو جائے اور امت کی تربیت کا سامان بھی ہو جائے۔ تو ایک دو دن نہیں بلکہ دس مہینے تک بیٹی کے دروازے پر سلام کرنے کے لیے آتے رہے۔ تاکہ عظمتِ سلام بھی واضح ہو جائے اور عظمتِ زہراؑ کا بھی اعلان ہو جائے کہ یہ وہ دروازہ ہے کہ جہاں نبی بھی سلام کرتا ہے امّت کا کیا ذکر ہے۔ گویا کہ ساری امت نبیؐ کے

دروازہ پر آکر سلام کرتی ہے اور نبیؐ فاطمہ کے دروازے پر آکر سلام کرتے ہیں۔ یہ تھی تواضع کی دوسری علامت۔ تیسری علامت یہ ہے کہ اگر آپ صحیح کہہ رہے ہوں اور کوئی نہیں مانتا ہے تو فضول بحث نہ کریں اور وقت ضائع نہ کریں۔

چوتھی علامت یہ ہے کہ انسان کسی بھی اپنے کمال یا اپنی فضیلت پر تعریف پسند نہ کرے اور اس کا انتظار نہ کرے یعنی بیٹھے تو کمتر جگہ پر بیٹھنے کو پسند کرے۔ تعریف کا کام کرے تو تعریف کا انتظار نہ کرے۔

گویا انسانی نفس میں جتنی کمزوریاں تھیں چار فقروں میں معصوم نے سب کو واضح کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑا متواضع، بڑے سے بڑا خاکسار، بڑے سے بڑا انکسار رکھنے والا ہو تو اس میں کہیں نہ کہیں یہ چاروں عیب یا چار میں سے کوئی عیب ضرور پیدا ہو جائے گا۔

ایک شعر پڑھ کر تعریف کا انتظار کرنا یا ایک نکتہ بیان کرنے پر واہ واہ اور نعروں کی تمنّا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اندر سے غرور پایا جاتا ہے اور انسان اپنے عمل کو کوئی کارنامہ تصوّر کر رہا ہے حالانکہ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ بندوں کی تعریف کا انتظار نہ کرے اور راہِ خدا میں کام انجام دے۔ کہ بندے تعریف کی زبان بند بھی کر لیں گے تو خدا زبان بند نہ کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میدان میں مجاہد اکیلا رہ گیا اور کوئی نہ تھا جو تعریف کرتا ہے تو قدرت نے کہا کہ سب کی زبان خاموش ہو جائے میری زبان خاموش نہیں رہے گی۔ لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار (نعرہ صلوات)

تاریخ اسلام نے سرکار دو عالمؐ کی تواضع کے ذیل میں جو حضورؐ کے صفات کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند فقرے میں آپ کو سنائے دیتا ہوں ورنہ بات بہت طویل ہے۔ حضورؐ کے اخلاقیات یہ تھے۔

كَانَ يَحْلِبُ شَاتَهٗ آپ کے گھر میں جو بکری پلی تھی اس کا دودھ حضورؐ خود دوہتے تھے اس کے بعد اگر ردا کہیں سے بوسیدہ ہو جائے تو حضورؐ خود اس کی مرمّت فرماتے تھے۔ حد یہ ہے کہ جوتیاں ٹوٹ جائیں تو اپنے نعلین کی اصلاح خود فرماتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی موقع پر کسی مصلحت سے یہ کام کسی دوسرے کے ہاتھ میں آجائے مگر حضورؐ اس بات کا انتظار نہیں کرتے تھے کہ میں پیغمبر

ہوں تو کوئی صاحب آ کے میری جوتیوں کی اصلاح کر دیں۔ میں پیغمبر ہوں تو کوئی صاحب آئیں اور آ کے بکری کا دودھ نکال دیں۔ میں پیغمبر ہوں تو کوئی صاحب بازار جا کے میرا سودا لے آئیں حضور ان باتوں کے انتظار میں نہیں رہتے تھے۔ اپنے کام خود کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ ایک سفر میں تشریف لے جا رہے تھے اور ایک مقام پر قافلہ رکا تو یہ طے ہونے لگا کہ کھانے کا انتظام کیسے ہوگا۔ ایک صاحب نے کہا جانور میں ذبح کروں گا۔ دوسرے نے کہا کھال میں اتاروں گا۔ تیسرے نے کہا گوشت میں کاٹوں گا۔ چوتھے نے کہا میں پکاؤں گا۔ حضور نے فرمایا تو اچھا پھر میں جا کے لکڑیاں لے آتا ہوں۔

اصحاب بے چین ہو گئے۔ سرکار ہم نالائق کس دن کام آئیں گے؟

فرمایا جب سب ساتھ سفر کر رہے ہیں تو جو میری طرف سے ذمّہ داری تمہارے اوپر ہے وہی ذمہ داری تمہاری طرف سے میرے اوپر ہے کہ دنیا درس تواضع حاصل کرے اور دنیا میں احساس خاکساری پیدا ہو کہ اتنا بڑا انسان، اتنا باعظمت انسان بگڑ قوم کے ساتھ یوں برتاؤ کرتا ہے۔ اپنے اعمال خود انجام دیتا ہے، اپنے گھر کے کام خود کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ بیٹھ جائے تو یوں تواضع اور خاکساری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

سوچو کہ ایسے نبی کی جگہ پر جب کوئی بیٹھنے والا بیٹھے گا تو اسے کیسا ہونا چاہئے۔

مولائے کائنات کی شہادت کے بعد حاکم شام کے دربار میں ضرار آئے تو حاکم شام نے یہ سوال کیا کہ صِفْ لِی عَلِیًّا مجھ سے علیؑ کے اوصاف بیان کرو۔

ظاہر ہے کہ اب علیؑ دنیا میں نہیں ہیں اور ان کی طرف سے کوئی خطرہ بھی نہیں ہے کہ ناراض ہو جائیں گے مگر ضرار نے کہا کہ امیر اگر مجھے معاف کر دیتے تو اچھا تھا کہ میں جو بیان کروں گا وہ آپ برداشت نہ کر سکیں گے اور اگر قتل کرنے کا ارادہ ہے تو یوں ہی قتل کر دیں۔

معاویہ نے کہا نہیں۔ کچھ تو بیان کرنا ہوگا۔ کہا پھر جان بخشی کی جائے گی۔ کہا ہاں سنیں گے تم بیان تو کرو ضرار نے مولائے کائنات کے فضائل کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پہلے تو ذاتی کمالات کا ذکر کیا۔ ان کا کمال ایسا تھا، ان کی طاقت ایسی تھی، ان کی عدالت ایسی تھی، ان کا فضل ایسا تھا، ان کا علم ایسا تھا۔ اس کے بعد ایک عجیب فقرہ کہا کہ اے امیر شام علیؑ کی تعریف

یہ ہے کَانَ فِینَا کَاحَدِنَا جب ہمارے درمیان بیٹھ جاتے تھے تو ہماری مجلس کی ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔

عزیزو یہاں یہ بات بیان کر دینا بہت آسان ہے لیکن وہ دربار جہاں شخصیت مقامات سے پہچانی جاتی ہو۔ کرسی سے، تاج سے، تخت سے تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ امیر ملک ہیں یہ حاکم سلطنت ہیں۔ یہ وزیر ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ کہنا کَانَ فِینَا کَاحَدِنَا ہمارے درمیان یوں رہا کرتے تھے جیسے ہماری ہی برادری کی ایک فرد ہوں لَہٗ مَالَنَا وَعَلَیْہِ مَا عَلَیْنَا جتنا حق وہ اپنے لیے لیتے تھے اتنا ہی حق وہ ہم کو دیتے تھے اور جو ذمہ داری ہم پر ڈالتے تھے اس ذمہ داری کو پہلے خود برداشت کرتے تھے اور اب مختصر یہ ہے کہ علیؑ نہیں مرے مَاتَ الْعَدْلُ وَالْاِنْصَافُ علیؑ نہیں گئے دنیا سے عدل چلا گیا، انصاف چلا گیا تقویٰ چلا گیا۔ اب کیا رہ گیا اس دنیا میں جب ایسا پاک دل انسان نہیں رہ گیا۔ وہ پیغمبرؐ کا اخلاق تھا یہ مولائے کائنات کا اخلاق تھا کہ جب امام حسن امام حسین علیہما السّلام مولا کو دفن کر کے آئے اور راستہ میں خرابہ کے نابینا سے پوچھا کہ تجھے کھانا کون لا کے دیتا تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے جب بھی نام پوچھا کبھی نام نہیں بتایا ہمیشہ یہی کہا مِسْکِیْنٌ جَالَسَ مِسْکِیْنًا ایک مسکین ایک مسکین کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا کہ تو بھی خدا کی بارگاہ کا ایک فقیر ہے اور میں بھی خدا کی بارگاہ کا ایک فقیر ہوں

آپ سنتے رہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم کی محفل میں کچھ بڑے لوگ اتفاق سے آ گئے اور اتفاق سے اسی وقت ایک غریب آدمی بھی آ گیا۔ اب وہ غریب آدمی جو بیٹھا تو کسی بڑے آدمی کی چادر کا ایک کونہ اس آدمی کے گھٹنے سے دب گیا۔ اس نے بہت غصہ میں آکر کنارہ کھینچ لیا اور سمجھا کہ شاید حضور نے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ مگر جو ات کے اعمال پر نگاہ نہ رکھے وہ پیغمبر کس بات کا ہے اور یہی مواقع ہوتے ہیں تبلیغ کے جیسے آیات قرآنی کے نزول کے لیے مالک کائنات بہترین مواقع کا انتخاب کرتا ہے پیغمبر بھی جانتے تھے کہ یہ بات کسی اور روز کہی جائے گی تو اثر نہ ہوگا لیکن آج کہی جائے گی تو اثر ہوگا لہٰذا جیسے ہی اس نے اپنی چادر کے گوشے کو اس کے گھٹنے کے نیچے سے کھینچا حضور متوجہ ہو گئے اور فرمایا کہ شاید آپ کا خیال یہ تھا کہ وہ گھٹنوں سے آپ کی چادر دبا کر آپ کی دولت کھینچ لے جائے گا۔

یا اس کے گھٹنے جو آپ کی چادر پر پڑ گئے ہیں تو گھٹنوں کے ذریعہ اسکی غربت آپ کے گھر آجائے گی۔ تم نے کیا سمجھ کر گوشۂ چادر کو کھینچا ہے۔ کیا تمہاری چادر کا گوشہ ایک مومن سے زیادہ قیمت رکھتا ہے وہ یہ سن کر گھبرا گیا اور کہنے لگا حضور غلطی ہوگئی معاف فرما دیجئے۔

خیر یہ بھی بہترین صفت ہے کہ غلطی ہو جائے تو انسان غلطی کا اقرار کر لے۔ حضور نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ اس نے کہا کہ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس غلطی کا کفارہ دوں۔ فرمایا کیا کفارہ دے گا؟ کہا مجھ میں یہ بات پیدا ہوئی ہے میری دولت اور اسکی غربت کی وجہ سے کہ اگر دونوں برابر ہوتے تو یہ بات پیدا نہ ہوتی۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اپنی آدھی دولت اس کے حوالے کر دوں تاکہ نہ بگڑا رہ جاؤں اور نہ آئندہ کبھی غرور پیدا ہو۔

کتنا شریف آدمی تھا کہ ایک معمولی سی غلطی پر اپنی آدھی دولت دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ حضور نے مڑ کر اس غریب کو دیکھا۔ فرمایا بھائی مبارک ہو۔ تمہارا بھائی کتنا شریف ہے۔ ایک ادنیٰ سی غلطی پر تمہیں اپنے مال کا آدھا حصّہ دینا چاہتا ہے۔ اس نے عرض کیا حضور معاف فرمائیں مگر میں لے نہیں سکتا ہوں۔

فرمایا بھائی مفت میں مل رہا ہے کیوں نہیں لینا چاہتا ہے۔

عرض کی مجھے خطرہ ہے کہ اس مال نے جو فساد اس کے دل میں پیدا کیا ہے کہیں یہی فساد میرے اندر نہ پیدا ہو جائے۔ (صلوات)

جب خود اس نے یہ اقرار کر لیا ہے کہ یہ غرور مجھ میں اس لیے پیدا ہوا ہے کہ میرے پاس یہ مال تھا اور میں نے اسکی زبان سے سن لیا کہ سارا فساد اسی مال کا ہے تو جس مال نے اسے برباد کیا ہے اب اگر ادھر آگیا تو میرا ذمّہ دار کون ہوگا؟ مجھے یہ غربت ہی پسند ہے۔ کم سے کم غرور تو نہیں ہے تکبّر تو نہیں ہے، اکڑ تو نہیں ہے۔ وہ کمال ہے جو آدمؑ کا کمال ہے۔ وہ عیب نہیں ہے جو ابلیس کا عیب تھا۔

بس عزیزان گرامی۔ خاتمۂ کلام میں یہ پہچانیں کہ تواضع اور خاکساری وہ صفت ہے جو خاک کے پتلے میں پائی جاتی ہے۔ جو آدمیت اور انسانیت میں پائی جاتی ہے۔ اور غرور وہ عیب ہے

جس نے ابلیس کو ابلیس بنا دیا۔ اچھا خاصا جن تھا ملائکہ کی محفل میں بیٹھتا تھا۔ عبادتیں کرتا تھا ملائکہ میں قابل احترام ہو گیا تھا۔ ایک تکبّر کیا پیدا ہوا کہ کہیں کا نہ رہ گیا۔ نکالا گیا، مردود ہو گیا، ملعون ہو گیا۔ لہٰذا جب تک تاریخ ابلیس انسانوں کے سامنے ہے۔ انسان کو اس تاریخ آدمؑ و ابلیس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اور اس سلسلے کا ایک آخری جملہ یہ ہے کہ وہ پیغمبرؐ جو اتنا بڑا صاحب اخلاق تھا جس کے اخلاقیات پر ساری تاریخیں اتفاق کیے ہوئے ہیں۔ جس کے اخلاق کا کلمہ دشمن پڑھ رہے تھے اور اس کے اخلاق ہی کی بنا پر کلمہ پڑھ رہے تھے۔ اس پیغمبرؐ کی بھی پروردگار اسی طرح تعریف کرتا ہے وَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ یہ اللہ کی رحمت و مہربانی تھی کہ آپ کا رویہ ان کے ساتھ نرم تھا وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ ورنہ اگر آپ کہیں ترش رو اور بداخلاق ہوتے تو یہ سب آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔

یہ کمال اخلاق تھا جو مجمع جمائے ہوئے تھا۔ یہ کمال اخلاق تھا جس سے محفل آراستہ تھی۔ گویا کہ پروردگار پیغمبرؐ کی تواضع کی تعریف کر رہا ہے اور اس کے بعد حد اخلاق یہ ہے کہ جس دن اس نے پیغمبرؐ کو پیغمبری عطا کی تھی اسی دن حکم دیا تھا کہ خبردار تواضع میں فرق نہ آنے پائے۔

آپ حضرات قرآن کے صرف ایک جملہ کو سنتے ہیں۔ دوسرا ابھی پڑھتے۔ اللہ نے جس دن پیغمبرؐ کو تبلیغ کا پہلا حکم دیا أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔ پیغمبرؐ اپنے عشیرہ قبیلہ کے قرابت داروں کو ڈرائیے۔ پہلا دن تبلیغ کا ہے۔ دعوت ذوالعشیرہ۔ جب نبی نے سارے خاندان کو بلایا، کھانا کھلایا اور اس کے بعد پیغام سنانا چاہا۔ لوگ جادوگر کہہ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر بلایا۔ پھر دیوانہ کہہ کر چلے گئے مگر خدا نے کیا کہا أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ پیغمبر اپنے عشیرہ قبیلہ کے قرابت داروں کو ڈرائیے۔ میرا پیغام پہنچائیے۔ اسلام کا اعلان کیجیے، رسالت کی تبلیغ کیجیے لیکن ایک بات یاد رکھیے گا وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اگر کوئی مومن آپ کا اتباع کرلے۔ آپ کے راستے پر آجائے۔ پیروی کے لیے تیار ہو جائے تو اس کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دیجیے گا۔

اللہ صاحب عرش پیغمبرؐ، عرش عظیم پر جانے والا، اتنا عظیم پیغمبرؐ جس کی جوتیاں عرش اعظم

تک پہنچ جائیں اس سے خدا فرما رہا ہے کہ پیروی کرنے والے صاحبانِ ایمان کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دیجئے گا۔ ایک طرف حکمِ تبلیغ، ایک طرف حکمِ تواضع ایک طرف حکمِ اسلام ایک طرف حکمِ انکسار، ایک طرف حکمِ دعوت، ایک طرف یہ اعلان گویا مالک نے دونوں قانون ایک ساتھ نازل کئے ہیں ایسا نہ ہو کہ جو بے چارے ایمان لے آئیں ان کا دل ٹوٹ جائے کہ اسلام میں ہماری جگہ کہاں ہے سماج میں تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ معاشرہ میں گالیاں کھائیں گے، مار کھائیں گے، پتھر کھائیں گے تو یہاں تو آپ اپنے شانوں کو جھکا دیجئے تا کہ ان کے دل ٹھہر جائیں۔

مالک نے ایک طرف انسانوں کو حکم دیا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ دیکھو ماں باپ کا حق یہ ہے کہ ان کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دینا اور پھر پیغمبرؐ کو حکم دیا امت کے بارے میں۔ بھلا پیغمبرؐ کے سامنے امت کی اوقات ہی کیا ہے اولاد کے سامنے تو ماں باپ کی عظمت ہے۔ اولاد اگر ماں باپ کے سامنے جھک جائے تو سمجھ میں بات آتی ہے مگر پیغمبرؐ کیسے پیروی کرنے والے کے سامنے جھک جائے گا جبکہ پیغمبرؐ خود یہی کہتا ہے کہ میں امت کا باپ ہوں تو امت کو حکم دیا جاتا کہ نبی کے سامنے جھکو۔ یہ نبی سے کیوں کہا گیا کہ امت کے سامنے تواضع سے کام لو۔

بات یہ ہے کہ تواضع جانِ اسلام ہے، تواضع روحِ اخلاق ہے، تواضع روحِ تبلیغ ہے اب میں نہیں جانتا کہ حضور نے خدا کے اس قانون پر عمل کیا یا نہیں؟ (میں نے ایک بات کہی ہے سوچئے گا)

میں تو صرف یہ کہوں گا کہ سرکارِ دوعالم آپ امت کے باپ ہیں کیا آپ باپ ہو کے امت کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دیں گے یہ کیسے ہو سکے گا۔

پیغمبر فرمائیں گے کہ خدا نے ہر ایک کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں کہا ہے۔ ہر امتی کے سامنے شانوں کو جھکانے کا حکم نہیں دیا ہے تم نے قرآن نہیں پڑھا لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ان ایمان والوں کے سامنے شانے جھکا دیجئے گا جو آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ اب اگر تاریخ میں ڈھونڈھنا ہے کہ نبی کے نقشِ قدم پر چلنے والا کون ہے؟ تو دیکھو کہ یہ شانے کس کے آگے

جھکے ہیں۔

اسلام دین تواضع ہے اسلام دین اخلاق ہے لہٰذا جتنے صفات اور جتنے فضائل ہیں سب دامن اسلام میں جمع ہیں۔ اسلام کے مقابلے میں سوائے رذائل اور سوائے خباثتوں کے کچھ نہیں ہے اسی لیے میں روزانہ اس نعرے کو آپکے سامنے پیش کرتا ہوں کہ ہر صفت کا موقع اگر دیکھنا ہے تو صحرائے کربلا میں آکر دیکھئے کہ ایک طرف تواضع، خاکساری اور انکساری کے مجسّمے ہیں تو دوسری طرف غرور تکبّر، اکڑ اور بد دماغی ہے۔ چار دن کی دولت، تھوڑے سے قوم کے پیسے جمع کر کے انسان کا دماغ اتنا خراب ہو جائے کہ خاتم النبیین کے بیٹے سے بیعت کا مطالبہ کرنے لگے۔

اُدھر بد دماغی اور غرور کا یہ عالم ہے اور اِدھر وہ جس کے بارے میں پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ میں حسینؑ سے ہوں۔ اسکی خاکساری کا یہ عالم ہے کہ۔

اکبر کا جہاں سر ہے وہیں جون کا سر ہے شبیر کا زانو ہے مساوات کی دنیا

اس تواضع اور خاکساری کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ غلاموں کا سر اٹھا کے زانو پر رکھا جائے۔ مقتل سے کسی کی آواز آجائے تو یہ نہ سوچا جائے کہ یہ تو آج ہی آیا ہے اس کے لیے کسی اور کو بھیج دیا جائے۔ نہیں۔ حسینؑ بار بار آتے ہیں خود مقتل میں آتے ہیں اور جب تک آنے کے قابل رہے آتے رہے جب تک لاش اٹھانے کے قابل رہے لاشوں کو اٹھاتے رہے اور مسلسل دنیا کے سامنے تواضع اور اخلاق کے مرقعے پیش کرتے رہے۔ اربابِ عزا آج قربان گاہ کربلا پر جس پیش ہونے والی قربانی کا تذکرہ سننے کے لیے آپ جمع ہوئے ہیں اس کی ایک خصوصیت خاص ہے کہ اگر علیؑ اکبر قربان ہوئے تو باپ میدان میں موجود تھا مگر اب تو وہ جا رہا ہے جس کو رخصت کرنے والا پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکا ہے مگر جب دنیا سے رخصت ہوا تو اس انتظام اور اہتمام کے ساتھ رخصت ہوا کہ ایک تعویذ اپنے بچّے کے بازو پر باندھ دیا کہ بیٹا میں تو دنیا سے جا رہا ہوں لیکن جب کبھی کوئی سخت وقت آجائے تو اس تعویذ کو کھول کر دیکھ لینا۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام دنیا سے جا رہے تھے تو قاسم کی عمر کیا تھی؟ دو برس سے زیادہ سن سال نہیں تھا۔ مگر بنی ہاشم کے گھرانے کا بچّہ اس کمسنی میں بھی کتنا باشعور ہوشمند اور سمجھدار تھا کہ امام حسنؑ

نے اپنی وصیت پر عمل کا ذمہ دار بھی اپنے کمسن شہزادے کو ہی قرار دیا۔

امام حسنؑ دنیا سے رخصت ہو گئے وقت گذرتا رہا یہاں تک کہ وہ دن آ گیا جب امام حسینؑ کا قافلہ کربلا میں آ گیا اور کربلا میں عاشور کی رات آ گئی۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے چاہنے والوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ میرے چاہنے والو! میرے عزیزو، میرے اصحاب۔ یہ زندگی کی آخری رات ہے۔ کل قربان گاہ اسلام پر سب کو قربان ہونا ہے۔ حبیب تم بھی قربان ہو جاؤ گے، زہیر تم بھی قربان ہو جاؤ گے۔ مسلم تم کو بھی راہ خدا میں قربان ہونا ہے۔ تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا علی اکبرؑ بھی قربان ہو گا۔ کل عونؑ و محمدؑ بھی قربان ہوں گے۔ حسینؑ ایک ایک کو سمجھا رہے ہیں تاکہ دنیا ہوشیار ہو جائے کہ کربلا میں حسینؑ کے ساتھ کوئی دھوکہ میں نہیں آیا تھا۔ سب قربانی دینے کے لیے آئے تھے۔ سب جذبۂ فداکاری لے کر آئے تھے لیکن جب امام حسینؑ محضر شہادت سنا کر خاموش ہوئے تو ایک بچہ درمیان سے اٹھا اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ ہائے میرا مقدر، ہائے میرا مقدر۔ دو برس کی کمسنی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ اٹھ گیا۔ مطمئن تھا کہ چچا ہیں، مولا موجود ہیں مجھے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ کیا معلوم تھا کہ ابھی مقدر میں ایک بدنصیبی اور لکھی ہے کہ کل قربانی کا دن آئے گا تو باہر والے قربان ہو جائیں گے۔ چاہنے والے قربان ہو جائیں گے۔ مختلف قبیلہ والے قربان ہو جائیں گے۔ بنی ہاشم کے چھوٹے بڑے سب قربان ہو جائیں گے اور صرف میرے مقدر میں قربانی نہیں ہے۔ میری قسمت میں مولا پر قربان ہونا بھی نہیں لکھا گیا ہے ابھی بچہ رو ہی رہا تھا کہ ایک مرتبہ خیال آ گیا کہ باپ نے ایک تعویذ باندھا تھا اور فرمایا تھا کہ بیٹا جب کوئی سخت وقت آ جائے تو اس تعویذ کو دیکھ لینا اور اسی کے مطابق اپنے مسئلہ کو حل کرنا۔ ایک مرتبہ قاسم نے تعویذ کو کھولا۔ دیکھا ایک فقرہ لکھا ہے بُنَیَّ قَاسِمِ اَدْرِكْ عَمَّكَ الْحُسَین بیٹا قاسم دیکھو جب چچا پر وقت پڑ جائے تو اپنے چچا کی مدد کرنا۔ اپنے چچا کے کام آنا۔ بس جیسے ہی فقرہ دیکھا قاسم کا دل مطمئن ہو گیا۔ دوڑ کے مولا کی خدمت میں آئے۔ امام حسینؑ نے فرمایا بیٹا کیوں آئے؟ کہا۔ مولا ذرا یہ تحریر تو پڑھ لیجئے۔ یہ نوشتہ تو ملاحظہ فرما لیجئے۔

امام حسین علیہ السلام نے بھائی کی تحریر کو آنکھوں سے لگایا۔ اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بیٹا تم وصیت نامہ لے کے نہیں آئے ہو چچا کو اپنی موت کا پیغام سنانے آئے ہو اجرکم علی اللہ

خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غم آل محمدؐ کے) عزیزو بڑا نازک موقع تھا۔ باپ تو نہیں رہ گیا۔ کوئی اس ماں کے دل سے پوچھے جس کا بیٹا قربان ہونے کے لیے جا رہا ہے۔

بیٹا اپنی موت کا پیغام سنانے کے لیے آئے ہو۔ میرے لال میں نے کچھ سمجھ کر تمہارے نام کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ بیٹا کل تو وہ قربانی کا دن ہے کہ تمہارا چھ مہینے کا علی اصغرؑ بھی راہِ خدا میں قربان ہو جائے گا۔

عزیزو! ابھی تک قاسم سر جھکائے چچا کی باتیں سن رہے تھے لیکن جیسے ہی یہ سُنا کہ علی اصغرؑ کو بھی قربان ہونا ہے تو ایک مرتبہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ چچا ھل یصلون الی الخیام کیا یہ ظالم خیموں میں داخل ہو جائیں گے۔

حسینؑ نے کہا نہیں بیٹا میں علی اصغرؑ کو لیکر میدان میں جاؤں گا تاکہ بچہ کا دل ٹھہر جائے مگر ہائے وہ بیمار کیا کرے جس نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہو کہ خیمے جل رہے ہیں اور اشقیاء خیموں میں داخل ہوئے ہیں۔

قاسم! بیٹا کل سب قربان ہو جائیں گے اور تمہیں بھی قربان ہونا ہے۔ اب قاسم اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں یہاں تک کہ عاشورہ کی رات تمام ہوئی۔ صبح عاشور حملۂ اولیٰ میں ۵۰ جانے والے کام آگئے۔ اس کے بعد بنی ہاشم کی قربانی کا وقت آیا تو ماں نے کہا کہ بیٹا وقت آگیا ہے۔ جاؤ چچا کے پاس جاؤ اجازت لے کر جاؤ۔ اکبرؑ سے پہلے جاؤ عون و محمد سے پہلے جاؤ۔ جاؤ جا کر قربان ہو جاؤ۔ بھتیجہ چچا کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ بڑا نازک مرحلہ تھا اور بڑا عجیب منظر تھا۔ میں نے مقاتل میں دیکھا ہے کہ قاسم آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ چچا اب تو مرنے کی اجازت دے دیجیے۔ چچا اب تو جانے دیجیے حسینؑ نے بھتیجہ کو گلے سے لگا لیا۔ بیٹا کیسے اجازت دوں۔ قاسم مسلسل اصرار کرتے رہے لیکن جب دیکھا کہ اجازت نہیں مل رہی ہے تو روایت کا فقرہ ہے۔ کہ چچا کے ہاتھوں کا بوسہ دینا شروع کیا۔ چچا اجازت دے دیجیے، آقا جانے دیجیے، مولا مجھے رخصت کر دیجیے۔ حسینؑ چپ کھڑے ہیں اور کچھ نہیں بولتے ہیں۔ ایک مرتبہ اپنا سر قدموں پر رکھ دیا۔ قدموں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ چچا اب یہ سر نہ اٹھے گا جب تک مرنے کی اجازت نہ مل جائے گی (بس رونے والے میرے عزیزو! میرے بچو! میرے نوجوانو! میرے سامنے تو ۱۳ سال کے بچے بھی نہیں ہیں جن سے میں کچھ کہہ سکوں) قاسمؑ نے اصرار کرنا شروع کیا تو حسینؑ نے کہا۔ بیٹا جاؤ میں نے اجازت دے دی۔ سر تو اٹھا لو۔ یہ کہکر

حسینؑ نے بچہ کو اٹھایا۔ اٹھا کے سینے سے لگایا۔ چچا بھتیجے مل کر اتنا روئے کہ دونوں غش کھا کر گر گئے۔ ہائے میں کیسے اس منظر کو دہراؤں کہ جب کسی بے ہوش کو ہوش میں لانا ہوتا ہے تو پانی چھڑکا جاتا ہے مگر زینبؑ کیا کریں۔ اِدھر بھائی اُدھر بھتیجہ۔ شہزادی نے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کیا۔ بھیا اب لال کو رخصت کر دیجئے۔ حسینؑ نے قاسم کو سجایا، سر پر عمامہ باندھا۔ کمر سے تلوار لگائی جب تیار کر دیا تو عمامہ کے دونوں سرے سینے پر لٹکا دئے اور کہا جاؤ میرے لال جاؤ۔ آؤ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں گھوڑے پر سوار کرا دوں۔ یہ کہہ کر حسینؑ نے چاہا کہ قاسم کو گھوڑے پر بٹھائیں مگر نہ جانے کیا خیال آ گیا کہا بیٹا ایک لمحہ کے لیے ٹھہر جاؤ۔ کہا چچا اب کوئی اور بات رہ گئی۔ حسینؑ نے قاسم کے گریبان کو چاک کر دیا۔ کہا چچا یہ کیا؟ فرمایا یہ یتیموں کی نشانی ہے۔ تم چلے تو بھیا حسنؑ کی یاد تڑپانے لگی۔ جاؤ میرے لال جاؤ۔ گھوڑے پر بٹھایا۔ قاسم مقتل میں آئے جہاد تمام ہوا زخموں سے چور ہو کے گرنے لگے آواز دی۔ چچا چچا۔ آئیے حسینؑ دوڑ کر چلے دیکھا قاتل سرہانے بیٹھا ہے۔ آواز دی بیٹا گھبرانا نہیں میں آ گیا۔ حسینؑ کو دیکھ کے فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اِدھر کے سوار اُدھر اُدھر کے سوار ادھر جب سینے پر گھوڑوں کی ٹاپ پڑتی تو قاسم کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا۔ چچا، چچا، چچا جلدی آئیے۔ جسم گھوڑوں کی ٹاپوں میں ہے۔

وَسَيَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَىَّ مُنۡقَلَبٍ يَّنۡقَلِبُوۡنَ

□□

مجلس ۸

وفا و جفا

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ٥

نٓ قسم ہے قلم کی اور تحریروں کی۔ پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمتوں کی بنیاد پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپ کے لئے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھیں گے کہ مجنون اور دیوانہ کون ہے؟

آیاتِ کریمہ کے ذیل میں فضائل اور رذائل کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے آٹھویں مرحلہ پر انسانی نفس کی دو اور خصوصیات کے بارے میں کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں جن میں عظیم ترین صفت کا نام ہے وفا اور بدترین صفت کا نام ہے جفا۔

انسانی زندگی میں وفا کیا ہے؟ اور وفا کی اہمیت کیا ہے؟ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے میں اپنے بچوں اور جوانوں کے لئے دو جملے گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ حقیقت وفا بھی معلوم ہو جائے اور حقیقتِ جفا بھی معلوم ہو جائے۔

وفا کا تصور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب پہلے سے کوئی عہد و پیمان سامنے ہوتا ہے اگر کسی آدمی نے اپنے وعدے کو پورا نہیں کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان بے وفا ہے

یا کسی آدمی نے کسی سے عہد کیا ہے تو عہد کو پورا کر دینے کا نام ہے وفا اور عہد کی مخالفت کرنے کا نام ہے جفا۔ اگرچہ ہمارے یہاں جفا کا تصور نسبتاً کچھ عام ہے کہ ہر ظلم کا نام ہے جفا۔ لیکن ہر اچھائی کا نام وفا نہیں ہے۔ وفا کے لئے کسی وعدے اور عہد و پیمان کا ہونا ضروری ہے اور اسی کی روشنی میں انسان کی وفاداری کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے بنیادی بات یہ ہے کہ انسانی زندگی میں دو طرح کے قول و قرار اور عہد و پیمان ہوتے ہیں۔

ایک وعدہ وہ ہے جو انسان انسانوں سے کیا کرتا ہے اور ایک وعدہ وہ جو انسان پروردگار سے کیا کرتا ہے۔ انسانوں سے جو وعدے عام طور پر کئے جاتے ہیں انھیں ہماری زبان میں وعدہ ہی کہا جاتا ہے لیکن جب بندہ پروردگار سے کوئی وعدہ کرتا ہے تو اسے شریعت کی زبان میں عہد کہا جاتا ہے بلکہ اس کے تین نام ہیں جو تین طریقوں سے استعمال کئے جاتے ہیں کبھی بندہ پروردگار سے وعدہ کرتا ہے تو اس ذات کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہے جس کا نام ہے شریعت میں یمین قسم یا حلف ہے۔

کبھی بندہ پروردگار سے کسی عمل کا وعدہ کرتا ہے مگر درمیان میں قسم کا ذکر نہیں لاتا ہے۔ اس کا نام ہے نذر جس کو اردو زبان میں کہا جاتا ہے منّت اور کبھی انسان اپنے معبود سے کوئی وعدہ کرتا ہے اور اس وعدہ کے لئے وہی لفظ استعمال کرتا ہے جو وعدہ کے لئے بنایا گیا ہے یعنی لفظ عہد اس کو زبان شریعت میں عہد کہا جاتا ہے۔

یعنی بندہ کے وعدے پروردگار کے ساتھ تین شکلوں میں سامنے آتے ہیں۔ کبھی قسم کی شکل میں، کبھی نذر کی شکل میں اور کبھی عہد کی شکل میں۔ ان تمام شکلوں میں اگرچہ بات ایک ہی ہے کہ بندہ نے خدا سے وعدہ کیا ہے مثلاً واللہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ اس کا نام ہے قسم۔ یا اللہ کے لئے میں اپنی ذمے داری قرار دیتا ہوں کہ اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں دو رکعت نماز پڑھوں گا اس کا نام ہے نذر۔ یا میں خدا سے عہد کرتا ہوں کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں دو رکعت نماز پڑھوں گا اس کا نام ہے عہد۔ یہ سب اللہ سے وعدے ہیں چاہے

اس لفظ کے ساتھ ہو چاہے اس لفظ کے ساتھ ہو مگر تنہا لفظوں کے بدل جانے سے اتنا بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ قسم کھانے والا اگر قسم کھانے کے بعد قسم کے مطابق کام نہ کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے (مسئلہ کو یاد رکھئے گا) اکثر لوگ صبح و شام بے ربط اور مہمل سی قسمیں کھایا کرتے ہیں انھیں یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ نام پروردگار کی عظمت کیا ہے ؟ اللہ کا نام ہر جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے اگر کسی آدمی نے نام خدا کی قسم کھائی کہ میں فلاں کام کروں گا جیسے کہ بعض مومنین جو آپس میں بگڑ جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ واللہ اب کبھی بات نہیں کروں گا تو اگر آپ نے یہ کہدیا تو کوئی برا کام نہیں کیا لیکن جب بات کرنے کی نوبت آجائے تو پہلے دس مسکینوں کو کھانا کھلائیے اس کے بعد بات کیجئے۔ یہ اسلام نے کفارہ کیوں رکھا ہے تاکہ لوگوں سے بری عادت نکل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسی قسم صحیح بھی ہے یا نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی قسم کھائے کہ واللہ میں اس مومن سے کبھی بات نہیں کروں گا کیا یہ قسم اسلام میں جائز بھی ہے جبکہ معصومین علیہم السّلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی مومن کسی مومن سے تین دن تک قطع تعلق رکھے تو اسے اپنے ایمان کے بارے میں غور کرنا چاہئے اسی لئے اسلام نے ایسی قسموں کی اجازت نہیں دی ہے جب تک کوئی اس کی اسلامی بنیاد نہ ہو لیکن بہر حال اگر انسان نے ذاتِ واجب کی قسم کھالی ہے اور قسم کی مخالفت کی ہے تو قسم جیسی اہم شیٔ کی مخالفت کا کفارہ یہ ہے کہ وہ دس مسکینوں کو کھانا کھلادے لیکن اگر بجائے واللہ یا باللہ کے یہ کہدیا کہ میں خدا سے عہد کرتا ہوں کہ اگر میری نوکری لگ جائے گی تو پہلی تنخواہ راہ خدا میں دے دوں گا تو ظاہر ہے کہ نوکری لگنے سے پہلے کہنے میں کیا تکلیف ہوتی ہے۔ دنیا میں اتنی رشوت دینے کے عادی ہو گئے ہیں کہ منتوں کو بھی بطور رشوت استعمال کرنے لگے ہیں کہ شاید خدا سے یہ کہدیں تو جلدی کام کرا دے گا حالانکہ خدا کو کیا لینا ہے اس میں سے۔ خدا تو آپ کی تنخواہ کا محتاج نہیں ہے خدا تو آپ کی دولت کا محتاج نہیں ہے بلکہ دنیا میں کوئی دینے والا ہے تو وہ خود بھی اسی کا محتاج ہے لیکن اگر بندہ نے خالی یہ لفظ عہد استعمال کر دیا کہ میں خدا سے عہد کرتا ہوں اور اس کے بعد جب تنخواہ ہاتھ میں آگئی

تو اب نیت بدل گئی۔ دوستوں سے چائے کا وعدہ بھی تو کر رکھا ہے۔ احباب سے ناشتہ کا وعدہ بھی تو کر رکھا ہے۔ فلاں ہوٹل میں پارٹی کا وعدہ کر رکھا ہے تو ایسا کرتے ہیں کہ آدھا خدا کے لئے اور آدھا بندگان خدا کے لئے یا ۹۰٪ خدا کے لئے اور ۱۰٪ بندگان خدا کے لئے۔ نہیں اگر ایک پیسہ بھی تنخواہ میں سے غیر خدا پر خرچ کر دیا تو یہ ہے عہد خدا کی مخالفت اور اس کا کفارہ ہے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ یعنی پوری تنخواہ تو راہِ خدا میں جائے گی ہی، اس کے بعد اگر ایک پیسہ بھی کہیں اور لگا دیا تو اگلی تنخواہ جب اس کے بعد ملے گی تو ساٹھ مسکینوں کو اس میں سے کھانا بھی کھلانا پڑے گا بطور کفارہ۔ میں اس لئے وضاحت کر رہا ہوں تاکہ آپ عہد کی قیمت سمجھیں۔ اللہ کی قسم کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اللہ سے وعدہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے مگر خالی ایک لفظ عہد درمیان میں آگیا ہے تو کفارہ ساٹھ مسکینوں کا کھانا ہوگیا اور یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ یہی ہم آپ کر بھی سکتے ہیں ورنہ کفارہ تو عام ہے یا ساٹھ روزے رکھیں مسلسل کیوں؟ خدا سے کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔

اسی ایک بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین اسلام کی نظر میں عہد کی کتنی اہمیت ہے اور اس کی کیا عظمت ہے؟ عہد کے برابر نہ نذر کی اہمیت ہے نہ قسم کی اہمیت ہے۔ عظیم ترین وعدہ جو پروردگار سے ہوتا ہے اس کا نام ہے عہد (ایک لفظ اور یاد رکھئے گا) یہ اس عہد کا کفارہ ہے جو ہم نے خدا سے کیا ہے اگر کہیں خدا نے بھی کفارہ اس عہد کا رکھا ہوتا جو اس نے ہم سے لیا ہے تو قیامت ہی ہو جاتی۔

یاد رکھئے گا یہ تین لفظیں الگ الگ ہیں۔ ہم نے خدا سے عہد کیا ایک لفظ۔ خدا نے ہم سے عہد کیا دوسری قسم۔ خدا نے ہم سے عہد لیا یہ تیسری قسم۔ خدا نے ہم سے جو عہد کیا ہے وہ تو بہر حال وفا کرے گا وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ اللہ سے زیادہ اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہے؟ اسی آیت کریمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وفا اتنی عظیم صفت ہے جو بندوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ کمال وہ ہے جس کو پروردگار نے بھی اپنا کمال قرار دیا ہے۔ ہم سے زیادہ کون اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہے۔ اور یہ کہاں خدا نے حوالہ دیا اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ اللہ نے صاحبان ایمان سے ان کے جان و مال کو خرید لیا اور اس کے عوض میں جنت دے دی۔ صاحبانِ ایمان جب میدانِ جہاد میں آئے تو خدا نے اس کے مقابلہ میں انھیں جنّت دے دی۔ کون صاحبان ایمان ہیں يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ یہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں دشمن کو قتل بھی کرتے ہیں اور خود شہید بھی ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ خدا انھیں جنت دے گا۔ اس کے بعد اعلان ہوتا ہے وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ اور تم بالکل مطمئن رہو جو وعدہ ہم نے کیا ہے ہم پورا کریں گے اس لئے کہ خدا سے زیادہ اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہے۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میدان میں جانے کے بعد بھی کچھ ہچکچاہٹ تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خالی میدان تک پہنچنے کے لئے کہدیا ہے کہ تم راہِ خدا میں جہاد کرو ہم تمھیں جنت دیں گے اور جب ہم جا کے مر گئے تو بعد میں معلوم ہوا کہ نہ کوئی جنت ہے نہ کوئی کوثر۔ مالک نے واضح اعلان کر دیا وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ خدا سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہوگا۔ اَب تو اعتبار پیدا ہو جائے کہ جان دینے کا ارادہ تم کر دگے جنت ہم دیں گے قربانی تم دو گے جنت ہم دیں گے۔ ہم سے زیادہ کوئی اپنے وعدے کو پورا کرنے والا نہیں ہے۔

قرآن اتنی واضح لفظوں میں کہہ رہا ہے اور اتنا واضح اعلان کر رہا ہے کہ یہ ہمارا عہد ہے اور ہم سے زیادہ کوئی وفا کرنے والا نہیں ہے۔ اَب میدان میں مرنے کی کیا تکلیف ہے؟ اَب جان دینے میں کیا تکلف ہے؟ اس کے بعد اگر کوئی جان دینے سے گھبراتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے خود اپنی جنت کی فکر نہیں ہے۔ ہماری دعاؤں سے کوئی جنت میں نہیں چلا جائے گا۔ ہماری تعریفوں سے کوئی جنتی نہیں ہوگا۔ جنتی ہونے کا راستہ خدا نے کھول دیا ہے کہ میدان جہاد میں قدم رکھو۔ دشمن کو قتل کرو اور خود قتل ہو جاؤ۔ ہم تم سے وعدۂ جنت کرتے ہیں اور ہم سے زیادہ کوئی وعدے کو پورا کرنے والا نہیں ہے۔ عزیزو اگر اس کے بعد بھی کسی کو وعدۂ الٰہی پر اعتبار نہ ہو تو یہ انسان وہ ہوگا جس کا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ صلوات۔

تو ایک عہد وہ ہے جو ہم پروردگار سے کرتے ہیں اور ایک عہد وہ ہے جو پروردگار نے

ہم سے کیا ہے اور ایک عہد وہ ہے جو پروردگار نے ہم سے لیا ہے۔ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ اے اولاد آدم کیا ہم نے تم سے یہ عہد نہیں لیا ہے کہ خبردار شیطان کی بندگی نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ آج سے نہیں آدمؑ کے زمانے سے اگر آدمؑ کی اولاد ہو تو اپنے بزرگوں کی تاریخ یاد رکھنا۔ وہ روز اول سے تمہارا دشمن ہے۔ ہوشیار رہنا خبردار شیطان کی عبادت و اطاعت نہ کرنا وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ میری عبادت کرو هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہ وہ عہد ہے جو پروردگار نے ہم سے لیا ہے تو ہماری ساری زندگی کفاروں میں ہی گذر جاتی (نہیں میں اس سے زیادہ سخت لفظ بھی کہہ سکتا ہوں) خالی کفاروں میں نہ گذر جاتی۔ ہمارا شمار مسلمانوں میں بھی نہ ہوتا ہمارا شمار صاحبان ایمان میں بھی نہ ہوتا۔ اگر خدا کے لئے ہوئے عہد پر بھی کفارہ ہوتا جو خدا سے کئے گئے عہد پر ہے اس لئے کہ خدا نے جو عہد لیا وہ کتنا سنگین ہے؟ ہم تو جب کبھی کبھی وقت پڑ گیا تو خدا سے عہد کر لیتے ہیں۔ پوری زندگی گذر جاتی ہے منتوں میں خدا سے عہد کون کرتا ہے اس کی نوبت ہی نہیں آتی ہے مگر خدا نے جو عہد پہلے سے لے لیا ہے کہ میری عبادت کرو گے اور شیطان کی عبادت نہیں کرو گے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صبح کو موذن نے آواز دی آپ بستر پر لیٹے سنتے رہے اور وقت نماز چلا گیا۔ نہیں اٹھے۔ چلئے ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا کیوں اس لئے کہ خدا نے یہ عہد لے لیا تھا کہ ہماری عبادت کرو گے اور شیطان کی عبادت نہیں کرو گے۔ یہ شیطان کی اطاعت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ وقت نماز آ کر چلا گیا اور انسان بستر سے نہیں اٹھا۔ یہ اطاعت شیطان نہیں ہے تو کیا اطاعتِ خدا ہے۔ اس کے بعد بستر سے اٹھے اور کوئی فعل حرام انجام دے دیا۔ ۶۰ یہ بھی ہو گئے کہ عہد خدا کی خلاف ورزی ہو گئی۔

ایسا ہوتا تو پوری زندگی خالی کفارات میں گذر جاتی۔ یہ پروردگار کا رحم و کرم تھا کہ اس نے جو عہد لیا تھا اس پر کفارہ نہیں رکھا اور اس کو فقط ذریعہ امتحان قرار دیا ہے کہ جب ہماری اطاعت کا دامن چھوٹ جائے تو سمجھ لینا کہ گمراہ ہو گئے ہو یعنی لیا ہوا عہد اطاعت اور گمراہی کی علامت ہے اور کیا ہوا عہد وہ ہے جس پر کفارہ رکھا گیا ہے۔ صلوات۔

خیر اگر اس مسئلہ سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے تو خدا کرے آپ اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوں لیکن اگر مبتلا ہو گئے تو بہر حال اس کفارہ کو ادا کرنا پڑے گا جو پروردگار عالم نے متعین کیا ہے۔ میں تو یہ مسئلہ صرف اس لئے گذارش کر رہا تھا تاکہ آپ پہچان لیں کہ خدا سے کیا ہوا عہد کتنا زیادہ اہم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بندوں سے کئے ہوئے عہد کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ جو وعدہ لوگوں سے کیا ہے اُسے بھی پورا کرو لیکن اگر خدا نہ کردہ کسی مومن نے کسی سے وعدہ کیا اور وعدہ کو پورا نہ کر سکا تو غلط کیا۔ بداخلاقی ہو گئی لیکن یہاں ۶۰ مسکینوں کا کھانا نہیں ہے۔ یہ فقط اس عہد میں ہے جو بندہ نے خدا سے کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ عہد میں اگر لفظ خدا درمیان میں آ گیا تو اس کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی کہ مخالفت میں کفارہ واجب ہو گیا۔ اسی عہد کے ساتھ آتا ہے لفظ وفا۔ میں نے ابھی قرآن پاک کی آیت سنائی ہے۔ آپ کو وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ خدا سے زیادہ اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہے؟ تو اب اندازہ ہو گیا کہ جہاں عہد آئے گا اس کے ساتھ وفا کا آنا ضروری ہے۔ عہد کا مطالبہ یہ ہی کہ وفا ہونا چاہئے۔ وعدہ کا تقاضہ یہ ہے کہ وفا ہونا چاہئے۔ وہ وعدہ وعدہ نہیں ہے جو وفا نہ ہو۔ وہ عہد عہد نہیں ہے جو وفا نہ ہو سکے۔ ہر عہد اور ہر وعدہ کے ساتھ وفا کا ہونا ضروری ہے تو لفظ وفا وہیں استعمال ہوتا ہے جہاں پہلے کوئی وعدہ ہو کوئی عہد ہو۔ اگر اسلام بندوں سے وفا کا مطالبہ کرتا ہے تو اس سے پہلے کوئی عہد بھی ہونا چاہئے۔ اگر درمیان میں کوئی وعدہ نہیں ہے۔ کوئی عہد نہیں ہے تو وفا کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اسی لئے پروردگار عالم نے بار بار انسان کو وعدے یاد دلائے۔ وہ عہد یاد دلائے جو خدا اور بندوں کے درمیان ہوئے ہیں۔

ان میں ایک عہد عام ہے اور ایک عہد خاص۔

عہد عام وہ ہے جو ہر ایک سے لیا گیا ہے اور عہدِ خاص وہ ہے جو صرف کچھ لوگوں کے درمیان ہے اس کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عہدِ عام کے بارے میں میں نے ابھی عرض کیا۔ اے اولاد آدم کیا ہم نے تم سے اس

بات کا عہد نہیں لیا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ یہ ایک عام عہد ہے تمام اولاد آدمؑ اور خدا کے درمیان یعنی اگر آدمؑ کے بیٹے ہو تو خدا کی عبادت کرنا شیطان کی بندگی نہ کرنا۔ یہ ہے عہد عام اور خدا اپنے عہد کے لئے وفا کا مطالبہ کر رہا ہے۔ عہد خاص وہ ہے جس کا قرآن نے حوالہ یوں دیا ہے۔ لَقَدْ عَاهَدُوا اللّٰہَ ان لوگوں نے عہد کیا تھا اللہ سے۔

ان منافقین نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر ہم میدان جہاد میں چلے گئے، تو کبھی فرار نہیں کریں گے۔۔

یہ عہد منافقین کا خدا کے رسولؐ سے تھا کہ اگر ہم میدانِ جہاد میں گئے تو جم کر لڑیں گے اور فرار نہیں کریں گے۔

دوسرا عہد کچھ اور لوگوں نے کیا تھا کہ اگر خدا نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں مال دیدیا تو لَنَصَّدَّقَنَّ ہم راہ خدا میں سب کچھ لٹا دیں گے۔

یہ دو خصوصی عہد تھے جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے اور منافقوں کے ذیل میں کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ کاروبار مومنین نہیں کرتے ہیں۔ یہ صرف منافقین کی باتیں تھیں کہ ہم کو مال دے دے گا تو ہم راہِ خدا میں قربان کردیں گے اور میدانِ جنگ میں جائیں گے تو فرار نہیں کریں گے۔ پروردگار نے کہا یہ ایسے بے وفا ہیں کہ انھوں نے اپنے کسی عہد کو پورا نہیں کیا۔ ان کے نفاق کی علامت یہ ہے کہ ہم نے مال دے دیا تو انھوں نے راہِ خدا میں نہیں دیا اور میدانِ جنگ میں گئے تو ثباتِ قدم کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمیں کچھ کہنے کا حق نہیں ہے کہ کون مومن ہے اور کون منافق ہے؟ اس لئے کہ ایمان و نفاق تو دل کے اندر کا حال ہے ہمیں کسی کے دل کے اندر کا حال کیا معلوم مگر خدا خود کہتا ہے کہ انھیں پہچان لو۔ انھوں نے وعدہ کیا مگر جب ہم نے مال دے دیا تو یہ خود کیا دیتے؟ نبی مانگتا رہا اور نہ دیا۔ دیکھو تمہیں مجھ سے بات کرنے کا شرف مل جائے گا۔ میری محفل میں بیٹھنے کا شرف مل جائے گا۔ مجھ سے رازداری کا شرف مل جائے گا۔ کچھ تو راہِ خدا میں دے کر آؤ۔ ایک خرما ہی دے کر آؤ۔ مگر وعدے اتنے بڑے بڑے تھے اور وفا کی منزل میں کوئی نظر نہ آیا۔ میدانِ جنگ تک آبھی گئے خدا خود فرماتا ہے۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ

ارے وہ دن بھول گئے جب تم پہاڑ کی بلندیوں پر چلے جا رہے تھے اور رسول پکار رہا تھا مگر تم نے مڑ کے نہ دیکھا۔ رسول نے مال مانگا تو مال نہ دیا۔ میدان میں ثباتِ قدم چاہا تو ثابت قدم نہ رہے۔ خدا نے انھیں دونوں قسموں کا نام رکھا ہے نفاق۔ صلوات۔

اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسلام میں وفا صفتِ ایمان ہے اور بے وفائی صفتِ نفاق ہے منافق وہ ہے جو عہد کرنے کے بعد اس پر عمل نہیں کرتا ہے اسے وفا نہیں کرتا ہے۔ صاحبِ ایمان اگر وعدہ کرتا ہے تو اپنے عہد کو بہر حال پورا کرتا ہے اسی لئے پروردگارِ عالم نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔ صاحبانِ ایمان میں کچھ ایسے مرد بھی ہیں جنھوں نے اللہ کے کئے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے۔ اپنے عہد کو پورا کر دیا مِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ کچھ وہ ہیں جو گذر گئے وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ اور کچھ وہ ہیں جو اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قربانی کا انتظار کر رہے ہیں اپنی مدت کا انتظار کر رہے ہیں وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا اور ان کی مشترکہ صفت یہ ہے کہ ان کی بات بدلتی نہیں ہے۔ ان کی بات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ہے۔ تو صاحبان میں کچھ ایسے مرد ہیں جنھوں نے خدا سے عہد کیا تو اپنے عہد کو پورا کر دکھایا یعنی عہد کو پورا کرنا یہ انسانیت کا کام نہیں ہے۔ یہ عام مسلمانوں کا کام نہیں ہے۔ یہ تمام صاحبانِ ایمان کے بس کی بھی بات نہیں ہے بلکہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ مومنین میں بھی کچھ مردِ میدان ہیں جنھوں نے اپنے عہد کو پورا کر دکھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوفا بننے کے لئے دو صفتیں درکار ہیں۔ صاحبِ ایمان بھی ہو اور مردِ میدان بھی ہو۔ نعرۂ حیدری۔ صلوات۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ صاحبانِ ایمان میں کچھ ایسے مرد ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو وفا کیا سچ کر دکھایا۔ یہ صاحبانِ ایمان بھی ہیں اور مردِ میدان بھی ہیں۔ گویا کہ باوفا بننے کے لئے میدان کا ثباتِ قدم بھی درکار ہے اور دل کا مستحکم ارادہ بھی درکار ہے۔ دل میں اتنا مستحکم عقیدہ ہو کہ صاحبِ ایمان کہا جائے اور میدان میں اتنا ثبات ہو کہ مردِ میدان کہا جائے۔ لہٰذا جب بھی اسلام میں وفا کی تاریخ تلاش

کیجئے گا تو بے ایمانوں میں وفادار نہیں ملیں گے صاحبان ایمان میں ملیں گے۔ اور صاحبان ایمان بھی دو طرح کے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو خود اپنے کو باایمان کہتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے ایمان کی تصدیق خدا و رسول کرتے ہیں۔

وفا انھیں نہ ملے گی جو مدعی ایمان ہیں وفا انھیں میں ملے گی جو ثابت الایمان ہیں اور جن کا ایمان ثابت ہو گیا ہے۔ اب ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ کچھ کو خدا و رسولؐ نے صاحب ایمان کہا ہے کچھ کو خدا و رسول نے کل ایمان کہا ہے۔ صلوات، نعرۂ حیدری۔

لہٰذا اگر اس معیار پر وفا کو تلاش کیا جائے گا تو سب سے بڑا وفادار وہ ہوگا جو سب سے بڑا صاحب ایمان ہوگا اور اتنا عظیم صاحب ایمان ہوگا جو صاحب ایمان نہ کہا جائے گا بلکہ کل ایمان کہا جائے گا دوسرا معیار مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ مرد میدان درکار ہے اگر وفا کی تاریخ تلاش کرنا ہے تو تنہا ایمان بھی کافی نہ ہوگا۔ آؤ دیکھیں مرد میدان کون ہے؟ یعنی مجاہدین ڈھونڈنا ہے تلوار چلانے والے تلاش نہیں کرنا ہے میدان میں لڑنے والے نہیں۔ من المومنین رجال وہ میدان کا مرد ہو شاید یہی مصلحت رہی ہو کہ پیغمبرؐ نے کہا کل اس کو علم دوں گا جو صرف لڑنے والا اور جنگ کرنے والا نہیں ہوگا بلکہ رجلاً کرارا مرد میدان ہوگا۔ صلوات۔

کل اسے علم دوں گا جو مرد میدان ہوگا۔ رجلاً کرارًا غیر فرار یحب اللہ ورسولہ اللہ ورسول کا چاہنے والا ہوگا۔ اور اللہ و رسول اس کے چاہنے والے ہوں گے ولن یرجع حتّٰی یَفْتَحَ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ اور خالی لڑنے والا نہیں ہوگا کہ میدان میں آئے اور جان دے دی بلکہ ایسا مرد ہوگا جو میدان فتح کر کے آئے گا اور خدا اس کے دونوں ہاتھوں پر فتح دے گا اب اندازہ ہوا کہ اسلام میں یہ دونوں معرکے کتنے عظیم معرکے ہیں ۵ھ میں کل کفر سے مقابلہ خندق کے میدان میں۔ ۷ھ میں یہودیت سے مقابلہ خیبر کے میدان میں۔ اور علیؑ نے دونوں معرکوں سے دو صفتیں حاصل کیں۔ خندق کے میدان میں گئے تو نبیؐ نے کہا کل ایمان جا رہا ہے اور خیبر کے میدان میں گئے تو کہا رجلاً کرارًا جا رہا ہے۔ اب اگر خیبر و خندق میں کوئی اور بھی نظر آ جائے تو اسلام میں کوئی اور بھی باوفا ہوگا۔ صلوات۔ نعرۂ حیدری۔

لیکن ہم نے وفا کا یہ نقشہ دیکھا ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ جاؤ اور مسلمانوں کے سر بھی نہیں اٹھ رہے ہیں (اور حضور اب بات میں بات نکل آئی ہے تو یہ بات بہر حال کہنے میں آتی ہے کہ جو آدمی خود سر نہیں اٹھاتا ہے ہم اس کو کس منہ سے سر بلند کہہ دیں۔ سر اٹھائے تو سر بلندی ہاتھ آئے۔ پہلے موقع پر یہ مرقع دیکھا ہے اور دوسرے موقع پر اٹھتے ہوئے دیکھا مگر پنجوں کی طاقت سے سر کی قوت سے نہیں۔ وہ ایمان کا امتحان تھا اور یہ میدان کا امتحان تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان وفا کا فیصلہ ہو گیا۔ اب اس کے بعد ہم کہاں روایتوں کو، تاریخوں کو قصّوں کو کہانیوں کو ڈھونڈنے جائیں گے کہ فلاں کی وفا کا قصہ یہ ہے اور فلاں کی وفاداری کی کہانی یہ ہے۔ فلاں کی داستانِ زندگی یہ ہے اور فلاں کی روداد غم یہ ہے۔ ہمیں اس سے کیا واسطہ ہے۔ ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ ہم امتِ قرآن ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرکارِ دوعالمؐ کیا فرماتے ہیں۔ ہم امتِ سرکار دوعالمؐ ہیں۔ مورّخ کی امت میں نہیں ہیں۔ ہم محدث کی قوم میں نہیں ہیں۔ ہم خدا کے بندے ہیں۔ سرکار کے امتی ہیں۔ خدا نے کہیں وفا کی تعریف کی ہو تو بتائیے۔ نبیؐ نے کہیں مرد میدان کہا ہو تو بتلائیے۔ صلوات، نعرۂ حیدری۔

اب جب وفا کا ذکر ہو ہی رہا ہے تو ایک لفظ اور گذارش کر دوں۔ لفظ میں کہوں گا معنی آپ سمجھیں گے (یقیناً آپ سمجھیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے سامنے جو مجمع بیٹھتا ہے وہ سمجھدار ہوتا ہے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں فکر کرنے والے ہوتے ہیں غور کرنے والے ہوتے ہیں ان کے ذہنوں پر کوئی مہر نہیں لگی ہوتی ہے ان کے دماغ پر کوئی پابندی نہیں ہوتی ہے کہ یہ بات سوچنا اور وہ نہ سوچنا۔ ہمارا نعرہ ہے جہاں چاہے چلے جاؤ جس بزم میں چاہے چلے جاؤ۔ سنو دنیا کیا کہہ رہی ہے۔ اللہ نے صاحبانِ ایمان کی تعریف ہی یہ کی ہے اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ صاحبانِ ایمان وہ ہیں جو سنتے ہر ایک کی ہیں مگر جو ٹھیک ہوتا ہے اسی کو مانتے ہیں۔ یہ ایمان کی نشانی نہیں ہے کہ ہم سنیں گے ہی نہیں۔ خیر میں گذارش کر رہا تھا کہ ابھی تو بات یہ تھی کل اسے بھیجوں گا جو مرد میدان ہو گا۔ خیر مجھے نہیں بھیجا نہیں سہی۔

ایک تو ایسا خطرناک موقع خود پروردگار نے پیش کر دیا جس کے بارے میں تو کفر کی

تاویل بھی نہیں کرسکتا ہوں یہاں تو خالی علم دینے کا معاملہ تھا۔ دیا یا نہیں۔ یہ تو بعد کا مسئلہ ہے طے کرتے رہئے گا۔ نہیں دیا تو نہیں دیا۔ کوئی نہ کوئی تو تاویل ہو ہی جائے گی مگر دوسرا مرحلہ تو اس سے زیادہ سنگین ہے سن سات ہجری کی بات ہے جنگ خیبر میں یہودیوں کا مقابلہ۔ اب اس کے دوسال کے بعد یا ڈیڑھ سال کے بعد دوسرا معرکہ سامنے آگیا۔ پروردگار نے چاہا کہ اب دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ ہو جائے۔ بہت دنوں مشرکوں کو برداشت کیا گیا۔ بہت دنوں کافروں کی جسارت کو برداشت کیا گیا ۶ھ میں پیغمبر آئے عمرہ کرنے کے لئے مکہ میں نہیں داخل ہونے دیا۔ ۷ھ میں حضور آئے عمرہ قضا کرنے کے لئے۔ تین دن کے بعد کہا واپس چلے جایئے۔ اپنا گھر ہے وہ آ نہیں سکتے ہیں لہٰذا پروردگار نے طے کر دیا کہ اب ان نالائقوں کے ساتھ پیغمبرؐ آپ کا گذارہ نہیں ہے۔ اب سارے معاملے ختم، سارے قصے تمام۔ اب اس کے بعد خانۂ خدا ہے اور آپ ہیں۔ ارض حرم ہے اور آپ ہیں۔ نہ کوئی کافر نہ کوئی مشرک خدا نے اس معاہدے کو توڑنے کا اعلان کر دیا اور آیتیں نازل ہوگئیں۔ اللہ کی طرف سے، رسول کی طرف سے بیزاری کا اعلان مشرکوں سے۔ اب اللہ و رسول مشرکین سے بیزار ہیں اب کوئی معاہدہ نہیں ہے بس چار مہینے کے بعد کھلا ہوا مقابلہ ہوگا۔ اعلان کرنے کے لئے آیتیں آگئیں جس کو سورۂ برأت یا سورۂ توبہ کہا جاتا ہے لیکن سورہ برأت کی آیتیں خیبر کا علم نہیں ہیں کہ پیغمبرؐ علم لئے کھڑے ہیں۔ اسے دوں گا جو مرد میدان ہوگا۔ کرار و غیر فرار ہوگا آج پیغمبرؐ ایک وزن لئے کھڑے ہیں۔ یہ اسے دوں گا جو مجاہد ہوگا۔ ہمت والا ہوگا۔ طاقت والا ہوگا۔ مشرکین کے مجمع میں ان آیتوں کو پڑھ کر سنا سکے گا اور جو اس کا ری ایکشن، ردعمل ہوگا اسے برداشت کر سکے گا۔ منظر سامنے ہے وہاں تو رایت حضور کے ہاتھ میں تھا۔ آپ دیں گے یہاں آیتیں حضورؐ کے ہاتھ میں نہیں ہیں کہ لئے کھڑے ہیں کہ کس کو دیں گے۔ ایسا ہوگا تو دیں گے ویسا ہوگا تو نہیں دیں گے۔ نبیؐ نے تو دے دیا جو بھی مصلحت خدا رہی ہو۔ نبی نے تو عمل کر دیا لیکن جب نبی دے چکے اور قصہ تمام ہو گیا تو اب اُدھر سے نمائندۂ پروردگار آرہا ہے اور پیغام لے کے آرہا ہے کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ اب پیغمبر کو پلٹ کر کہنا چاہئے کہ میں نے

کیا گیا؟ میں تو بغیر وحی خدا کے بولتا بھی نہیں ہوں. میں مشیت کے خلاف کوئی کام کیسے کر سکتا ہوں. اگر میں نے خدا کے خلاف کوئی کام کیا ہوتا تو پہلا کام ان کو معزول کرنا نہ ہوتا بلکہ جب ملک آتا تو پہلا پیغام یہ ہوتا کہ نامہ بر کے بجائے آپ کو پیغمبری سے معزول کیا جاتا ہے۔ اگر آپ ہمارے احکام پر عمل نہیں کر سکتے ہیں تو آپ کو پیغمبر رہنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر نہیں پیغمبر کو تو معزول نہیں کیا گیا. پیغمبرؐ سے تو خالی یہ کہا گیا کہ یہ کام بڑا عظیم ہے. یہ کام بڑا اہم ہے. یہ کام بڑا سنگین ہے میرے حبیب اس کام کے لئے لَا یُبَلِّغُهَا یا بعض روایات میں لَا یُؤَدِّیهَا کوئی اس کو پہونچائے گا نہیں یا اسکی تبلیغ نہیں کرے گا اِلَّا اَنْتَ اَوْ رَجُلٌ مِّنْکَ وہ مرد جو آپ سے ہو۔ یا پہلے سے ہی لگا ہوا ہے یا آپ یا وہ مرد جو آپ سے ہو تو پیغمبرؐ کہتے کہ یہی تو میں نے کیا ہے کہ خود نہیں جا سکتا تھا دوسرے کو بھیج دیا ہے جبریل امین کو زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن اصل مسئلہ ہے کہ رجل منک وہ شخص جو مرد میدان بھی ہو اور آپ سے بھی ہو اور ایسا سوائے علیؑ کے کوئی دوسرا نہ تھا۔

بہر حال علیؑ گئے اور بالآخر سورہ برائت کا پیغام پہونچا دیا. اب بیچ کے قصہ کو تاریخ میں پڑھ لیجئے گا. مجھے ان قصوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے. میں تو خالی قرآن مجید کے اس لفظ کے بارے میں عرض کر رہا تھا کہ تم جاؤ. جا کے یہ پیغام پہونچا دو یا وہ جو تم سے ہو جس سے صاف اندازہ ہو گیا کہ پروردگار عالم نے جو لفظ علیؑ کے لئے کل خیبر میں استعمال کرایا تھا رجلاً کرارا آج جب قرآن کی آیتیں لے کر جانے کا موقع آیا تو پھر اسی کو دہرا دیا رَجُلٌ مِّنْکَ اب اسلام میں دو طرح کے معرکے ہیں یا تلوار کا معرکہ ہے یا زبان کا معرکہ ہے مگر ہم نے سارے معرکوں میں مرد میدان ایک ہی کو دیکھا. زبان کا معرکہ تھا تو وہی ایک مرد میدان دیکھا اور تلوار کا معرکہ ہوا تو وہی مرد میدان دکھائی دیا. صلوات.

(لیکن عزیزانِ گرامی اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک جملہ اور کہہ دوں تاکہ بات نامکمل نہ رہ جائے) ادھر ۵ھ میں کل ایمان ادھر ۷ھ میں رجل کرار ادھر ۹ھ میں رجل منک لہٰذا تلوار کا معرکہ بھی اسی مرد میدان کے ہاتھوں زبان کا معرکہ بھی اسی مرد میدان کے ہاتھوں زیچ پر ایک

بات نامکمل رہ جائے گی جو ۳ھ اور ۵ھ کے بیچ میں ہے ۵ھ میں جنگ خندق ۷ھ میں جنگ خیبر، درمیان میں ۶ھ میں ہے صلح حدیبیہ۔ جہاں پیغمبرؐ نے کفار سے صلح کی ہے۔ صلح جس کا نام ہے صلح حدیبیہ۔ جہاں نہ زبان چلی نہ تلوار چلی بلکہ یہاں صلح حدیبیہ میں تیسرا معرکہ ہو گیا اور قلم چل گیا۔ اب دیکھئے یہاں کا حال کیا ہوتا ہے یہاں شکست یا فتح کیسے ہوئی۔ قدرت نے آواز دی اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا پیغمبرؐ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح دی ہے یعنی معرکۂ قلم میں بھی اسلام فاتح ہو گیا ہے تو اب دیکھنا ہے کہ یہ قلم کس کے ہاتھ میں ہے نہ جانے کیا مصلحت تھی پیغمبرؐ کی کہ قلم دیا جائے تو اسی ہاتھ میں دیا جائے جس میں تلوار دی جائے اور زبان چلے تو اسی انسان کی زبان چلے جس کا ہاتھ چلے۔ ہر معرکہ میں واضح ہو جائے کہ ایسے افراد مرد میدان ہوتے ہیں۔ اب قرآن آواز دیتا ہے مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیۡہِ صاحبانِ ایمان میں ایسے مرد بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کر دیا۔

عزیزو! ہم نے بھی بڑے عہد کئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ خدا نے ہی سارے عہد ہم سے لئے ہیں، نہیں ہم نے بھی بڑے عہد کئے ہیں اور ہر عہد کے بارے میں ہم سے سوال ہوگا جس دن ہم نے کہا تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یہ بھی خدا سے خدائی کا عہد تھا۔ یہ خالی کلمہ نہیں ہے۔ یہ خدا سے عہد ہے کہ کسی کے سامنے نہیں جھکیں گے اور جھکیں گے تو صرف تیرے سامنے جھکیں گے جب ہم نے کہا اَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰہِ تو یہ سرکار دو عالم سے عہد ہے کہ حضور بس آپ ہمارے پیغمبر ہیں۔ دنیا کی ساری طاقتیں ایک طرف ہوں اور آپ اکیلے ایک طرف ہوں تو بھی آپ کی بات مانیں گے اور کسی کی بات نہ مانیں گے۔ اسلام کا ہر کلمہ ایک عہد ہے۔ اسلام کا ہر لفظ ہر عقیدہ ایک عہد و پیمان ہے جو انسان اور معبود کے درمیان یا انسان اور پیغمبر کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ سب عہد ہیں جو ہم نے خدا و رسول سے کئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنے عہد کو نہیں بھولتے ہیں (ایک یہ موقع سن لیجئے اور بات تمام ہو جائے) اللہ سے کئے ہوئے عہد کو انسان کیسے پورا کرتا ہے جب سرکار دو عالمؐ نے پروردگار سے تبلیغ اسلام کا عہد کر لیا

کہ معبود تیرے حکم کو ضرور پہونچاؤں گا تو اپنے عہد پر ثابت قدم رہے کہ دولت آئی ٹھکرادیا۔ حکومت آئی ٹھوکر مار دی۔ عورت لے کر آئے ٹھکرادیا۔ مجھے نہیں چاہئے یہ عورت، یہ دولت، یہ شہرت، یہ جاہ وجلال، اسکی کیا حیثیت ہے لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ عَلٰی یَمِیْنِیْ وَالْقَمَرَ عَلٰی یَسَارِیْ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے اور مجھ سے مطالبہ کیا جائے کہ میں کار تبلیغ کو چھوڑ دوں اور خدا کی طرف دعوت نہ دوں تو ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ میں مر سکتا ہوں یہ کام نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے خدا سے عہد کرلیا ہے میں اپنے عہد کے خلاف نہیں کر سکتا ہوں۔ اب آپ کو اندازہ ہوا کہ اسلام کے پہلے وفادار کا نام ہے پیغمبرؐ جسکی شان وفا یہ ہے کہ اگر چاند، سورج بھی ہاتھ پر رکھ دئے جائیں تو اس بوجھ کو اٹھا لے گا لیکن اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی ایسا ہی وفادار ڈھونڈنا ہے تو کوئی ایسا وفادار ڈھونڈ کے لاؤ کہ بڑی سے بڑی طاقتیں آجائیں لیکن وفا میں فرق نہ آئے۔ اس کا کمال وفا یہ ہے کہ اس کے اشارے پر مغرب سے ڈوبا ہوا سورج نکل آیا تو اس نے اپنے عہد بندگی کو یاد رکھا اور سورج پلٹانے کے بعد اپنے جاہ وجلال کا اعلان نہیں کیا بلکہ سجدۂ پروردگار کیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ ایسے باوفا پیغمبر کی جگہ پر اگر کوئی آئے گا تو ایسا ہی باوفا بندۂ پروردگار ہوگا جو خدا سے عہد کرے اور اسکی خلاف ورزی نہ کر سکے۔ اب آگے میں کس کس کا ذکر کردں اسلام تو صرف یہ کہتا ہے کہ تم نے جس سے جو عہد کیا ہے اسے وفا کرو یا اسی عہد کی عظمت کو سمجھانے کے لئے سرکار دو عالمؐ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ حضور اعلان کر کے آگے نہیں بڑھے کہ اعلان کی مخالفت ہو جائے بلکہ اعلان کے بعد تین دن قافلہ کو روک کر رکھا۔ تاکہ سب آکر مبارکباد دیں اور درحقیقت یہ مولائیت کی مبارکباد نہیں ہے بلکہ غلامی کا عہد ہے۔ نعرۂ حیدری۔

یہ مولا کے سامنے، مولا کے مقابلہ میں غلامی کا عہد وپیمان ہے جو سرکار دو عالمؐ لے رہے ہیں۔ اب ہم تو انھیں کو باوفا کہیں گے جو اپنے عہد پر قائم رہ گئے ورنہ ہماری تاریخ وفا میں دوسرے انسانوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حجاج ابن یوسف نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ علیؑ کے سب سے بڑے دوست کو ماروں تاکہ خدا کے دربار میں بڑا درجہ حاصل ہو جائے مجھے بتاؤ کہ

کا سب سے بڑا دوست کون ہے تاکہ میں اسے قتل کر کے بارگاہِ خدا میں تقرب حاصل کروں۔ لوگوں نے کہا کہ قنبر باقی رہ گئے ہیں جو علیؑ کے سب سے پرانے دوست ہیں۔ سب سے پرانے چاہنے والے ہیں۔ قنبر کو تلاش کیا گیا اور اس کے بعد لاکر سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کہا قنبر تم علیؑ کے چاہنے والے ہو؟ کہا چاہنے والے تو بہت ہیں وہ بڑے لوگ ہیں۔ میں تو صرف غلام ہوں۔ تو کیا جانے کہ علیؑ کے چاہنے والے کیا ہوتے ہیں؟ میں تو مولیٰ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا غلام رہوں گا۔ کہا شاید تمہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ میں نے آج یہ طے کر لیا ہے کہ جو علیؑ کا سب سے بڑا عظیم قدیم غلام چاہنے والا ہوگا اسے قتل کر دوں گا اور اس کے ذریعہ بارگاہِ خدا میں قربت حاصل کروں گا اور لوگوں نے بتایا کہ تم سے زیادہ قدیم ترین علیؑ کا چاہنے والا کوئی نہیں ہے۔ اب بھی غنیمت ہے یہ تلوار سامنے ہے۔ یہ جلاد کھڑا ہے۔ اگر تم جان بچانا چاہو تو خالی زبان سے کہہ دو کہ ہم علیؑ کو نہیں چاہتے ہیں علیؑ سے کوئی محبت نہیں ہے۔ ہم اتنا بھی مان لیں گے۔ ہم دل چیر کر دیکھنے نہیں جائیں گے۔ تم اتنا کہہ دو کہ ہمارا علیؑ سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہیں معاف کر دیں گے، چھوڑ دیں گے۔ کہا ظالم یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا بکواس کر رہا ہے یہ کیا بے ہودہ بات ہے۔ میں کہہ دوں کہ میں مولا کا چاہنے والا نہیں ہوں، تو میں ہوں کیا؟ میں مسلمان کیسے رہوں گا؟ صاحبِ ایمان کیسے رہوں گا۔ بھلا میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہا تو سزا معلوم ہے۔ کہا ہاں سزا کے لئے تیار ہوں۔ عہد غلامی کیا ہے تو اب اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہا اچھا اگر قتل ہونے کے لئے تیار ہو تو بتاؤ کہ تمہاری نگاہ میں قتل ہونے کے لئے سب سے آسان یا سب سے مشکل طریقہ کیا ہے؟ تمہیں کیسے قتل کیا جائے؟ یعنی زیادہ تکلیف برداشت کرو گے یا کم تکلیف برداشت کرو گے۔ اگر زیادہ تکلیف برداشت کر سکتے ہو تو پہلے ہاتھ کاٹے جائیں پیر کاٹے جائیں، زخم لگائے جائیں، مجروح کیا جائے۔ اور آخر میں گلا کاٹ دیا جائے اور اگر زیادہ تکلیف نہیں برداشت کر سکتے ہو تو خالی گلا کاٹ دیا جائے۔ بتاؤ کس طریقے سے تم قتل ہونا چاہتے ہو۔ سنئے آپ یہ درجۂ مودت ہے۔ علیؑ کے غلاموں کا۔ یہ شانِ وفا ہے کہ مرنے کے لئے تیار ہیں اور آخر میں صرف ایک جملہ کہہ دیا۔

حجاج یہ مجھ سے کیوں پوچھتا ہے اپنے دل میں خود فیصلہ کرلے کہ کیسے تجھے قتل ہونا ہے جیسے قتل ہونا ہے ویسے قتل کر دے۔ کہا قنبر ابھی تم ہوش میں نہیں آئے ہو۔ میں نے تم کو بلایا ہے تمہیں قتل کرنے کے لئے۔ یہ تم کیا نئی بات کر رہے ہو کہ میں فیصلہ کروں کہ مجھے کیسے قتل ہونا ہے؟ قنبر نے فرمایا حجاج اگر تو مسلمان ہے تو آخرت پر ایمان تو ہوگا اور اگر آخرت کو نہیں مانتا ہے تو کافر ہے مسلمان نہیں ہے اور آخرت کو مانتا ہے تو خدا کی عدالت پر ایمان رکھتا ہوگا کہ جو یہاں کرو گے ویسا ہی وہاں برداشت کرنا ہوگا۔ اب تو جیسی سزا محشر میں میرے ہاتھ سے لینا چاہتا ہے ویسی ہی سزا یہاں مجھے دیدے۔ میں تو یہاں سے خوش ہو کر جاؤں گا کہ جرم محبت میں مارا گیا ہوں۔ تیرا کیا حشر ہوگا جو ظالمیت کے بدلے میں مارا جائے گا۔ صلوات۔

یہ ہیں عہدِ وفا والے جن کو وفا دار کہا جاتا ہے جن کی زندگی میں وفا ہے جفا نہیں ہے سرکار دو عالم کی شانِ وفا آپ نے دیکھی۔ مولائے کائنات، ائمہ طاہرین اور ان کے چاہنے والوں اور غلاموں کی شانِ وفا آپ نے دیکھی لیکن تمام باتوں کے بعد آخر میں مجھے ایک فقرہ کہنا ہے۔ نبیؐ سے بڑا صاحبِ وفا کوئی نہیں ہے۔ علیؑ سے بڑا صاحب وفا کوئی نہیں ہے۔ ائمہ طاہرین سے بڑا وفادار کوئی نہیں ہے مگر نہ جانے کون سا انداز وفا تھا کہ جب بھی ذکر وفا آتا ہے ذہن ایک ہی شخصیت کی طرف مڑ جاتا ہے اور ذہن میں ایک ہی تصوّر ابھرتا ہے جس کا نام ہے عباسؑ۔ میں نہیں جانتا کہ اس عظمت کا راز کیا ہے؟ میں نہیں جانتا کہ اس جلالت کا راز کیا ہے۔

اس رابطۂ وفا و عباس کا راز کیا ہے؟ (لیکن ایک لفظ اپنے موضوع سے متعلق کہہ کے ذکر مصائب کرنا چاہتا ہوں)

...

شاید ایک سبب یہ بھی ہو کہ اپنے کئے ہوئے عہد کو وفا کرنے والے اور ہوتے ہیں اور دوسروں کے کئے ہوئے عہد کو وفا کرنے والا اور ہوتا ہے۔ یہ مولا کے دل کی آرزو تھی۔ یہ مولا کے دل کی تمنا تھی کہ عقیل کسی بہادر خاندان کی عورت کا پتہ بتاؤ تاکہ میں اس سے عقد کروں اور جو اولاد پیدا ہو وہ کربلا میں میرے حسینؑ کے کام آئے۔ حسینؑ کے فدیہ کی فکر علیؑ کو ہے۔ حسینؑ پر قربان ہونے والے کی فکر علیؑ کو ہے۔ حسینؑ پر فدا ہونے والے کا انتظام علیؑ کرنا چاہتے ہیں یعنی بات

مولا کے ذہن میں ہے اور وفا کی فکر عباسؑ کے دل میں ہے اسی لئے جب عاشورہ کی رات آئی اور ایک مرتبہ زہیر بن قین نے کہا عباسؑ ذرا میرے ساتھ چلئے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور در حقیقت تمہیں صرف یہ بتانا ہے کہ جس دن کے لئے آپ کے بابا نے آپ کو مہیا کیا تھا وہ وقت آگیا ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے بابا نے جناب عقیل سے کچھ کہا تھا اور اسی بنیاد پر آپ کی مادر گرامی سے عقد کیا تھا کہ جو بہادر بچے پیدا ہوں گے وہ کربلا میں میرے حسینؑ کے کام آئیں گے. عباسؑ جس دن کے لئے تمہارا انتظام کیا گیا تھا وہ دن آگیا ہے. روایت کہتی ہے کہ ایک مرتبہ شیر نے انگڑائی لی رکابیں ٹوٹ گئیں اور آستین الٹ گئی اَتُشَجِّعُنِی فِی مِثْلِ هٰذَا الْیَوْمِ یَا زُهَیْر اے زہیر آج مجھے شجاعت کا جوش دلا رہے ہو. یہ عاشورہ کی رات درمیان میں ہے ذرا صبح تو ہونے دو. معرکۂ کارزار تو گرم ہو جانے دو. دیکھنا فاتح خیبر کا لال کیسے لڑتا ہے. ہائے رات تک یہ جوشِ جنگ تھا رات تک یہ حوصلۂ جہاد تھا مگر جب قربانی کا وقت آگیا اور کہا مولا مجھے بھی میدان میں جانے کی اجازت دیجئے تو فرمایا کہ بھیا کیسے اجازت دے دوں بچوں کی پیاس تو دیکھو اَجْرُکُمْ عَلَی اللّٰہ اتنی قربانیوں کے بعد اصحاب انصار چاہنے والے سب قربان ہو چکے علمدار سامنے آئے ہیں کہ مولا اب نفس تنگی کر رہا ہے کہاں تک برداشت کروں ظالموں کے طعنے کہاں تک برداشت کروں یہ مصیبتیں۔ ایک کے بعد ایک چاہنے والا، ایک کے بعد ایک جگر کا ٹکڑا قربان ہوتا جا رہا ہے. مولا کب تک میں برداشت کروں گا. اب غلام کو بھی اجازت دیدیجئے. میں بھی جا کے قربان ہو جاؤں. حسینؑ نے عجیب فقرہ فرمایا. بھیا کیسے جانے دوں "انت حامل لوائی" تم میرے علمدار ہو. تم میرے لشکر کے سردار ہو. اے عباسؑ جب علمدار ارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں (نہ سن سکو گے عزیزو نہ جانے حسینؑ نے یہ فقرہ کیوں کہا) بھیا جب سردار مارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں. ایک مرتبہ عباس نے دائیں دیکھا بائیں دیکھا کہا مولا وہ لشکر کہاں ہے؟ اب وہ لشکر کہاں رہ گیا ہے؟ جس کا مجھے سردار بنایا گیا تھا. آقا اب تو اجازت دے دیجئے. بالآخر حسینؑ نے کہا بھیا اگر جانا ہے تو بچوں کے لئے پانی کا انتظام کر دو (بس چند فقرے آپ متوجہ رہیں انشاءاللہ مثاب

ہوں گے) بھیا جاؤ بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ وہ شیر وفادار حسینؑ کا غلام مسلسل ساتویں تاریخ سے بچوں کی آواز سن رہا ہے۔ اپنے امکان بھر ہر فکر میں ہے کہ کیسے بچوں کے لئے پانی کا انتظام کیا جائے مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ حسینؑ نے کہا بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ آئے در خیمہ پر آواز دی۔ سکینہ! میری لال۔ سکینہ میری بیٹی سکینہ! سکینہ نے چچا کی آواز سنی دوڑ کے در خیمہ پر آگئی۔ چچا کیوں یاد فرمایا۔ کہا مولا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں بچوں کے لئے پانی کا انتظام کروں۔ جاؤ مشکیزہ لے آؤ میں جاتا ہوں پانی کا انتظام کرنے کے لئے۔ سکینہ مشکیزہ لے کے چلی چھوٹے چھوٹے بچے سکینہ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے۔ در خیمہ کے قریب بھتیجی نے چچا کے ہاتھ میں مشکیزہ دیا۔ بچوں کا دل ٹھہر گیا۔ اب تو سکینہ کا سقا جا رہا ہے۔ اب تو سکینہ کا چچا جا رہا ہے۔ اب تو پانی بہر حال آجائے گا۔ تو ہماری پیاس کی مدت ختم ہو رہی ہے۔ ہماری تشنگی کا دور تمام ہو رہا ہے۔ عباسؑ مشکیزہ لے کر حسینؑ کے پاس آئے۔ مولا سے اجازت مانگی۔ مولا نے رخصت کیا عباسؑ میدان کی طرف چلے (بس یہ تین منظر ہیں عزیزو اس سے زیادہ گذارش نہ کروں گا) میدان کی طرف چلے فرات پر ۴ ہزار تیر اندازوں کا پہرہ اور ایک علیؑ کا لال اکیلا دریا کا رخ کئے ہوئے ہے۔ قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ فوجوں کو ہٹایا۔ لشکروں کو پسپا کیا یہاں تک کہ عباسؑ فرات تک پہونچ گئے۔ گھوڑے کو فرات میں ڈال دیا۔ مشکیزہ تر کیا، پانی سے بھرا چلو میں پانی لے کر کہا۔ ظالمو مجھے بے کس نہ سمجھنا، مجھے بے بس نہ سمجھنا۔ پانی اب بھی میرے ہاتھوں میں ہے پانی اب بھی میرے قبضہ میں ہے مگر مطمئن رہو پیوں گا نہیں۔ میری بچی پیاسی ہے۔ میں وفادار ہوں میں بچوں کے لئے پانی لینے آیا ہوں۔ میں پانی پینے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ پانی کو پھینک دیا قبا کے دامن سے ہاتھوں کو خشک کیا۔ مشکیزہ کو لے کر چلے۔ چند قدم آگے بڑھے کہ ایک حملہ ہوا داہنا شانہ قلم ہو گیا۔ اب اور کوئی فکر نہیں ہے صرف یہ کہ مشکیزہ سلامت رہے اور آگے بڑھے بایاں شانہ بھی کٹ گیا۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے مشکیزہ سلامت رہے عباسؑ تیزی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ارے کیسے خیمہ تک یہ پانی پہونچا دوں۔ کیسے خیمہ گاہ تک پانی پہنچا دوں۔ اب جو تیر ستم مشک سکینہ پر لگا عباسؑ جھک گئے۔ ہائے اب خیمہ گاہ میں جا کے کیا کروں گا۔

گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔ اب میں خیمہ گاہ تک جانے کے قابل نہیں رہ گیا۔ عزیزو مشکیزہ پر سر جھکائے عباسؑ پشت زین پر بیٹھے تھے کہ ایک ظالم نے سر پر گرز آہنی مارا۔ علیؑ کا لال گھوڑے سے گرا سن لو سن لو عزیزو! میری بہنیں مائیں بھی اس فقرے کو سن لیں) ام البنین کو جب کربلا کی روداد سنائی گئی تو ام البنین نے ایک شعر پڑھا۔ اپنے عباسؑ کو یاد کر کے کہ کاش مجھے یہ کوئی بتا دیتا کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ میرا لال جب گھوڑے سے گرا تو اس کے ہاتھ نہیں تھے۔ ماں کو بیٹے کے زخمی ہونے کا خیال نہیں ہے۔ بیٹے کے شہید ہونے کا خیال نہیں ہے بس یہ بتا دو کہ کیا میرا شیر اس وقت گھوڑے سے گرا ہے جب اس کے ہاتھ سلامت نہیں تھے۔ سوچ سکو تو سوچو عزیزو۔ سر پر گرز لگا ہوا علیؑ کا شیر خاکِ کربلا کی طرف چلا۔ گرتے گرتے زندگی میں پہلی مرتبہ آواز دی۔ بھیا حسینؑ نے مقتل کا رخ کیا۔ چلتے چلتے تلاش کرتے کرتے بیٹھ کے سرہانے تک آ گئے بیٹھے سر اٹھا کے غازی کا اپنے زانو پر رکھا۔ عباسؑ نے سر ہٹا لیا۔ دوبارہ حسینؑ نے سر زانو پر رکھا عباسؑ نے پھر سر ہٹا لیا تیسری مرتبہ پھر زانو پر رکھا عباسؑ نے سر ہٹا لیا۔ حسینؑ نے کہا بھیا مجھے معلوم ہے کہ مجھے دیر ہو گئی بھیا میرے آنے میں تاخیر ہو گئی۔ میں تمہارے کام نہ آ سکا مگر عباسؑ کم سے کم سر زانو پر رکھنے دو سر کیوں ہٹا لیتے ہو بھیا کیا بات ہے؟ کہا آقا ایک بات سوچ رہا ہوں کہ میں دنیا سے جا رہا ہوں تو میرا سر آپ کے زانو پر ہے جب آپ کا وقت آخر ہو گا تو آپ کا سر کس کے زانو پر ہو گا۔ عباسؑ تم نہ گھبراؤ مقتل سے ایک آواز آئے گی آ میرے لال، آ میرے حسینؑ لو بھائی نے بھائی کو میدان میں چھوڑا۔ لاشہ کو چھوڑ کر حسینؑ چلے۔ اب حسینؑ کے پاس کچھ نہیں ہے۔ ایک عباسؑ کا علم ہے جسے لے کر آ رہے ہیں اور جیسے جیسے علم قریب آتا جا رہا ہے سکینہ کہہ رہی ہے بچو نہ گھبراؤ چچا آ رہا ہے بچو! پانی آ رہا ہے در خیمہ کے قریب علم آیا بچی نے خیمہ کا پردہ اٹھایا دیکھا علم آیا عباسؑ نہیں آئے کہا بابا میرے چچا کو کہاں چھوڑ کر آئے۔ ہائے چچا ہائے چچا مجھے معلوم ہوتا کہ ایک مشکیزہ پانی کی خاطر آپ میدان سے پلٹ کر نہ آئیں گے تو سکینہ پیاسی رہتی لیکن کبھی پانی کا نام نہ لیتی۔ مگر ہائے میرا مقدر واعماہ۔ واعباساہ۔ سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ □□

مجلس ۹

اخلاص اور ریاکاری

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

قسم ہے نٓ قلم اور تحریروں کی۔ پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمتوں کی بنیاد پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلندترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون ہے۔

آیاتِ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ کلام فضائل اور رذائل کے عنوان سے پیش کیا جا رہا تھا اس کے نویں مرحلہ پر انسانی اخلاق کی دو اور صفتوں کے بارے میں کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں۔

ایک صفت جو بہترین اور بلندترین صفت ہے اس کا نام ہے اخلاص اور ایک صفت جو بدترین اور ذلیل ترین صفت ہے اس کا نام ہے ریاکاری۔

اصل موضوع کو آپ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے اپنے عزیز بچوں کے ذہنوں کو ساتھ رکھنے کے لیے چاہتا ہوں کہ ان دونوں الفاظ کے معانی کی وضاحت کر دی جائے۔

خلوص یا اخلاص اور ریاکاری کے معنی کیا ہیں؟ ہمارے یہاں یہ سارے الفاظ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی لفظ خلوص، کبھی لفظ اخلاص، کبھی لفظ ریا، کبھی لفظ ریاکاری لیکن ہمارے یہاں جو تصوّر ان دونوں لفظوں کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ وہ اتنا گنجلک، مبہم اور غیر واضح

ہے کہ ہر آدمی کے ذہن میں ایک ہی خیال رہتا ہے کہ جو کام ہم کرتے ہیں وہ خلوص کی بنیاد پر ہوتا ہے اور جو کام دوسرے لوگ کرتے ہیں وہ ریاکاری کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ کوئی آج تک یہ سوچنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوا کہ شاید ہمارے ہی عمل میں ریاکاری پائی جاتی ہو۔ شاید ہمارے علاوہ کسی دوسرے انسان کے عمل میں بھی اخلاص پایا جاتا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک بزرگ کرم فرما تھے۔ ان کا ہمیشہ ہر موقع پر یہی اعلان ہوتا تھا کہ ہمارے کام میں خلوص پایا جاتا ہے اور باقی لوگوں کے کام کا حال نہیں معلوم ہے۔

ایک دن مجلس میں آدمی زیادہ آ گئے اور لوگوں نے کہا کہ ماشاء اللہ آج تو مجمع کافی ہے۔ فرمایا ظاہر ہے کہ جو کام خلوص سے کیا جاتا ہے اس میں برکت ہوتی ہے۔ دوسرے دن اتفاق سے اسی مجلس کے وقت کوئی اور مجلس تھی۔ مومنین دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور مجمع کم ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ آج مجمع کم دکھائی دے رہا ہے فرمایا کہ جو لوگ کام خلوص سے کرتے ہیں وہ مجمع کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔

یہ سوال میں نے اس لیے گذارش کی ہے تاکہ ہر انسان اپنے نفس اور اپنے اعمال کا محاسبہ کر سکے اور یہ اندازہ کر سکے کہ ہر آدمی کے ذہن میں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ زمانہ کے حالات کتنے ہی کروٹیں بدلیں۔ ہمارے عمل کا نام خلوص رکھا جائے اور دنیا کے عمل کا نام ریاکاری رکھا جائے ہم کارِ خیر میں پانچ پیسے دیدیں تو اس کا نام خلوص ہو جائے اور دوسرا شخص گھر بیچ کر ہزار دیدے تو اسے ریاکاری کہا جائے کہ دنیا کو دکھانے کے لیے دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ بھی دے دیجئے آپ کو کس نے منع کیا ہے۔ جب سب سے زیادہ پیسہ دینا ہو گا تو فکر یہ ہو گی کہ سب سے اوپر نام بھی لکھا جائے اور جب کم دینا ہو گا تو بندۂ خدا کے نام سے رسید کاٹی جائے گی تاکہ راز کھلنے نہ پائے جیسے سب بندۂ خدا بخیل ہی تو ہوتے ہیں۔ کیا بندگانِ خدا میں کارِ خیر کرنے والے نہیں ہوتے ہیں۔ کیا بندگانِ خدا میں اچھے بڑے کام کرنے والے نہیں ہوتے ہیں لیکن انسان کی یہ ایک فطرت ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ نہ ریاکاری کے معنی جانتا ہے اور نہ اخلاص کے معنی جانتا ہے۔ فقط جانتا ہے کہ میرے عمل کا نام خلوص رکھا جائے اور باقی سب کے اعمال

کوریا کہا جائے۔

اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ دو چار لمحے آپ کے اس نکتہ کے لیے صرف کروں کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔

قرآن مجید میں صاف صاف اعلان ہوتا ہے اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ دیکھو اگر تم صدقات، کار خیر علی الاعلان کرو تو بہترین عمل ہے اور اگر چھپا کر دو تو وہ بھی بہتر رہے گے۔ صدقہ کے معنی وہ نہیں ہیں جو ہمارے یہاں سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام میں صدقہ یعنی کار خیر، راہ خدا میں جو مال دیا جائے اس کا نام صدقہ ہی ہوتا ہے اور یہی صدقہ وہ ہے جو سادات پر حرام نہیں ہوتا ہے اس کے اپنے قواعد فقہی ہیں اس کو جب آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کوئی بھی کار خیر اگر مالی کار خیر ہے تو اس کا نام اسلام میں صدقہ ہی ہے۔ صدقہ ہر مالی کار خیر کا نام ہے بلکہ بعض اوقات مالیات کی بھی شرط نہیں ہوتی ہے جیسا کہ بعض روایات کی بنا پر اچھی بات کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔ اگر آپ نے کسی آدمی کو اچھی بات بتا دی تو آپ کا شمار پروردگار کی بارگاہ میں اہل صدقات میں ہوگا۔ اس لیے کہ آپ نے صدق دل سے ایک بہترین عمل انجام دیا ہے۔ تو قرآن مجید کا اعلان ہے اگر تم اپنے صدقات کا اظہار کرو گے اور مجمع عام میں صدقہ دو گے۔ فَنِعِمَّا هِيَ تو یہ بہترین بات ہے وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اور اگر چھپا کر فقراء کے حوالے کر دیا تو یہ بھی کا اچھا ہے۔

گویا قرآن نے ہمارا سارا نظام ہی الٹ دیا۔ ہم تو منتظر تھے کہ پروردگار عالم ہم غریبوں کی لاج رکھنے کے لیے یہ اعلان کرے گا اگر تم نے چھپا کر دیا تو یہ بہترین کام ہے لیکن اگر لوگوں کے سامنے دیا ہے تو چلو یہ بھی برداشت کر لیا جائے گا اور قبول کر لیا جائے گا مگر قرآن مجید نے لہجہ ہی بدل دیا کہ اگر تم نے صدقہ علی الاعلان دیا ہے تو انتہائی حسین بات ہے اور اگر چھپا کر فقیر کے حوالے کیا ہے تو یہ بھی خیر ہے اور بری بات نہیں ہے۔

اس لیے کہ دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اگر تم نے چھپا کر دیا تو تمہارا کار خیر تو ہو گیا

لیکن لوگوں میں جذبۂ کارِ خیر نہیں پیدا ہوا۔ کتنے بے چارے ایسے ہیں جو کارِ خیر کرنا چاہتے ہیں لیکن جانتے ہی نہیں ہیں کہ کارِ خیر کیا ہے۔ پیسہ رکھے بیٹھے ہوئے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں اور پھر جو حماقت سمجھ میں آجاتی ہے وہیں خرچ کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ صحیح راستہ نہیں معلوم ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں، سمجھدار ہیں، ہوشیار ہیں، مسائل جانتے ہیں، شریعت پہچانتے ہیں۔ اگر آپ نے چار آدمیوں کے درمیان کسی کارِ خیر میں چار پیسے دے دیے تو وہ بے چارے نادان، غریب، مخلص جن کو نہیں معلوم ہے کہ کارِ خیر کس کو کہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہو گیا کہ کارِ خیر کس چیز کا نام ہے اور وہ بھی اس راہ میں خرچ کریں گے اور ان کا پیسہ بھی صحیح راستہ پر خرچ ہو جائے گا اور ضائع اور برباد نہ ہوگا یعنی اس میں صدقہ بھی ہے اور ہدایت بھی ہے۔ صدقہ بھی ہے اور رہنمائی بھی ہے۔ صدقہ بھی ہے اور کارِ خیر بھی ہے اور دوسروں میں کارِ خیر کا شوق پیدا کرنے کا انتظام بھی ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مروّت میں لوگ آپ کے کارِ خیر کو دیکھ کر کارِ خیر کر ڈالتے ہیں تو آپ کو ثواب تو مل ہی جائے گا۔ ان کا معاملہ ان کے خدا کے حوالے رہے گا اور یاد رکھئے کہ پروردگار جس کو جتنا دیتا ہے اتنا ہی مانگتا ہے۔ اس نے جن کو کم دیا ہے ان سے کم مانگا ہے اور جن کو زیادہ دیا ہے ان سے زیادہ کا مطالبہ کیا ہے اور بات آ گئی ہے تو یاد رکھئے گا کہ اسلام نے کارِ خیر کی مقدار نہیں طے کی ہے نسبت طے کی ہے اور یہی اس کا پورا فلسفۂ مالیات ہے مثلاً خمس پانچواں حصّہ ہے پانچ روپے نہیں ہیں۔ زکوٰۃ سونے چاندی کے سکوں میں چالیسواں حصّہ ہے۔ غلّہ میں دسواں حصّہ ہے اور آپ نے سینچائی کی ہے تو بیسواں حصّہ ہے۔ گویا ہر جگہ اسلام نے نسبتیں رکھی ہیں مقدار نہیں رکھی ہے کہ اگر مقدار معین کر دی اور کوئی بڑی مقدار ہوئی تو سارے غریب فریاد کریں گے کہ اتنا ہم کو دیا نہیں ہے جتنا ہم سے مانگا ہے اسلام نے کہا کہ ہم نسبت طے کریں گے نیگر نہیں مثلاً "پانچواں حصّہ" کہ تمہارے پاس پانچ روپے ہیں تو تم سے ایک مانگیں گے اور کسی کے پاس پانچ سو ہیں تو اس سے سو مانگیں گے۔ کسی کے پاس پانچ ہزار ہیں اس سے ایک ہزار مانگیں گے۔ ایک کے پاس پانچ لاکھ ہیں تو اس سے ایک لاکھ لیں گے۔

پانچ روپے والے نے ایک دے دیا تو ہماری نگاہ میں بندۂ صالح ہے اور پانچ لاکھ والے

نے پچاس ہزار بھی دیدئے تو دلیل ہے کہ غریب نے پورا حق ادا کیا ہو اور امیر نے حق میں سے آدھا کھالیا ہے۔ ہمارے یہاں مقدار نہیں ہے اور اگر کہیں مقدار بھی معین ہے تو وہاں بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی اعتراض نہ ہونے پائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کہے کہ آپ نے زکوٰۃ کی مثال تو دے دی، خمس کی مثال دے دی لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہے کہ وہاں مقدار معیّن ہے مثلاً فطرہ میں کوئی نسبت نہیں ہے کہ جتنا پیسہ بچا ہو گا اس کا بیسواں حصّہ، دسواں حصّہ دینا ہو گا مقدار معین ہے تین کیلو۔ تو خدایا یہاں تین کیلو کیوں معیّن کر دیا۔ کسی غریب کے یہاں تین کیلو نہ ہوا تو کیا کرے گا آوازآئی تم نے ہمارا مسئلہ پڑھا ہی نہیں ہے۔ غریب کے پاس اگر نہ ہو گا تو ہم اس سے مانگتے ہی کہاں ہیں۔ ہم نے فطرہ میں شرط رکھی ہے کہ اگر غنی ہو گا، کھاتا پیتا ہو گا تو اس پر فطرہ واجب ہو گا ورنہ غریب فقیر ہو گا تو اس پر واجب ہی نہیں ہو گا۔ تو جہاں ہم نے مقدار معین کی ہے وہاں غریبوں کو پہلے ہی الگ کر دیا ہے اور جہاں سب کو شامل کرنا چاہا ہے وہاں نسبت طے کی ہے مقدار نہیں طے کی ہے تاکہ کسی کو ہم سے فریاد کرنے کا موقع نہ ملے اور نہیں ہر ایک سے تقاضہ کرنے کا حق ہے (صلوات)

تو عزیزانِ محترم بات دور نہ جانے پائے۔ پروردگار عالم نے اعلان کیا کہ اگر تم نے لوگوں کے سامنے منظر عام پر کار خیر کیا تو بہترین کار خیر ہے تو جب دونوں ہی خیر ہیں تو آخر ریاکاری کس چیز کا نام ہے اور دکھاوے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یاد رکھئے جو عمل دکھانے کے لیے ہوتا ہے اور جس عمل کو دکھا کے کیا جاتا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ریاکاری اس عمل کا نام ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ریاکاری اس عمل کو نہیں کہتے ہیں جو دکھا کر انجام دیا جاتا ہے۔ ورنہ عزیز و اگر منظر عام پر عمل کرنا کوئی عیب ہو جائے گا تو حق میدان سے بھاگنے والوں کے ساتھ ہو گا لڑنے والوں کے ساتھ نہیں ہو گا ——

—— اور ہر ایک پروردگار عالم کی بارگاہ میں یہی کہے گا کہ میدان میں مجمع زیادہ تھا اور ہم لوگوں کے سامنے کار خیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا کار خیر ایسی جگہ کے لیے تھا جہاں پیغمبر کو بھی نہ معلوم ہو سکے کہ کہاں چلے گئے۔

اسلام نے کہا کہ منظر عام پر میدان میں سب کے سامنے جہاد کیجئے۔ اس نے فرادیٰ نماز

کے مقابلہ میں جماعت کا ثواب ڈیڑھ سو گنا اس لیے زیادہ ہے کہ اگر دو آدمیوں کی جماعت بھی ہے کہ ایک امام ہے اور ایک ماموم۔ تو اسلام نے نماز کا ثواب ڈیڑھ سو گنا کر دیا ہے۔ گویا دو رکعت نماز نہیں پڑھی ہے بلکہ تین سو رکعت نماز پڑھی گئی ہے اور اگر ایک آدمی اور آگیا یعنی ایک پڑھانے والا اور دو پڑھنے والے تو ثواب کو اور دو گنا کر دیا۔ تین سو گنا پھر ایک اور آگیا تو چھ سو گنا، ایک اور آگیا تو بارہ سو گنا، ایک اور آگیا تو چوبیس سو گنا، ایک اور آگیا تو اڑتالیس سو گنا، ایک اور آگیا تو چھیانوے سو گنا۔ یہاں تک کہ اگر دس آدمی ہو جائیں تو پروردگار اعلان کرتا ہے کہ اب اتنا ثواب دوں گا کہ انسان اور جنات مل کر بھی حساب کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں گے۔ صلوات۔

پروردگار یہ بیچارہ مسلمان حجرے میں، گھر میں، کمرے میں کسی کوٹھری میں جا کر چپکے سے خلوص سے پڑھ لیتا کسی کے دیکھنے کا کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ یہ گھر سے نکال کر مجمع میں لا کر کیوں کھڑا کر دیا۔ ہر وقت ریاکاری کا خطرہ ہے۔

فرمایا اسی لیے ثواب بڑھا دیا ہے کہ شیطان کوئی وسوسہ پیدا نہ کرنے پائے۔ ورنہ اگر ایسے ہی وسوسے پیدا ہو گئے اور سب حجروں کے اندر ہی چلے گئے تو عورتیں کہاں پڑھیں گی؟ حجاب عورتوں کے لیے رکھا گیا ہے اور اسی لیے انہیں جماعت کا ثواب وہاں بھی ملتا ہے جب وہ اپنے گھر کے اندر سب سے آخری حجرے میں جا کر پڑھتی ہیں۔ اور پیغمبرؐ اعلان کرتے ہیں مَسْجِدُ الْمَرْأَةِ بَيْتُهَا اللہ نے عورت کے گھر ہی کو اس کے لیے مسجد بنا دیا ہے۔ خزانۂ الٰہی میں ثواب کی کوئی کمی نہیں ہے۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ دنیا کو دکھانے کے لیے جو کام کیا جائے وہ ریاکاری کہا جاتا ہے مگر دکھا کر لوگوں کے سامنے جو کام کیا جاتا ہے اس کو ریاکاری نہیں کہا جاتا ہے۔ اب آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ ریاکاری کا تعلق عمل سے نہیں ہے دل سے ہے، نیت سے ہے۔

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ جتنے بھی صفات ہیں اچھے یا برے ان سب کی دنیا ہاتھ پاؤں کی دنیا نہیں ہے۔ ان کی دنیا دل کی دنیا ہے۔ صفت اچھی ہو یا بری ہو۔ سب کا مرکز اندر ہی پایا جاتا ہے۔ اب اگر جذبہ دکھانے کا ہے تو اس کا نام ہو جائے گا ریاکاری اور اگر جذبہ خدا کے لیے

ہے تو ایک لاکھ انسان بھی دیکھ رہے ہوں گے تو عمل پر کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ شہید ثانیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر انسان اس خوف سے کہ کہیں مجمع میں جائیں تو ریاکاری نہ پیدا ہو جائے۔ گھر کے اندر بھی عمل کرے تو اس کا شمار بھی ریاکاری ہی میں ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے ذہن میں خدا نہیں ہے۔ بلکہ بندہ ہی بندہ ہی نہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ کام کر رہا تھا کہ لوگ دیکھیں اور یہ کام کر رہے ہیں تاکہ لوگ نہ دیکھیں۔ نہ خدا اس کے دماغ میں ہے نہ خدا اس کے دماغ میں ہے۔ تو جب تک لوگ اس کے ذہن میں رہیں گے خلوص نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ اخلاص کے معنی ہی یہ ہیں کہ دل کی گہرائیوں میں فقط پروردگار رہے اور اس کے علاوہ کوئی شئی درمیان میں نہ آنے پائے۔ صلوات۔

تو عزیزو یہ مسئلہ تھا ریاکاری کا۔ اب آئیے دیکھیں خلوص کے معنی کیا ہیں۔ خالص کے معنی سبھی جانتے ہیں۔ خالص مال دیکھا کسی نے نہیں ہے مگر جانتے سب ہیں۔ خالص کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی طرح کی ملاوٹ نہ ہو، کسی طرح کا میل نہ ہو کہ اگر ذرا سی بھی ملاوٹ ہو جائے چاہے سو میں ایک، چاہے ہزار میں ایک ہو تو اس کو خالص نہیں کہا جائے گا۔

اب ملاوٹ کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

کبھی کسی چیز میں کوئی چیز ملائی جاتی ہے جو دوسری جنس کی ہوتی ہے اور کبھی اسی میں کی کوئی جنس ملا دی جاتی ہے مگر ملاوٹ بہرحال ملاوٹ ہے۔

مثال کے طور پر دودھ میں پانی ملایا تو یہ بھی ملاوٹ ہے کہ اس میں پانی مل گیا ہے اور پانی دودھ نہیں ہوتا ہے اور اگر دودھ میں پنڈر گھول کر ملا دیا تو یہ بھی خالص نہیں ہے اس لیے کہ پنڈر اصلی دودھ نہیں ہے۔

اسی طرح اگر گھی میں تیل ملا دیا جائے تو یہ بھی خالص نہیں ہے اور اگر ڈالڈا ملا دیا جائے تو یہ بھی خالص نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اجنبی چیز دوسری جنس میں ملا دی جائے تو بھی ملاوٹ ہے اور اسی قسم کی کوئی دوسری چیز ملا دی جائے تو اس کا نام بھی ملاوٹ ہی ہے خالص نہیں ہے تو اب خالص صرف اس کا نام ہوگا جس میں کسی طرح کا میل نہ ہو نہ اسی قسم کا اور نہ دوسری قسم کا۔

اب پروردگار اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ اپنے دین میں

مخلص رہو. سوچو کہ یہ مطالبہ کتنا سخت ہے؟ دین میں اخلاص یعنی دین بالکل خالص ہو اس میں کسی طرح کی کوئی ملاوٹ نہ ہو اگر دین میں دنیا شامل ہو گئی تو بھی اس کا نام خالص نہیں ہے. اور اگر دین میں کوئی دوسرا دین شامل ہو جائے تو اس کا نام بھی دین خالص نہیں ہے. ایک آدمی عیسائی تھا مسلمان ہو گیا پہلے بھی دینِ عیسیٰ پر عمل کر رہا تھا اور اس کو دین خدا ہی سمجھ رہا تھا اس نے دس قانون لے لئے دین عیسیٰ کے اور نوے قانون دین خدا کے لئے اسلام سے تو کیا یہ آپ نے دینِ اسلام میں خالص کہا جائے گا ہرگز نہیں. اس نے دنیاداری کو نہیں ملایا ہے دین کو ہی ملایا ہے مگر اس دین کو ملایا ہے جس کو اب نہ ملانا چاہئے تھا. دورِ جناب عیسیٰؑ میں اسی قانون پر عمل کر رہا تھا اور یہ بندہ بندۂ مخلص تھا لیکن اگر پیغمبرؐ کے آنے کے بعد اس میں سے ایک بھی قانون کھینچ کر لایا تو یہ اسلام بس مخلص نہیں رہ گیا. تو چاہے دین میں دنیا ملائی جائے یا دین میں دین ملایا جائے اخلاص بہرحال ختم ہو جائے گا تو جب اس کو ملانے کے بعد جو دینِ خدا تھا جسے خدا نے بنایا تھا اور جو انجیل میں آیا تھا اسلام خالص نہیں رہ جاتا ہے تو اگر امتیوں کے قانون کو اسلام میں شامل کر لیا جائے تو اسلام کس طرح خالص رہ جائے گا۔

شریعت پیغمبرؐ میں ان کا حلال، ان کا حرام، ان کا مستحب، ان کا مکروہ، ان کا مباح، ان کا قیاس ان کا استحسان، ان کا خیال، ان کے مصالح مرسلہ، ان کا عمل، ان کا کردار، یہ سب اگر شامل کر لیا جائے تو اس کا نام دین خالص نہیں ہے. دین خالص فقط دین خدا ہے کہ نہ اس میں دنیا ملائی جا سکتی ہے نہ اس میں کوئی دین ملایا جا سکتا ہے. اللہ اپنے بندوں سے دین خالص چاہتا ہے تو اگر دین خالص اختیار کرنا ہے تو ہر عمل کے بارے میں یہ دیکھنا ہو گا کہ سرکار دو عالمؐ کیا قانون لے کر آئے تھے ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ کس فقیہہ نے کیا کہا تھا. کس کا ذہن کہاں تک پہنچا تھا جس کا ذہن جہاں چاہے لے جائے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ سرکار دو عالمؐ کا ارشاد گرامی کیا تھا اس وقت تک بات اختیار کرنے کے قابل نہیں ہے. دینِ خالص کے ماننے والے کردار پیغمبرؐ دیکھتے ہیں. اگر پیغمبرؐ کسی کی تعظیم کے لیے اٹھ جاتا ہے تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر پیغمبرؐ کسی کو اٹھا دیتے ہیں تو اسے اپنے دل میں جگہ نہیں دیتے ہیں. دینِ خالص والے نبی کو معیار

بنائے ہوئے ہیں. حضور کسی کو کاندھوں پر اٹھالیں تو اُس کو بلند مانتے ہیں. حضور کسی کو اپنی نگاہ سے گرادیں تو اس کو پست مانتے ہیں. دین خالص کا ایک معیار ہے کردار پیغمبرؐ جس میں کسی ملاوٹ کا کوئی امکان نہیں ہے. صلوات.

تو ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم دین میں مخلص رہیں. دین کے مخلص رہیں. کسی طرح کی کوئی ملاوٹ، کسی طرح کی کوئی خرابی دین میں نہ پیدا ہونے دیں. لیکن اب ایک نقطہ اور مجھے گذارش کرنا ہے جس کے بعد اصل موضوع کو عرض کرنا ہے تاکہ ان منزلوں سے گذرنے کے بعد اصل موضوع کو سمجھنا آسان ہو جائے.

انسان کی دو قسمیں ہیں. کچھ انسان ہمارے جیسے ہیں جو مخلص ہیں اپنے کو مخلص سمجھتے ہیں یا مخلص بننا چاہتے ہیں. مگر یہ سب ہمیں کہہ رہے ہیں کہ ہم مخلص ہیں یا ہماری محبّت میں آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ بڑے خلوص سے کام کر رہے ہیں یہ سب آپس ہی کا کاروبار ہے. نہ آپ کے خلوص پر کوئی خدائی سند ہے اور نہ میرے خلوص پر کوئی آسمانی دستاویز ہے. میں آپ کو سند دے رہا ہوں کہ میں آپ کے دل کا حال نہیں جانتا اور آپ میری تعریف کر رہے ہیں کہ آپ میرے دل کا حال نہیں جانتے ہیں. میں نے کہہ دیا کہ میری ساری تقریر اللہ کے لیے ہے تو آپ نے کہا کہ مولانا انشاء اللہ جھوٹ نہیں بولتے ہیں لہٰذا یقیناً مخلص ہیں.

آپ نے کہا میں تو اتنی دور سے دس میل، بیس میل سے دوڑ کے مجلس میں آتا ہوں خالص مولا کے لئے تو ہم بھی نہ کہیں گے کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں. لہٰذا ہم نے بھی کہا کہ بے شک بے شک. آپ کا سا مخلص مولا کو کہاں ملے گا لیکن یہ سب ہمارے درمیان کا کاروبار ہے کہ آپ کے مخلص ہم ہیں اور ہمارے مخلص آپ ہیں. نہ آپ کے پاس اخلاق کی کوئی سند ہے نہ میرے پاس اخلاص کا کوئی ثبوت ہے. اس لیے کہ سند تو وہ دے گا جو نیتوں کو جانتا ہو. ہم آپ جب ایک دوسرے کے دل کا حال جانتے ہی نہیں ہیں تو کیا بتائیں گے کہ ہم مخلص ہیں کہ ریاکار ہیں مکّار ہیں کہ منافق ہیں. ہم کیا جانیں ہم دل کا حال نہیں جانتے ہیں. گویا کسی انسان کا مخلص ہونا اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے جب اسے وہ مخلص کہے جو دل کا حال جانتا ہو. کوئی ایسی ذات اسے مخلص قرار دے

جو دل کے حالات سے آگاہ ہو۔ چاہے خود ذاتی طور پر آگاہ ہو یا اسے وہ بتادے جو دل کے حالات سے آگاہ ہے مثلاً خدا ہر ایک کی ذات کو پہچانتا ہے۔ وہ ہر ایک کے دل کے راز کو جانتا ہے تو اگر خدا کہدے کہ یہ میرا مخلص ہے یا جس کو خدا نے دل کے راز بتائے ہیں وہ کہدے تو انسان یقیناً مخلص ہے۔

ظاہر ہے کہ پروردگار عالم نے لوگوں کے دل کا حال اپنے حبیب کو بتایا ہے تو یا خدا بتائے گا کہ یہ بندۂ مخلص ہے یا وہ بتائے گا جس کو خدا نے دلوں کا حال بتایا ہو۔ اس کے علاوہ نہ کوئی کسی کا اخلاص ثابت کر سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کے اخلاص کے خلاف بیان دے سکتا ہے۔ بندۂ مخلص کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو اس کا مخلص ہونا اسی وقت ثابت ہوگا جب وہ مخلص ہے کہے جو دلوں کا حال جانتا ہے یا وہ کہیں جن کو دلوں کا حال بتایا گیا ہے۔ اب میں لفظیں بدل دوں کہ جب تک اُدھر کی کوئی سند نہیں آتی ہے ہمارے دھوکے رہتے ہیں۔ ہمارا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ ہماری سودے بازی ہوتی رہتی ہے اور سب مخلص بنے رہتے ہیں لیکن جب وہ کسی کو اس کے خلوص کی سند دے دیتا ہے تو اس کا نام ہو جاتا ہے بندۂ مخلَص۔ یعنی بندۂ مخلِص اور ہے اور بندۂ مخلَص اور ہے جیسے محب اور محبوب کہ جو چاہنے والا ہوتا ہے اس کا نام ہوتا ہے محب اور جس سے محبت کی جائے اس کا نام ہو جاتا ہے محبوب۔

گویا جب اخلاص اِدھر سے اُدھر جاتا ہے تو بندۂ مخلِص ہوتا ہے اور جب سند اُدھر سے آجاتی ہے تو بندہ مخلَص ہو جاتا ہے۔ اللہ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تم دین میں مخلص رہو اس لیے کہ تمہارے مخلَص ہونے کا امکان کم ہے۔

تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم اپنے دین کے لیے مخلص رہو۔ تو ہمارا کل کردار یہ ہے کہ ہم مخلص ہو جائیں چاہے مخلَص ہوں یا نہ ہوں لیکن اب آئیے ایک آیت اور پڑھیں۔

جب ابلیس ملعون کو نکالا گیا تو اللہ نے فرمایا فَاخْرُجْ فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ نکل جا تو مردود ہے وَاِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ اور قیامت تک تجھ پر میری لعنت ہے۔ خدا نے اپنی بارگاہ سے ابلیس کو نکال دیا۔ اور وہ سمجھ گیا کہ اپنی عاقبت خراب ہو چکی

ہے کہ جو خدا کی بارگاہ سے ملعون ہو کے نکلے اس کی عاقبت کے بننے کا کیا امکان ہوتا ہے لہٰذا اب باقاعدہ اکڑ کے چلا خدا کے سامنے فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ تیری عزت کی قسم۔ ذرا یہ جلال تو دیکھئے خدا کے سامنے تیری عزت کی قسم لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ میں سب کو گمراہ کروں گا جتنے ہیں کسی کو چھوڑوں گا نہیں۔ ایک میں کیا بہکا مجھے اتنی بڑی سزا دی گئی۔ مردود و ملعون تو کیا میں اکیلا رہوں گا۔ میں ایسے مردودوں کی ایک بڑی برادری بناؤں گا۔ میں ملعونوں کی ایک فہرست تیار کروں گا۔ میں سب کو گمراہ کروں گا إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ مگر ان بندوں کے علاوہ جو تیرے مخلص بندے ہیں۔ اب یہ نہیں جانتا میں کہ اس کا مطلب کیا تھا میں ان کو بہکاؤں گا نہیں۔ یا بہکا سکوں گا نہیں لیکن اس نے ایک فہرست کو الگ کر دیا کہ عباد مخلصین کے علاوہ میں سب کو گمراہ کروں گا۔

اب اس میں ایک جملہ کا اضافہ کرنا ہوگا۔ تب آپ کو عباد مخلصین کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ ابلیس کو نکالا گیا جناب آدمؑ اپنی جگہ پر ہیں اور ابلیس کو وہاں سے نکال باہر کیا گیا۔ اب اس کو فکر ہے کہ ہم اکیلے ہی کیوں رہیں؟ انھیں کی وجہ سے تو ساری مصیبت آئی ہے لہٰذا ان کو بھی آنا چاہئے اور مصلحت پروردگار بھی یہ تھی کہ آدم زمین پر آئیں انھیں جنّت کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہ اگر جنّت میں بیٹھے رہ گئے تو زمین میں خلیفہ کیسے ہوں گے لہٰذا ضرورت تھی کہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے اور کار خلافت کو انجام دینے کے لیے زمین پر آئیں کہ انھیں جنّت کا خلیفہ نہیں بنایا گیا ہے۔ جنّت میں فقط ساکن ہیں۔

تو جنت ہے آدمؑ کے سکونت کی جگہ اور زمین ہے آدم کی خلافت کی جگہ۔

سوال یہ ہے کہ یہاں سے وہاں جائیں کیوں کر؟

اب درمیان میں ایک شجرہ کی داستان آگئی کہ اس درخت کے قریب نہ جانا اور پھر ابلیس درمیان میں آگیا۔ اس نے بھی کہا کہ جانے سے منع کیا گیا ہے لہٰذا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جناب آدمؑ نے بھی کھا لیا تو خدا نے فرمایا۔ اب جاؤ۔

یعنی جناب آدمؑ نے اپنے حساب سے جانے کا راستہ نکالا تاکہ اپنی ڈیوٹی پر جائیں جہاں کے لیے بنائے گئے ہیں اور ابلیس خوش ہوا ہم نے سمجھا کر نکلوا لیا ہے اور بہکا دیا ہے۔ سجدہ نہ کرنے سے میں نکالا گیا تھا اور گندم کے کھانے سے یہ نکالے گئے ہیں۔ اُدھر شیطان خوش، اِدھر آدم مطمئن کہ میں وہاں پہنچ گیا جہاں کے لیے بنایا گیا تھا۔ لیکن عزیزو! وہ شیطان جس کا خیال یہ تھا کہ جس نے آدم کو بہکا لیا ہے۔ اور گمراہ کر لیا ہے۔

وہ بھی یہ کہہ رہا ہے کہ سب کو بہکاؤں گا مگر جو تیرے مخلص بندے ہیں ان کو گمراہ نہیں کر سکتا اب آپ کو اندازہ ہوا کہ اگر نگاہ ابلیس میں آدمؑ سے زیادہ مخلص افراد نہ ہوتے تو اس کو اطمینان سے کہنا چاہئے تھا کہ جب باپ کو گمراہ کر لیا ہے تو اولاد کی کیا قیمت ہے؟ جب جنّت میں رہنے والے کو بہکا لیا ہے تو زمین والوں کی کیا حیثیت ہے۔ میں سب کو بہکاؤں گا مگر اس نے چند افراد کو الگ کر دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ کبھی ادھر دیکھتا ہے اور کبھی اُدھر دیکھتا ہے۔ جب آدمؑ کی طرف دیکھتا ہے تو مطمئن ہو کر کہتا ہے کہ جب ان کو لے آیا تو ان کی اولاد کو بھی لے آؤں گا۔ لیکن جب اُدھر نگاہ اٹھی اور انوار قدسیہ کو دیکھا تو گھبرا کے کہہ دیا کہ خدایا تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی حربہ چلنے والا نہیں ہے تو اب ایسے بندے تلاش کرتا ہوں گے جو منزل اخلاص میں اتنے بلند ہوں جہاں ابلیس بھی اپنے کو ناکام سمجھ رہا ہو اور اپنی کمزوری کا اقرار کر رہا ہو۔ کہاں میں تاریخ کے سارے قصے سناؤں گا صرف ایک ہی واقعہ کافی ہے۔

پروردگار چاہتا تھا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ وہ کیسے ہوتے ہیں کہ جن سے ابلیس بھی اپنا ہار مان لیتا ہے۔ فرمایا تجربہ کرلے مصلّے کے پاس آجا، انگوٹھے کے پاس آجا، انگوٹھا چبانا شروع کر دے جب بھی بندے کے خلوص میں فرق نہ آئے گا۔ تو قدرت خود اعلان کرے گی اَنْتَ زین العابدین تاکہ اندازہ ہو جائے کہ جن کو بہکایا جا سکتا ہے وہ عابدین ہوتے ہیں اور جن پر کوئی حربہ نہیں چلتا ہے وہ زین العابدین ہوتا ہے۔ صلوات۔

یہاں یہ کہنے کی جرأت و ہمت نہیں ہے کہ ہم نے ان کو بہکا لیا۔ یہاں یہ سوچنے کی بھی طاقت نہیں ہے کہ ہم ان کو بہکا سکتے ہیں۔ یہ منزل وہ ہے جہاں ابلیس کو بھی اپنی شکست کا اعتراف کرنا

پڑتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے کچھ ایسے عبادِ مخلَص بھی ہیں جہاں اخلاص کا کوئی جواب نہیں ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ خلوص کے معنی یہ ہیں کہ کسی طرح کی ملاوٹ نہ ہو کہ اگر ذرا بھی ملاوٹ ہوگئی تو چاہے ملاوٹ باہر کی ہو یا اسی قسم کی ہو تو مال خالص نہ رہ جائے گا۔ تو اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک لفظ گذارش کردوں۔ ہم آپ جو نمازیں پڑھتے ہیں۔ انشاء اللہ بالکل خدا کے لیے پڑھتے ہیں اور کہیں سے دنیا دکھانے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا ہے۔ کہیں سے دنیاداری کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہے لیکن ہم نیت کرتے ہیں کہ مثلاً دو رکعت صبح کی نماز پڑھتے ہیں قربۃً الی اللہ۔ اللہ سے قریب ہونے کے لیے تو سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھیں گے تو جنّت مل جائے گی اور نہیں پڑھیں گے تو جہنم میں چلے جائیں گے۔ ہمیں صرف جنّت، جہنم کی فکر ہوتی ہے اس کے علاوہ قربِ الٰہی کے کوئی معنی ہم جانتے بھی نہیں ہیں۔

ہماری نگاہ میں یہی ثواب، عذاب ہوتا ہے اور ہم اسی جنّت و جہنّم کو پہچانتے ہیں۔ جو ہم کو کھینچ کر مصلّے پر لے آتا ہے۔ ماہِ رمضان میں روزہ رکھواتا ہے۔ جنّت و جہنّم سے اونچی کوئی لفظ ہمارے پاس ہے تو وہ ہے لفظ قربۃً الی اللہ۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ جو نماز جو روزہ جو حج جو زکوٰۃ جو عمل خیر ہم انجام دیتے ہیں۔ اللہ کے لیے ہوتا ہے یا اپنے لیے یہ ہم سمجھ بھی نہیں سکتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ یہ سارا کاروبار اپنے فائدہ کے لیے ہوتا ہے۔ چاہے وہ فائدہ جنّت ہی کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر ہم نے نماز پڑھی نوکری کے لیے تو وہ بھی گویا دودھ میں پانی ملایا ہے اور جنّت کے واسطے تو وہ بھی دودھ میں ملاوٹ ہے۔ فرق یہ ہے کہ دودھ نہیں ہے پنڈ ہے کہ جنّت بھی اسی خدا سے ملے گی جس کے لیے نماز ہے لیکن بالآخر پنڈو بھی تو ملایا ہی ہے اور ملاوٹ بہر حال ملاوٹ ہے۔ اب سوچیے ہم ڈھونڈ کے کتنی اونچی نیت لے کر آئے تھے اور کتنی اونچی نیت ہم نے تلاش کی تھی کہ جس میں سوائے خلوص کے کچھ نہ رہ جائے مگر معلوم ہوا کہ جو ہمارا خلوص تھا وہ بھی ایک ملاوٹ ہی نکلا تو ابلیس ہم سے کیوں ڈرے گا۔ وہ تو مخلَصین سے ڈرتا ہے مخلِص سے نہیں ڈرتا ہے۔

بس عزیزانِ محترم۔ آخری نقرہ۔ اس سے زیادہ اب موقع نہیں رہ گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ

اس لفظ اخلاص کی وضاحت ہو جائے۔ تو جتنا بھی ہمارا کام ہے۔ یہ پروردگار کا کرم ہے کہ ہمارے اس روزہ کو بھی قبول کر لیتا ہے جو اپنی قربت کے لیے ہو۔ ہماری اس نماز کو بھی قبول کر لیتا ہے جو جنّت کی طمع میں ہوتی ہے۔ ہمارے اس حج کو بھی قبول کر لیتا ہے جو جہنّم سے بچنے کے لیے ہوتا ہے۔ ہمارے ان اعمال کو بھی قبول کر لیتا ہے جن میں یہی سارے خیالات و تصورات ہوتے ہیں مگر واقعاً جو اخلاص ہے وہ بہر حال یہ نہیں ہے اس کی منزل اس سے بالاتر ہوتی ہے اور اگر آپ یہاں تک آ گئے ہیں تو آئیے دیکھیں وہ کون سے بندے ہیں جن کو دیکھ کر ابلیس بھی لرز جاتا ہے کہ انھیں گمراہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہی بندے وہ ہیں جن کے ذہن میں کوئی شئی سوائے خدا کے نہیں ہے۔ ان کے ذہنوں میں کوئی تصوّر سوائے ذاتِ پروردگار کے نہیں ہے اور اسی لیے ہم نے اتنی بڑی دنیائے اسلام دیکھی، اتنی بڑی دنیائے ایمان دیکھی۔ ایک سے ایک بڑے سلطنت والے، اقتدار والے خلافت والے، ریاست والے کو دیکھا مگر کسی کو خدا سے یہ کہتے ہوئے نہ دیکھا کہ پروردگار تیری جنّت کی طمع نہیں ہے۔ تیرے جہنم کا خوف نہیں ہے سب جنّت کی طمع کرنے والے اور جہنم سے خوفزدہ ہونے والے نظر آئے صرف ایک بندہ تھا جو خدا کی بارگاہ میں آواز دے رہا تھا اِلٰهِي مَا عَبَدْتُكَ شَوْقاً اِلٰى جَنَّتِكَ یہ سجدے، یہ بندگی، جنت کے اشتیاق میں نہیں ہے وَلَا خَوْفاً مِنْ نَارِكَ اور نہ جہنم کے خوف سے ہے بَلْ وَجَدْتُكَ اَهْلاً لَهَا فَعَبَدْتُكَ بلکہ تجھے عبادت کے لائق پایا ہے تو سر جھکایا ہے۔ میرا سجدہ جنت کے لیے یا جہنم کے خوف سے نہیں ہے میرا سجدہ صرف تیرے لیے ہے۔ تجھے اہل پایا ہے تو سر جھکا دیا ہے۔

ایسا بندہ ہو تو خدا اسے بندۂ مُخلَص قرار دیتا ہے اور ایسا بندہ ہو تو اس کے سامنے شیطان کو اپنی شکست تسلیم کرنا پڑتی ہے۔

یہ اللہ کے نیک خالص عمل کرنے والے بندے ہیں کہ جن کے عمل میں کوئی کسی طرح کی ملاوٹ نہیں ہے۔ ہر عمل خالص اور اللہ کے لیے۔ تنہا ذاتِ واجب کے لیے۔ ابلیس نے قدم قدم پر انھیں آزمایا مگر ہر مرحلہ پر سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ایسا نہیں ہے کہ ابلیس نے ان بندوں کو معاف کر دیا ہو۔ نہیں وہ ہر جگہ اپنی کوشش کرتا رہا۔ اس اعتراف کے بعد بھی کہ

اگر یہ بندہ مخلص ہوگا تو نہیں بہکے گا مگر یہ کوشش تو کرنی چاہئے تاکہ یہ معلوم رہے کہ یہ مخلص ہے یا مخلَص۔

کہاں کہاں بندگان خدا کو نہیں آزمایا اور کہاں کہاں بندگانِ خدا نے ابلیس کو شکست نہیں دی۔ اتنا سخت موقع کہ جہاں گھر میں آگ لگی ہو اور آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اور بجھانے کے لیے پانی نہ ہو اور کوئی سہارا دینے والا بھی نہ ہو سارے چاہنے والے، سارے محافظ سب سو رہے ہوں۔ ایسے موقع پر دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا جگر والا انسان ہوتا تو وہ بھی آگ دیکھ کے خیمہ سے باہر نکل جاتا لیکن جن کے پاس اخلاص تھا جن کی نگاہ میں پروردگار تھا وہ ایسے سخت وقت میں بھی خیمے سے قدم باہر نہیں نکالتے۔ پہلے آ کے عابدِ بیمار سے یہ پوچھا کر بیٹا تم بتاؤ اَب کیا کریں؟ حکم کیا ہے؟ ۔ اگر حکم خدا یہ ہے کہ اسی آگ میں جل کے مرجائیں تو ہم جل جائیں گے اور اگر حکم الٰہی یہ ہے کہ جلتے خیموں سے باہر نکل جائیں تو باہر جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہماری نگاہ میں فقط پروردگار ہے اور قانونِ الٰہی ہے۔ یہی قانون اجازت دے گا تو باہر نکل جائیں گے ورنہ انھیں شعلوں میں جل کر مرجائیں گے۔ عزیزو ثانی زہراؑ اس موقع پر جب خیموں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ عابدِ بیمار کے پاس کیوں آئیں۔ بیٹا بتاؤ حکم خدا کیا ہے جلتے خیموں میں مرجائیں یا خیموں سے باہر نکل جائیں۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ وقت آگیا ہے جب چادریں چھن گئیں۔ سروں پر چادریں نہیں رہ گئی ہیں لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ ایسے میں خیمہ سے باہر جائیں یا نہ جائیں؟ بغیر چادر کے خیمہ سے باہر نکل جائیں یا انھیں خیموں میں جل کے مرجائیں۔ چادر سلامت رہتی تو مسئلہ واضح تھا کہ چادر سنبھال کر باہر آسکتی ہیں۔ مادرِ گرامی نانا کے ساتھ آچکی ہیں مگر اس وقت صورتِ حال بدل گئی ہے اس لیے ثانی زہراؑ بھتیجے سے پوچھ رہی ہیں کہ بتاؤ باہر نکلیں یا یہیں مرجائیں۔

اربابِ عزا اب محرم آخری تاریخوں تک آگیا ہے اور اس کے بعد شبِ عاشور ہی آنے والی ہے لہٰذا آج ہمارے نوجوانوں کو لیلیٰ کے کڑیل جوان کا ماتم کرنا ہے۔ کوئی اس باپ کے دل سے پوچھے جو اُپنے بیٹے کو خود یہ سند دے رہا ہو کہ صورت میں، سیرت میں، گفتار میں، رفتار میں علی اکبرؑ سے زیادہ کوئی پیغمبرؐ سے مشابہ نہیں ہے مگر پھر بھی راہ خدا میں ایسے بیٹے کو قربان کرنا پڑے

یہ قلب حسینؑ ابن علیؑ ہی جانتا ہے مگر جب چاہنے والے کام آ گئے اور بنی ہاشم کی قربانی کا وقت آ گیا تو آواز دی بُنَیَّ تَقَدَّم اکبرؑ آگے بڑھو علی اکبرؑ سامنے آئے بن جانے کب سے انتظار کر رہے تھے کہ اجازت ملے اور بابا پر قربان ہو جائیں۔ چاہنے والے قربان ہو گئے۔ چاہنے والے قربان ہو رہے ہیں۔ اصحاب و انصار قربان ہو رہے ہیں اور گود کا پالا قربان نہیں ہو رہا ہے مگر وقت کا انتظار تھا۔ جیسے ہی بابا کا اشارہ ملا علی اکبرؑ سامنے آ کے کھڑے ہو گئے۔ بابا اجازت ہے کہ میدان میں جاؤں۔ کہا ہاں بیٹا اب میدان میں جانے کا وقت آ گیا ہے مگر تم کو پھوپھی نے بڑی مشقتوں سے پالا ہے۔ پہلے جاؤ جا کے خیمہ سے رخصت ہو کر آؤ۔ اب جو علی اکبرؑ خیمہ کے اندر آئے تو ماں کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے۔ مادر گرامی اجازت ہے جاؤں میدان میں؟ کہا بابا کیا فرماتے ہیں؟ کہا بابا تو اجازت دے چکے ہیں۔ صرف فرمایا جاؤ جا کے خیمے سے رخصت ہو کر آؤ فرمایا جب بابا نے اجازت دے دی تو میں کون روکنے والی۔ جاؤ میرے لال جاؤ جا کے بابا پر قربان ہو جاؤ۔ علی اکبرؑ آگے بڑھے، پھوپھی کے سامنے آئے۔ ثانی زہراؑ نے علی اکبرؑ کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اکبر خاموش کیوں کھڑے ہو، میرے لال چپ کیوں کھڑے ہو۔ کہا پھوپھی اماں اجازت دیدیجئے میں میدان میں جانا چاہتا ہوں، کہا بھیّا نے اجازت دے دی۔ کہا ہاں بابا نے اجازت دے دی ہے اور کہا ہے کہ جاؤ خیمہ سے رخصت ہو کر آؤ۔ کہا جب بھیّا نے اجازت دے دی ہے تو میں کون روکنے والی۔ اے اکبرؑ اگر ایک نہیں کتنے ہی اکبر ہوتے تو میں سب کو اپنے ماںجائے پر قربان کر دیتی۔ اَجْرُكُمْ عَلَى اللّٰهِ جاؤ میرے لال جاؤ۔ علی اکبرؑ خیمہ سے رخصت ہو کر چلنا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدانیاں آگے بڑھیں۔ اکبر اب تو جا رہے ہو۔ ایک لمحہ کے لیے ٹھہر جاؤ۔ ہم ایک حلقہ بنا لیں تم ہمارے درمیان سے گذر جاؤ۔ سیدانیوں نے حلقہ بنایا۔ علی اکبرؑ درمیان میں کھڑے ہوئے۔ ایک مرتبہ بیبیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ علی اکبرؑ جا رہے ہو مگر اِرْحَمْ غُرْبَتَنَا۔ ہماری غربت کا خیال رکھنا، ہماری بے کسی کا خیال رکھنا علی اکبرؑ نے مڑ کے کہا بیبیو! تمہیں اپنی غربت کا خیال ہے۔ میرے بابا کی غربت کا خیال نہیں ہے اجرکم علی اللہ خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غم آل محمدؐ کے۔ بس عزیزو!

بڑا نازک مرحلہ آگیا ہے۔ بی بیوں نے رخصت کیا علی اکبرؑ چلے۔ درِ خیمہ پر آئے۔ باہر نکلنا چاہتے ہیں مگر روایت کہتی ہے کہ کسی نے دامن پکڑ کر کھینچ لیا۔ علی اکبرؑ خیمہ میں پلٹ آئے۔ دوبارہ پھر نکلنا چاہتے ہیں پھر کوئی دامن پکڑ کر کھینچ لیتا ہے۔ بار بار خیمہ کا پردہ گرتا ہے اور اٹھتا ہے۔ مؤرخ کربلا کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ سات مرتبہ خیمے کا پردہ گرا اور اٹھا اور اب جو علی اکبرؑ نکلے تو اس شان سے نکلے جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔ عزیزو! مقتل میں نام تو نہیں ہے کہ کس نے دامن پکڑ کر کھینچا۔ کون بار بار علی اکبرؑ کو روک رہا ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ کسی بزرگ نے روکا ہوتا تو بازو پکڑا ہوتا۔ مجھے یہیں کہ کمسن بہن بڑھی ہو۔ بھیا تم بھی قربان ہونے کے لیے جا رہے ہو۔ علیؑ اکبر باہر آئے باپ نے بیٹے کو آمادہ کیا۔ سر پر عمامہ باندھا۔ کمر سے تلوار لگائی، اکبرؑ کو آراستہ کیا۔ بازو تھام کے گھوڑے پر سوار کیا۔ جاؤ میرے لال جاؤ۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ہمارا تمہارا سامنا رہے مڑ مڑ کے دیکھتے رہنا تاکہ میں تصویر پیغمبر دیکھتا رہوں میرا دل مطمئن رہے علی اکبرؑ چلے چند قدم آگے بڑھے۔ آہٹ محسوس کی مڑ کے دیکھا۔ بابا آپ نے تو رخصت کر دیا تھا۔ اب آپ کیوں آگئے۔ کہا بیٹا اگر تم صاحبِ اولاد ہوتے تو سمجھتے کہ جوان کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ اکبرؑ مقتل میں آئے جہاد ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد زخم کھانے کے بعد خون میں نہانے کے بعد پلٹ کر درِ خیمہ پر آئے۔ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے کے آئے ہیں اور باپ سے کوئی انعام نہیں مانگا ہے صرف ایک فقرہ کہا ہے ھَلْ اِلٰی شَرْبَۃٍ مِنَ الْمَآءِ سَبِیْلٌ بابا پیاس مارے ڈال رہی ہے۔ کیا ایک گھونٹ پانی کا کوئی راستہ ہے؟ حسینؑ نے کہا کہ بیٹا اپنی زبان میرے دہن میں دے دو۔ علی اکبرؑ نے زبان دے کے کھینچ لی۔ بیٹا یہ کیا کہا بابا آپکی زبان میں تو کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ حسینؑ نے انگشتری دی۔ کہا جاؤ بیٹا اب بابا تمہیں سیراب کریں گے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جب اکبرؑ پلٹ کے آئے مگر اس وقت پلٹ کے آئے جب خیمہ گاہ میں یہ تشویش تھی کہ اکبرؑ پر کیا گذر گئی اور فضہ نے آکے بتایا کہ ــــــ مولا کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علی اکبرؑ پر کوئی وقت پڑ گیا ہے اور سیدانیوں نے حلقہ بنا کے دعا کی: اَللّٰھُمَّ بِغُرْبَۃِ الْحُسَیْن پروردگار حسینؑ کی غربت کا واسطہ حسینؑ کی مظلومیت کا واسطہ۔ بیٹے

اکبرؑ کو پلٹا دے۔ علیؑ اکبر پلٹ کے آ گئے بی بیوں کا دل ٹھہر گیا کہ جب دعا کریں گے تو اکبرؑ میدان سے پلٹ آئیں گے۔ مگر رونے والو اب جو دوبارہ اکبرؑ چلے تو حسینؑ نے آ کے آواز دی کہ اب دعا نہ کرنا۔ اب میرا اکبرؑ مرنے کے لیے گیا ہے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی بابا بیٹے کا آخری سلام۔ حسینؑ کمر تھام کر چلے۔ میرے لال تم کہاں رہ گئے۔ پھر لال کے سرہانے آئے ایک مرتبہ دیکھا کہ سینہ میں برچھی کا پھل ٹوٹ کے رہ گیا ہے۔ باپ نے اس منظر کو دیکھا اور گھٹنے ٹیک کر علیؑ اکبر کے کلیجے سے برچھی کا پھل نکالنا چاہا۔ آواز دی یا علیؑ۔ بابا سہارا دو۔ بیٹے کا کلیجہ نکل آیا۔ حسینؑ نے مرثیہ شروع کیا۔ علی اکبرؑ میرے لال تم کو دنیا کے ہم و غم سے نجات مل گئی اور باپ نرغۂ اعدا میں اکیلا رہ گیا۔ وا محمداہ وا علیا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ

□□

مجلس ۱۰

شجاعت و خوف

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔

نٓ قسم ہے قلم کی اور تحریروں کی، پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمتوں کی بنا پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون اور دیوانہ کون ہے ۔

سنہ ۱۴۱۵ ہجری کے آغاز محرم کے ساتھ فضائل و رذائل کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام شروع کیا گیا تھا وہ آج اپنے آخری مرحلہ تک پہنچ رہا ہے۔ اسلامی اخلاقیات کی وضاحت میں میں نے ان کمالات کا بھی تذکرہ کیا جو نفس انسانی میں پائے جاتے ہیں اور ان کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی جو انسان کے نفس میں پائی جاتی ہیں۔ آج اس سلسلے کی ایک کڑی شجاعت و خوف یعنی بزدلی کا تذکرہ کرنا ہے ۔

انسانی نفس کے ایک بڑے کمال کا نام ہے شجاعت اور انسانی نفس کی ایک بڑی کمزوری کا نام ہے بزدلی ۔ اگرچہ آج زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس موضوع سے متعلق بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ صرف چند لفظوں میں ان کی وضاحت کر کے وہ تذکرہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو آج کی رات کے لیے زیادہ مناسب ہے ۔

شجاعت کے بارے میں عام تصور یہ پایا جاتا ہے کہ انسان کے دست و بازو کی قوت کے مظاہرہ کا نام ہے شجاعت۔ اگر انسان تلوار لے کر میدان میں آجائے تو اسے شجاع اور بہادر کہا جاتا ہے ورنہ نہیں حالانکہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو شجاعت کے مفہوم کے بارے میں پائی جاتی ہے۔

شجاعت طاقت کے مظاہرہ کا نام نہیں ہے۔ طاقت کو عقل کا پابند بنا دینے کا نام ہے اگر عقل و منطق کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان تلوار لے کر میدان میں آجائے تو میدان میں قدم جما دینا شجاعت ہے اور اگر عقل و منطق کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان میدان میں قدم نہ رکھے تو اپنے قدموں کو روک لینا ہی شجاعت ہے۔

تنہا تلوار چلانے کا ہی نام شجاعت ہوتا تو شاید بہت سے عقیدت مند یہ سوچ کر خوش ہو جاتے کہ وہ یقیناً کائنات کا سب سے بڑا شجاع اور بہادر ہوگا جو ایسا تلوار چلانے والا ہو کہ وہ یہاں کی تلواروں کا عادی نہ ہو۔ اس کے لیے وہاں سے تلوار آئی ہو لیکن اس کے بعد بھی ہم اپنے بنیادی عقائد کی بنا پر کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ ہم منزل کمال میں کسی کو بھی سرکار دو عالمؐ سے آگے بڑھا دیں ہماری نگاہ میں نبی نبی ہے۔ نفس نبی نفس نبی ہے۔ رسول رسول ہے۔ وصیٔ رسول وصی رسول ہے ہم نہ وصی کو رسول سے آگے بڑھانا جانتے ہیں نہ نفس کو نبی سے آگے کرنا چاہتے ہیں اور نہ گھٹانا جانتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر نفس کو گھٹا دیا تو پھر ذات کو گھٹانے میں کسر کیا باقی رہ جائے گی ہم اس اعتدال کو پہچانتے ہیں جس پر فکر انسانی کو چلنا چاہیے۔ لہذا ہماری نگاہ میں جب دنیا کے سارے بہادر، سارے سورما، سارے ساونت، سارے تلوار چلانے والے، سارے شمشیر زن آجاتے ہیں تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی کتنا ہی بڑا بہادر کیوں نہ رہا ہو۔ کوئی کتنا ہی بڑا تلوار کا دھنی کیوں نہ رہا ہو۔ کوئی تاریخ میں مجسّم تلوار ہی کیوں نہ ہو گیا ہو مگر منزل شجاعت میں کوئی ایسا نہیں نظر آیا جیسا ایک انسان دکھائی دیا۔ ہر ایک کی تلوار کی تعریف مؤرخ اور محدّث نے کی۔ ہر ایک کی تلوار کو سراہا۔ خطیبوں نے ہر ایک کی تلوار کو اونچا کیا۔ مسجد کے ملّاؤں نے۔ ہر ایک کی مدح سرائی کی۔ زمین والوں نے مگر آسمان پر کسی کی تلوار کی تعریف نہیں ہوئی وہاں

صرف ایک ہی مجاہد، ایک ہی سپاہی، ایک ہی انسان تھا جس کی تعریف اس شان سے ہو رہی ہے لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیفَ اِلَّا ذُوالفَقَار نہ ذوالفقار جیسی کوئی تلوار ہے اور نہ علیؑ جیسا کوئی جوان۔ یہ اُدھر کے الفاظ ہیں جو تاریخ اسلام میں آج تک گونج رہے ہیں۔ لہٰذا خالی تلوار لے کر میدان میں آجانا یہ مسئلہ شجاعت نہیں ہے تلوار کو پابند مرضیٔ پروردگار اور پابند عقل و منطق بنا دینا انسان کی شجاعت کا شاہکار ہے۔

میں جو لفظ گذارش کر رہا تھا بڑے ادب کے ساتھ مولائے کائنات کی بارگاہ میں ہاتھ جوڑ کے گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار آپ ہی کے جملے سے میں نے یہ استفادہ کیا ہے جو آج اس مجمع کے سامنے عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

جب سرکار دو عالم نے میدان احد کے صاف ہو جانے کے بعد اپنے اکیلے مجاہد کو دیکھا جو کبھی میمنہ پر ہے کبھی میسرہ پر ہے کبھی قلب لشکر پر ہے۔ تو پیغمبرؐ نے فرمایا۔ علیؑ جب سب چلے گئے تو کیا تمہیں اپنی جان پیاری نہیں ہے۔ تم کیوں نہ چلے گئے تو مولائے کائنات کا ایک فقرہ برابر آپ کے سامنے آتا رہتا ہے لیکن میں تاریخ کے دوسرے جملہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ معیار شجاعت اور بلند ہو جائے اور اس کا صحیح معیار معلوم ہو سکے۔ عرض کرتے ہیں اَاَکفُرُ بعدَ الایمان یا رسول اللہ کیا ایمان کے بعد کافر ہو جاؤں۔ کیا ایمان کے بعد کفر اختیار کر لوں اِنَّ لِی بِکَ اُسوَۃٌ میرے لیے تو آپ نمونہ ہیں لَقَد کانَ لَکُم فِی رَسُولِ اللّٰہ اُسوَۃٌ حَسَنَۃٌ قرآن مجید نے کہا ہے کہ مسلمانو! تمہارے واسطے سیرت پیغمبرؐ بہترین نمونہ ہے سرکار میرے واسطے تو آپ نمونہ ہیں۔ میرے جانے کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپ چلے گئے ہوتے تو میں بھی چلا گیا ہوتا لیکن اگر آپ نہیں جا سکتے تو میں بھی نہیں جا سکتا۔ میں آپ کے نقش قدم سے الگ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے لیے نمونۂ عمل ہیں۔ میں آپ کے نقش قدم پر ہوں آپ میدان میں رہیں گے تو میدان میں رہوں گا۔ آپ چلے جائیں گے تو میں چلا جاؤں گا وہ اور ہیں جن کی منزل آپ سے الگ ہے۔ علیؑ کی کوئی منزل نہیں جہاں آپ وہیں علیؑ۔ جہاں آپ رہیں گے وہیں آپ کے نقش قدم پر میں ہوں گا۔ شجاعت کے

کے کسی ذہن میں نہ آتا مگر مولا نے کہا کہ حضور! میں آپ کے نقشِ قدم پر ہوں۔ یعنی دنیا والو! میری شمشیر زنی، میری طاقت، میری ہمت کو دیکھنے کے بعد بھی مرتبۂ پیغمبر پہ نگاہ رکھنا کہ جو تلوار لے کر میدان میں جم جائے اسے علیؑ کہتے ہیں اور جو بغیر تلوار کے میدان میں جا رہے اسے نبیؐ کہتے ہیں۔

(صلوات۔ نعرۂ حیدری)

عزیزانِ محترم ہم نہ کسی غلو کے قائل ہیں نہ کسی مبالغہ کے قائل ہیں اور ہم کو مبالغہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب اصل کم پڑ جائے تو مبالغہ کی ضرورت پڑتی ہے یہاں مبالغہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے جتنا کمال ائمہ طاہرینؑ کے پاس ہے اتنا کمال ہی بہت کافی ہے۔ ساری دنیا کے کمال کو چیلنج کرنے کے لیے۔ لہٰذا کسی غلو یا مبالغہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو ہر مقام پہ کہتے ہیں کہ تلوار کے ساتھ میدان میں علیؑ کو دیکھا۔ بغیر تلوار کے میدان میں نبی کو دیکھا ثباتِ قدمِ پیغمبرؐ میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ یہ بھی شجاعت کا ایک نمونہ ہے اور وہ بھی ایک شجاعت کا مظہر ہے۔

اس کے بعد ایک لفظ اور کہنا چاہتا ہوں جو شاید دنیائے اسلام میں کوئی کہنے کی ہمت نہیں کرے گا مگر اپنی عقیدت سمیت یہ کہنے کی جراُت کر رہا ہوں کہ سب سے بڑا کمال دنیا نے دیکھا کہ جس دروازہ کو چالیس آدمی ہلا نہ سکتے تھے علیؑ نے اکیلے اس دروازہ کو اٹھالیا لیکن اس کے بعد بھی میں کہوں گا کہ مجھے پیغمبرؐ کی شجاعت میں اب بھی کوئی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے کہ جو اپنی انگلیوں پر درِ خیبر کو اٹھائے اسے علیؑ کہتے ہیں اور جو اپنے ہاتھوں پر علیؑ کو اٹھائے اسے پیغمبرؐ کہتے ہیں۔ (نعرۂ حیدری۔ نعرۂ صلوات)

تو میں واضح لفظوں میں یہ گذارش کر سکتا ہوں کہ جو میدانِ غدیر میں علیؑ کے دستِ پیغمبرؐ پر بلند ہونے کا انکار کرتے ہیں ارے کوئی منزل تو ایسی آنی چاہیئے جہاں انسان کمالِ نبوت کو پہچان سکے۔ یہ تو علیؑ کی فضیلت کا بھی اعلان ہے اور نبیؐ کی طاقت کا بھی اعلان ہے۔ اسی لیے سرکار نے اعلان بھی دونوں کا کیا۔ ورنہ حضور تو مولا تھے ہی خالی کہہ دیا ہوتا کہ یہ علیؑ مولا ہے مگر اعلان کیا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے تاکہ دونوں کی مولائیت کا ایک ساتھ اعلان ہو جائے

اور اندازہ ہوجائے کہ جس طرح ساری امت میری غلام ہے اسی طرح سب علیؑ کے غلام ہیں اور علیؑ سب کا مولا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سمجھدار تھے وہ غلام زادہ لکھوانا چاہتے تھے۔ صلوات۔ نعرۂ حیدری

ایک صاحب نے اچانک اس موقع پر یہ سوال اٹھایا کہ اگر یہ خواہش تھی کہ غلام زادہ لکھ دیں تو اگر کہیں لکھ دیا ہوتا تو اس کے معنیٰ یہ تھے کہ عاقبت کا انتظام ہو گیا، نجات کا انتظام ہو گیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات میں کہتا تو ایک بات بھی تھی۔ آپ کو تو یہ بات نہیں کہنا چاہئے جہاں نبی کا لکھا ہوا کام نہ آتا ہو وہاں دوسرے کا لکھا ہوا کیا کام آئے گا۔ جب امت کو نبی کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے تو حسینؑ کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی ہے۔ نہ جانے کب کا انتقام تھا جو قدرت نے اتنی آسانی سے لے لیا تھا۔

عزیزان محترم میں یہ گذارش کر رہا کہ شجاعت فقط طاقت کے مظاہرے کا نام نہیں ہے شجاعت طاقت کا برمحل مظاہرہ ہے لہٰذا وقت پر انسان تلوار لے کر میدان میں آجائے تو وہ بھی شجاع ہے اور اگر مولا کے روک دینے سے تلوار کو روک لے تو یہ بھی شجاعت ہے بلکہ شاید یہ شجاعت کا مرحلہ زیادہ دشوار ہے اس لیے کہ بہادر کے لیے تلوار چلانے میں زحمت نہیں ہوتی ہے بہادر کے لیے تلوار روکنے میں زحمت ہوتی ہے اور اس کا تاریخی ثبوت میرے پاس موجود ہے کہ جو لڑنا مرنا جانتے تھے انھیں کسی میدان میں نبوت میں شک نہیں ہوا لیکن جب تلوار رک گئی تب شبہ ہونے لگا۔ اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ لڑنے والوں کے لیے لڑنا آسان ہوتا ہے تلوار کا روکنا مشکل ہوتا ہے اور جو واقعاً سپاہی ہوتا ہے اسے اگر تلوار روکنا پڑے تو وہ زیادہ شجاعت کا مظاہرہ کرنے والا ہوتا ہے۔ تاریخ نے اس فقرہ کو بار بار نقل کیا ہے کہ مسلمان میدانِ جنگ سے واپس آئے اور میدان کو فتح کر کے آئے۔ دشمن کو زیر کر کے آئے۔ تو سرکار دو عالمؐ نے چاہنے والوں کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے جہاد اصغر کا میدان تو جیت لیا ہے مگر ابھی تمہارے سامنے جہاد اکبر باقی ہے لوگ گھبرا گئے کہ ہم اتنی محنت و مشقت سے اس کارنامہ کو انجام دے کر آئے ہیں اور حضور فرماتے ہیں کہ ابھی ایک بڑا جہاد باقی رہ گیا ہے۔ اب دیکھئے اس میں کیا حشر ہوتا ہے؟ عرض کی کہ حضور اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ فرمایا میدان میں دشمن سے لڑنا بہت آسان ہی

گھر میں بیٹھ کے نفس سے لڑنا بہت مشکل ہے۔

دشمن سے لڑنے کا نام ہے جہاد اصغر اور نفس سے مقابلہ کرنے کا نام ہے جہادِ اکبر یعنی جو میدان جیت جائے اگر اس میں غرور نہ پیدا ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جہاد اصغر بھی جیت لیا اور جہاد اکبر بھی جیت لیا اور اگر غرور پیدا ہو گیا تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جہاد اصغر کا فاتح ہے اور جہاد اکبر کا ہارا ہوا ہے۔

نفس پر قابو رکھنا جہاد کا سب سے بڑا مرحلہ ہے۔ دشمن کو زیر کر لینا، گھوڑے سے گرا دینا اس کے سینے پر بیٹھ جانا یہ سب جہاد اصغر ہے لیکن اسکی بے ادبی سے سینے سے اتر آنا یہ کمال نفس کا مظاہرہ ہے اور اسے جہاد اکبر کہا جاتا ہے۔ گویا علیؑ ایک ہی وقت میں جہاد اصغر بھی کر رہے ہیں اور جہاد اکبر بھی کر رہے ہیں۔

لوگ موقع کی تاک ہی میں رہ گئے اور عمرو گھوڑے سے گر بھی گیا۔ اس کے سینے پر علیؑ سوار بھی ہو گئے، سینے سے اتر بھی آئے۔ دوبارہ سوار بھی ہو گئے۔ عمرو کا سر کاٹ بھی لیا لیکن کوئی گرفت نہ ہو سکی اور معرکہ سر ہو گیا اور اس طرح کہ مورخ نے یہاں تک کہہ دیا کہ علیؑ کی تلوار کا کمال یہ تھا کہ چاہے طول میں چلے یا عرض میں جب چلتی تھی تو دو ٹکڑے ہوتے تھے بالکل برابر کے۔ گویا علیؑ کا نصیب الگ تھا اور مورخ کا مقدر الگ تھا۔ تلوار کا تولنا علیؑ کا حصہ تھا اور جسم کے حصوں کو تولنا مورخین کا حصہ تھا لیکن سب منتظر تھے کہ کیسے علیؑ کے جہاد میں کوئی نقص کوئی عیب نکال لیا جائے اور ظاہر ہے کہ ڈھونڈنے والے کو کچھ مل ہی جاتا ہے چنانچہ جب عمرو کا سر کاٹنے کے بعد سر کو لے کر چلے تو اس انداز سے چلے کہ لوگوں کو موقع مل گیا۔ یا رسول اللہ دیکھ رہے ہیں آپ۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ میدان فتح کرنے کے بعد اگر غرور نہ پیدا ہوا تو گویا انسان نے جہاد اکبر کا معرکہ بھی سر کر لیا لیکن یہ انداز جو علیؑ کے چلنے کا ہے یہ انداز تو پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ انداز تو اچھا نہیں ہے۔ یہ طریقۂ کار تو اچھا نہیں ہے۔

فرمایا بے شک اچھا نہیں ہے مگر آج اچھا ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ دو انسانوں کا نہیں ہے کہ اپنی فتح پر انسان مغرور ہو جائے۔ یہاں اپنی فتح نہیں ہے یہ تو کل ایمان کی فتح ہے کہ پیغمبرؐ

نے فرمایا تھا کل ایمان جا رہا ہے۔ یہ علیؑ کے اندر جو انداز پایا جاتا ہے یہ اپنی فتح کا انداز نہیں ہے یہ کل ایمان کی فتح کا انداز ہے۔ اپنی فتح کا غرور اور ہوتا ہے اور ایمان کی فتح کا نشہ اور ہوتا ہے اور اچھا تھا کہ زندگی میں ایک موقع ایسا آگیا جہاں علیؑ کو اس انداز سے چلتے دیکھ لیا۔ کل ایمان نے کل کفر کو مار دیا اور علیؑ یوں چلے کہ علیؑ کے چلنے پر اعتراض ہو گیا ورنہ اگر زندگی میں یہ موقع نہ ہوتا تو ایک مسئلہ ہمیشہ ہی سوچنا پڑتا اور اس کا کوئی جواب نہ ملتا کہ ہم برابر سنتے چلے آرہے ہیں کہ پروردگارِ عالم نے اپنے نیک بندوں کو اپنے صفات کا مظہر بنایا ہے۔ ظاہر ہے اللہ کا کمال الگ ہے لیکن اس کا ایک نمونہ بندہ بھی ہیں کہ علم خدا کو دیکھنا ہے تو انھیں دیکھو یہ ہماری صفات کے مظہر ہیں۔ ہماری حیات کو پہچاننا ہے تو ان کی زندگی کو دیکھو۔ ہمارے ارادے کو پہچاننا ہے تو ان کے ارادے کی طاقت کو دیکھو۔ ہمارے کلام کو دیکھنا ہے تو ان کے بیان کو دیکھو۔ ہماری صداقت کو دیکھنا ہے تو ان کے لہجے کو دیکھو۔ جو کچھ دیکھنا ہے ہمارے بارے میں انھیں کو دیکھو۔ یہ ہم جیسے نہیں ہیں لیکن ہمارے نمونے ہیں۔ ہمارے مظہر ہیں، ہمارے مُرقع ہیں۔ تو خدایا ہم نے آلِ محمدؐ کے کردار میں، سرکار کی زندگی میں تیرے علم کا نمونہ دیکھ لیا۔ تیری حیات کا نمونہ دیکھ لیا، تیرے ارادے کا نمونہ دیکھ لیا۔ تیرے تکلم کا انداز دیکھ لیا۔ تیرے صداقت دیکھ لی سارے کمالات دیکھ لئے لیکن تیری ایک صفت اور بھی ہے یا متکبرؔ اور تیرا اعلان ہے اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِی کبریائی میرا حصّہ ہے۔ تو خدایا یہ ایک صفت تو رہ گئی جس کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ علیؑ آج یہ انداز دکھلا دو تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس کو نفس بنایا ہے اسے یا متکبرؔ کا مظہر بھی بنایا ہے۔ صلوات، نعرۂ حیدری۔

میں سلسلۂ کلام کو تو بہت دور لے جانا چاہتا تھا مگر ابھی مفہوم شجاعت بھی واضح نہیں ہو سکا ہے تو مفہوم خوف کیا واضح ہوگا اور وقت بھی نہیں ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ رات اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہے بس ایک بات اور گذارش کرنا ہے۔ اردو زبان کا لفظ ہے جسے سب جانتے ہیں۔ اور بولتے ہیں۔ چاہے وہ اردو زبان کہے جاتے ہوں یا نہ کہے جاتے ہوں مگر یہ لفظ عام طور سے رائج ہے سب جانتے ہیں۔ شجاعت کے مقابلے میں لفظ خوف نہیں آتا ہے بلکہ جو لفظ آتا ہے وہ ذرا ثقیل ہے لہذا اس کے مقابلے میں خوف کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک طرف ہوتی ہے

شجاعت، ہمت، بہادری، طاقت اور اس کے مقابلے میں ہوتا ہے جبن جس کی اردو ہے بزدلی۔ یہ لفظ تو سب جانتے ہیں کہ فلاں آدمی بہت شیر دل ہے یعنی بہادر ہے اور فلاں آدمی بزدل ہے یعنی کمزور ہے، پست ہمّت ہے، کم ہمّت ہے۔ ایک طرف ہوتی ہے شجاعت اور ایک طرف ہوتا ہے جبن۔ یعنی ایک طرف ہوتی ہے شیر دلی۔ ایک طرف ہوتی ہے بزدلی۔ شیر دلی کے نمونے تو بہت دیکھے کہ ہر بہادر اپنے کو شیر کہتا ہے۔ لہٰذا اسے شیر دل کہا جاتا ہے لیکن آج تک کوئی اپنے کو بزدل کہنے والا نہیں دیکھا۔ ہم کیسے سمجھیں کہ بزدل کیسے ہوتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ کوئی ایسا صریح اللہجہ صادق اللہجہ حق بیان، صاف کہنے والا مل جائے تو دونوں مضمون معلوم ہو جائیں کہ شیر ایسا ہوتا ہے اور شیر دل ایسے ہوتے ہیں۔ اور بزدل ایسے ہوتے ہیں۔ صلوات۔

تو عزیزو شجاعت ہے ہمت نفس، شجاعت ہے طاقت نفس ہو سکتا ہے کہ انسان تلوار چلانے کے قابل نہ ہو مگر تلواروں میں آنے کی ہمت رکھتا ہے تو شجاع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیزہ چلانے کے لائق نہ ہو لیکن نیزہ برداروں کے درمیان قدم جمانے کی ہمت رکھتا ہے تو بہادر ہے۔ بہادری میں تلوار چلانے کی شرط نہیں ہے۔ اسی لیے سرکارِ دوعالم کا ارشادِ گرامی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے جب چاہنے والوں کو شجاعت کا حوصلہ دلانا چاہا تو فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الشَّجَاعَۃَ وَلَوْ بِقَتْلِ حَیَّۃٍ بہادر بنو، ہمت پیدا کرو، قوتِ قلب پیدا کرو۔ دیکھو خدا بہادری کو دوست رکھتا ہے چاہے ایک سانپ ہی کیوں نہ مارو۔

حضور کیا دنیا میں سارے جانور مر گئے تھے۔ کیوں نہ فرما دیا کہ اللہ بہادر کو دوست رکھتا ہے چاہے بچھو ہی کیوں نہ مارے، ہاتھی کیوں نہ مارے، ایک اونٹ مارے، ایک شیر مار دے ساری شجاعت کا معیار ایک جانور ہی رہ گیا ہے یعنی کم سے کم شجاعت یہ ہے کہ سانپ مار لے اب اگر سانپ مارنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو انسان بہادر نہیں ہے۔ بہادر وہ کمسن بچہ ہے جو گہوارہ میں کلّہ اژدر کو دو ٹکڑے کر دے۔ صلوات نعرۂ حیدری۔

پروردگار اپنے بندوں کو شجاع دیکھنا چاہتا ہے اور قرآن مجید بھی آواز دے رہا ہے۔ اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَاءَہٗ شیطان کا کاروبار ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو

ہمیشہ خوف دلاتا رہتا ہے۔ خوفزدہ رکھتا ہے۔ تو رحمان کا کام ہے نفس کو مطمئن بنانا اور شیطان کا کام ہے خوفزدہ رکھنا۔ اب جو دشمن کے مقابلہ میں سکون و اطمینان کی بات کرے وہ نمائندہ رحمان ہے اور جو داستانیں سنا سنا کر خوفزدہ بنائے وہ نمائندہ شیطان ہے۔

پروردگار نے فرمایا فلا تخافوھم خبردار تم شیاطین سے ڈرنا نہیں۔ ان کی طاقت ہی کیا ہے۔ یہ خالی خوف دلانا جانتے ہیں۔ صرف ڈرانا جانتے ہیں اگر تم ڈر گئے تو ہار جاؤ گے اور اگر جم گئے تو یہ خود ہی پیچھے ہٹ جائیں گے۔

تو عزیزو! شیطان کا سب سے بڑا حربہ ہے خوفزدہ کرنا، ہراس پیدا کرنا، دہشت پیدا کرنا اور اللہ والوں پر اس دہشت کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ وہ اس خوف کے مقابلے میں بے خوف اس دہشت کے مقابلہ میں نفس مطمئن ہوتے ہیں۔ ان پر شیطانی حربوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک جملہ سنیں اور ذکر مصائب علامہ شوستریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ ظالموں نے کربلا میں کوئی حربہ بچا کے نہیں رکھا تھا جو استعمال نہ کیا ہو۔ صرف تلواروں کا مسئلہ نہیں تھا۔ صرف نیزوں کی بات نہیں تھی۔ صرف تیروں کا تذکرہ نہیں تھا۔

ظلم کا کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جو لشکر حسینؑ کے مقابلہ میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ آج کی تاریخ کے بارے میں یعنی ۹ محرم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ۹ محرم تک صحرائے کربلا میں لشکر یزید کے کم سے کم تیس ۳۰ ہزار سپاہی اکٹھا ہو گئے تھے۔ روایات میں اس سے زیادہ بھی ہے لیکن کم سے تیس ہزار کی فوج صحرائے کربلا میں آچکی تھی اور اس فوج کے جمع ہو جانے کے بعد فقط یہی نہیں تھا کہ فوجیں ایک مقام پر ٹھہری ہوئی ہوں کہ جب جنگ کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔

نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب لشکر یزید صحرائے کربلا میں اکٹھا ہو گیا تو آپ سوچیں کہ تیس ہزار کی فوج کے لیے کتنا بڑا علاقہ درکار ہو گا جہاں یہ فوجیں، یہ گھوڑے، یہ اسلحے یہ ساز و سامان پھیلا ہو گا۔ اس کے بعد جب عصر کا ہنگام آیا۔ ۹ محرم کی شام تو پہلا حربہ شیطانی ابن سعد نے یہ استعمال کیا کہ صحرائے کربلا میں گھوڑے دوڑانا شروع کر دئے۔

مگر عزیزو! اس پرسکون ماحول میں یہاں بیٹھ کے ہم اس منظر کا تصوّر نہیں کر سکتے ہیں کہ جس زمین پر تیس ہزار گھوڑے دوڑ رہے ہوں اور جس فضا میں ۳۰ ہزار تلواریں چمک رہی ہوں جہاں گھوڑوں کے دوڑنے سے کربلا کی زمین ہل رہی ہو اس فضا کا کیا عالم ہو گا۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ یہ ہو اللہ والوں کی جرأت اور ہمت کہ ان گھوڑوں کے دوڑنے سے کربلا کی زمین ہل گئی ہے مگر کربلا میں لشکر حسینؑ کے ایک چھوٹے سے بچے کا بھی دل نہیں ہل سکا۔ حد یہ ہے کہ جب وقتِ جہاد آ گیا تو جو میدان میں جانے والے تھے وہ چلے گئے اور داد شجاعت دے گئے مگر جو میدان میں جانے کے قابل نہیں تھے انھوں نے بھی اپنے کو جھولے سے گرا دیا کہ اگر ادنیٰ خوف پیدا ہو گیا ہوتا تو بہترین موقع تھا کہ گہوارہ میں ہی رہ جاتے مگر بچہ چاہتا ہے کہ دنیا دیکھ لے کہ تم نے حبیبؑ کی طاقت کو دیکھ لیا ہے۔ مسلمؑ کا زور دیکھا ہے۔ زہیرؑ کی طاقت دیکھی ہے۔ اب آؤ چھ مہینے کے بچے کی بھی طاقت دیکھ لو۔ آؤ ذرا میرے بھی زور شجاعت کو دیکھ لو مگر کیسے میدان میں آئے گہوارے میں رہنے والا بچہ۔ نہ چلنے کے قابل، نہ تلوار اٹھانے کے لائق، نہ جنگ کرنے کے قابل، کیا کرے کیسے دنیا کو سمجھائے کہ شیطنیت کے حربوں سے علیؑ اصغر کا دل نہیں لرز سکا ہے۔ کیسے بتائے کہ حق والوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے، علیؑ اصغر کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ اپنے کو جھولے سے گرا دیا اور اس منظر کو دیکھ کر خیمہ میں کہرام برپا ہو گیا۔

وہ بچہ جس کو تین دن سے پانی نہ ملا ہو شیر مادر کا کیا ذکر ہے۔ اس نے کیا پیاس سے بیقرار ہو کر اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔ نہیں خیمہ میں ایک کہرام ہے۔ سیدانیاں پریشان ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ سبب کیا ہے۔ ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ بچہ کو اپنی آغوش میں لے لے مگر اب بچہ کسی کی گودی میں نہیں آتا ہے۔

یاد رکھئے کہ اگر بچے نے پیاس کی پریشانی سے اپنے کو گرا دیا ہوتا تو جیسے ہی ماں نے ہاتھ بڑھایا تھا تو بچہ ہمک کے گودی میں آ گیا ہوتا۔ اگر بچہ مصیبت سے پریشان ہو کر گر گیا ہوتا تو جب کسی خاتون نے سہارا دیا تھا تو فوراً اسی گودی میں آ گیا ہوتا مگر ثانی زہرا کا کہنا ہے کہ علیؑ اصغر جھولے سے گرے نہیں ہیں اپنے کو جھولے سے گرایا ہے۔

امام حسینؑ در خیمہ پر آئے۔ آواز دی زینبؑ۔ اصغرؑ کو لے آؤ۔ کہا بھیّا۔ اصغر کسی کی گودی میں نہیں آتے ہیں۔ کہا بہن مجھے لے چلو میرے لال کے سرہانے۔

ہائے ثانی زہراؑ کے کربلا میں کتنے فرائض ہیں۔ کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ بھائی کو گہوارے کے قریب لائیں۔ حسینؑ نے ہاتھ بڑھایا اور بچّہ ہمک کے باپ کی گودی میں آگیا۔

بابا مجھے دادِ شجاعت دینے کا کوئی موقع نہیں مل رہا ہے۔ میں تلوار چلانے کے قابل نہیں ہوں آپ مجھے میدان میں لے چلیں تاکہ میں دنیا کو سمجھاؤں کہ اگر دنیا والوں کے پاس ہزار حربے ہیں تو اصغرؑ کے پاس بھی ایک حربہ ہے جو ظلم کے سارے حربوں کا تنہا جواب ہے۔

حسینؑ بچّہ کو لے کر چلے، در خیمہ کے قریب پہونچے۔ دیکھا کہ رباب کھڑی ہیں۔ مولا اب اصغرؑ کو کہاں لے جا رہے ہیں؟ صبح سے یہ ماں دیکھ رہی ہے کہ جس ماں کی گود کا پالا میدان میں گیا پلٹ کے نہیں آیا۔ اب میرا لال جا رہا ہے۔

امام حسینؑ سے زیادہ ان نفسیات کو کون پہچانے گا۔ مولا نے تسلّی دی رباب میں جا رہا ہوں میں لوگوں کو سمجھاؤں گا۔ ظالم اتنا تو جانتے ہیں کہ تمہارا لال کوئی جنگ کرنے کو نہیں آیا ہے۔ تمہارا بیٹا تلوار چلانے کے قابل تو نہیں ہے۔ شاید کسی کو اصغرؑ کے حال پر رحم آجائے۔ ماں کو سمجھایا، آگے بڑھے، میدان میں آئے۔ اصغر کو لے کر سامنے بلندی پر پہونچے ایک بلندی پر آئے۔ اے قوم جفا کار اگر تیرے خیال میں میری کوئی خطا ہے تو چھ مہینے کے بچّے کی کوئی خطا نہیں ہے میرا بچہ پیاس سے جاں بلب ہے اَمَا فیکم مُسلِم کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں ہے؟ کیا اسلام نے پیاس بجھانے کا حکم نہیں دیا ہے۔ ظالموں کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے اس کے بعد کیا گذری نہ سن سکو گے۔ اولاد والو اور میں تو اپنی بہنوں سے گذارش کروں گا کہ یہ بھائی جو میرے سامنے بیٹھے ہیں ان کی گودیوں میں بچے نہیں ہیں۔ یہ اس منظر کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں تم تو یہ پہچان سکتی ہو کہ ایک ماں کی حالت کیا ہوتی ہے جب اس کی گود سے جدا ہو کر اس کا بچّہ تیروں میں چلا جاتا ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں ہے اور جب کوئی جواب نہ ملا تو ایک مرتبہ

تڑپ کر کہا اگر کوئی مسلمان نہیں ہے تو کیا تم میں کوئی صاحب اولاد بھی نہیں ہے؟ دیکھو میرا بچہ پیاس سے تڑپ رہا ہے کوئی جواب نہ ملا تو ایک مرتبہ فرمایا اصغرؑ میں تو سمجھا چکا۔ میری زبان یہ ظالم نہیں سمجھتے ہیں بیٹا اب تم بتاؤ کہ تم کتنے پیاسے ہو۔ تم بتاؤ کہ تمہاری تشنگی کا کیا عالم ہے۔

علی اصغرؑ نے سوکھی زبان خشک ہونٹوں پر پھیرنا شروع کی۔ فوجوں میں کہرام برپا ہو گیا۔ ظالم منہ پھیر پھیر کر رونے لگے۔

ابن سعد نے آواز دی۔ حرملہ کہاں ہے۔ حرملہ آگے بڑھا تیر کمان میں جوڑا علی اصغرؑ کے گلے کو نشانہ بنایا۔ دیکھنے والوں نے بس اتنا دیکھا کہ ادھر سے تیر چلا اور ادھر بچہ باپ کے ہاتھوں پر پلٹ گیا۔

حسینؑ نے تڑپ کے بچےؑ کو دیکھا تو دیکھا کہ لبوں پر مسکراہٹ کے آثار ہیں۔ بابا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں مسکرا کے دنیا سے جا رہا ہوں۔ ظالمو! دیکھ لو میرے ہونٹوں پر تبسم ہے آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں۔

لو اصغرؑ کا جہاد ختم ہو گیا۔ اب حسینؑ کا ایک نیا جہاد شروع ہو رہا ہے۔ اصغرؑ کو لے کر چلے درِ خیمہ تک آئے۔ کم سے کم رباب کو بچےؑ کا آخری دیدار تو کرا دیا جائے۔ درِ خیمہ تک جا کے نہ جانے کیا خیال آیا۔ پلٹ آئے۔ کبھی آگے بڑھتے ہیں۔ کبھی پیچھے آتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن رضاً بقضائِہ وتسلیماً لامرِہ۔ سات مرتبہ آگے بڑھے اور پیچھے ہٹے۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ ماں کو بچےؑ کے دیدار سے کیوں محروم کیا جائے۔ درِ خیمہ پر آ کر آواز دی۔ رباب اپنے لال کو لے جاؤ خیمہ میں آواز پہونچی۔ روایت کہتی ہے کہ ادھر سے رباب چلی اور ادھر سے سکینہ چلی (بس دو چلے) لیکن رباب جب قدم اٹھاتی ہے تو قدم اٹھتے نہیں ہیں۔ نہ جانے میرا بچہ کس عالم میں آیا ہو گا اور سکینہ دوڑ کے آ گئی۔ بابا اصغرؑ کو پانی پلا لائیے۔ بابا سکینہؑ بھی تو پیاسی تھی۔ بابا سکینہ بھی تو آپ کی لاڈلی ہے۔ حسینؑ چپ کھڑے ہیں۔ رباب آئیں۔ لائیے آقا میرے بچےؑ کو لائیے۔ قبا کا دامن الٹ دیا۔ ہائے علی اصغرؑ ارے میرے لال کیا اس عمر کے بچےؑ بھی ذبح کر دئے جاتے ہیں۔

حسینؑ پلٹ آئے پشتِ خیمہ پر آئے۔ ذوالفقار سے ننھی سی قبر بنائی۔ قبر تیار ہو گئی تو سرہانے

لیے بیٹھے ہیں۔ کیسے اصغر کو لٹائیں۔ کبھی خاک پر رکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی کلیجے سے لگا لیتے ہیں۔ اسی کشمکش میں ایک مرتبہ کانوں میں آواز آئی یا حسین ضعہ اے حسینؑ! اصغرؑ کو لٹا دو۔ کوئی ماں آگئی ہے۔ عجب نہیں کہ زہراؑ نے آواز دی ہو۔ آؤ میرے اصغرؑ آؤ۔ آؤ میرے لال آؤ، حسینؑ تم جاؤ گلا کٹاؤ۔ اصغرؑ کو میرے پاس رکھو۔ اب نہ میری قبر کا نشان ملے گا اور نہ اصغرؑ کی قبر کا نشان ملے گا جہاں میں رہوں گی میرا لال میری گود میں رہے گا۔

ننھی سی قبر کھود کے اصغرؑ کو گاڑ کے
شبیرؑ اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

پروردگار جو تھا سب تیری راہ میں دے دیا۔ سَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ۔

□□

مجلس ۱۱

اذان علی اکبرؑ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۔

نٓ قسم ہے قلم اور تحریروں کی کہ پیغمبرؐ آپ اپنے پروردگار کی نعمت کی بنیاد پر مجنون اور دیوانے نہیں ہیں۔ آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون اور دیوانہ کون ہے۔

سرکار دو عالمؐ جنھیں مالک کائنات نے خلق مجسّم بنایا تھا۔ وہ پیغمبرؐ جس کی عقل پر مالک کائنات کی طرف سے مہر توثیق ثبت کی گئی تھی کہ یہ عقل مجسّم ہے۔ یہ خلق مجسّم ہے۔ اس کا کوئی عمل خلافِ عقل نہیں ہے۔ اس کا کوئی اقدام خلافِ حکمت نہیں ہیں۔

اسی لیے سرکار دو عالمؐ نے ہر منزل پر ان دونوں باتوں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھے کہ دنیا اخلاق پر اعتراض کر سکے اور کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے کہ دنیا اسے خلافِ عقل و منطق قرار دے سکے۔

سرکار دو عالمؐ نے سب سے پہلے دنیا کو دعوتِ دین اور دعوتِ اسلام دی۔ شرک کی خباثتوں سے نکال کر توحید کی پاکیزہ منزلوں تک لیجانا چاہا تو فرمایا قولوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو اسی میں فلاح ہے۔ اسی میں نجات ہے۔ نہ پیغمبرؐ نے جنگ کی کوئی بات کی نہ لڑائی کا

کوئی پیغام دیا۔ نہ کسی معرکہ آرائی کا کوئی ارادہ کیا۔ ایک مقصد تھا کہ قوم راہ راست پر آجائے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کو پہچان لے۔ معبود حقیقی کو سامنے سر جھکا دے۔ یہ انسان فطری اعتبار سے بلند منزلوں پر فائز ہو جائے لیکن ظالموں نے پیغمبرؐ کے مقام اور مرتبہ کو نہ پہچانا۔ اتنا صحیح اور عالی پیغام دینے والا انسان اسے کبھی جادوگر کہا، کبھی دیوانہ کہا، کبھی شاعر قرار دیا، کبھی کاہن قرار دیا۔ راستے میں آئے تو کانٹے بچھائے۔ گلیوں سے گذرے تو کوڑا پھینکا۔ ہر طرف سے ہجوم مصائب تھا مگر پیغمبرؐ کی زبان پر ایک فقرہ تھا قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ تُفْلِحُوا میں کچھ نہیں چاہتا ہوں۔ میں ساری مصیبتیں برداشت کر لوں گا فقط ایک مطالبہ ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کہہ دو اور میرے معبود کے سامنے سر جھکا دو اسی میں فلاح ہے۔ اسی میں کامیابی ہے۔ یہی تمہاری نجات کا سامان ہے۔

اتنی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد جب لوگوں نے وطن میں رہنے نہ دیا تو سرکار نے وطن بھی چھوڑنا گوارہ کر لیا مگر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے پیغمبرؐ کے اخلاق یا پیغمبرؐ کی عقل و حکمت پر کسی طرح کا کوئی اعتراض کیا جاسکے۔ حد یہ ہے کہ جب ظالموں نے پیغمبر اسلامؐ پر مسلح حملے شروع کر دئے۔ چاہے وہ بدر کے میدان میں ہو یا احد کی لڑائی کی شکل ہو۔ چاہے اور کوئی میدان ہو۔ پیغمبرؐ نے وہاں بھی اپنے پیغام کو اسلحہ پر مقدم رکھا۔ جیسا کہ مولائے کائنات کی سیرت میں آپ برابر سنتے آئے ہیں کہ جب کُلِّ ایمان اور کُلِّ کفر کا مقابلہ ہوا تو وہاں پر بھی مولائے کائنات نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھلانے سے پہلے عمرو کے سامنے پیغام اسلام رکھا کہ اسلام کا قانونِ حکمت یہی ہے۔ اسلام کی اخلاقیت کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر انسان باتوں سے راہ راست پر آجائے تو سر کاٹنے یا سر کٹانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کا خون بہانے سے بہتر یہی ہے کہ انسان کو صراطِ مستقیم تک پہنچا دیا جائے لیکن جب لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ شاید اس دعوت حق و حقانیت کا مقصد کوئی کمزوری ہے اور اسلحہ لے کر میدان میں نہ آنے کا مطلب کوئی ضعف اور ناتوانی ہے تو اسلام نے چاہا کہ ہم اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کر دیں کہ ہم تم سے کمزور نہیں ہیں۔ ہم ۳۱۳ نہتے افراد بھی آئیں گے تو ۹۵۰ پر فتح حاصل کر لیں گے۔ ہم ایک انسان بھی میدان میں بھیج دیں گے تو سارا لشکرِ کفر مقابلہ نہ کر سکے گا۔

لیکن وہ طریق کار جو پیغمبرؐ اسلام نے پوری زندگی اپنائے رکھا اور انسانیت کے سامنے پیش کیا یہی تھا کہ پہلا کام پیغام دینا ہے اور دوسرا کام تلوار کے جوہر دکھلانا ہے اور اسی حقیقت کو کربلا میں نبیؐ کے نواسے نے دہرایا۔

حسینؑ مظلوم یہ جانتے تھے کہ اب یہ قوم راہ راست پر آنے والی نہیں ہے۔ ساری رات گذر گئی گفتگو کرتے ہوئے۔ کتنے دن گذر گئے باتیں کرتے ہوئے اور سمجھاتے ہوئے کہ شاید اب ظالموں کی عقل میں بات آجائے۔ شاید اب دین کا پیغام سمجھ لیں اور نبیؐ کے نواسے کی عظمت سے باخبر ہو جائیں مگر جب کوئی راستہ، کوئی تدبیر اور کوئی چارہ کار حسینؑ مظلوم کے سامنے نہ رہ گیا اور ظالموں نے طے کر لیا کہ تلوار کے ذریعہ میدان کا فیصلہ ہونا چاہئے تو حسینؑ نے بھی طے کر لیا کہ ہم بھی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے اور تلوار چلانے سے پہلے وہ پیغام پھر سنائیں گے جو نانا نے پہلے دن سنایا تھا اور اسی لہجہ میں سنائیں گے جس میں نانا نے سنایا تھا۔ لہٰذا مدینہ سے چلتے ہوئے فرزند رسولؐ نے اپنے ساتھ اپنا ایک مخصوص موذّن بھی لے لیا۔ حجاج بن مسروق جب نماز کا وقت آتا تھا تو حجاج اذان کہتے تھے اور مولا نماز پڑھاتے تھے۔ چاہنے والے نماز پڑھا کرتے تھے مگر جب عاشورہ کا معرکہ سامنے آیا تو نبیؐ کے نواسے نے یہ فیصلہ کیا کہ جس لہجہ میں کل نانا اتمام حجّت کیا کرتے تھے۔ نواسہ بھی اسی لہجہ میں دنیا کو دعوتِ اسلام دے گا۔

حجاج آج کی اذان تمہارے حوالے نہیں ہے۔ علیؑ اکبر آج کی اذان تیرے حوالے ہے۔

امام حسینؑ نے اپنے کڑیل جوان بیٹے کا انتخاب کیا کہ اتمام حجّت کے لیے امام حسینؑ کے پاس علیؑ اکبر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا جس کے بارے میں میدان میں بھیجتے ہوئے خود یہ اعلان کر دیا تھا اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَيْهِمْ غُلَامٌ خدایا گواہ رہنا میرا وہ نوجوان جا رہا ہے جو سیرت میں، صورت میں، رفتار میں، گفتار میں میرے نانا کی شبیہ تھا۔ پروردگار جب میرے دل میں نانا کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوتا تھا تو میں اپنے علیؑ اکبر کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب یہ تصویر پیغمبرؐ خاک میں ملنے جا رہی ہے۔ کس دل سے کڑیل جوان بیٹے کو باپ نے

نے آہٹ محسوس کی اور مڑ کے دیکھا تو کہا بابا آپ نے تو رخصت کر دیا تھا اب میدان میں کیوں آرہے ہیں ؟ فرمایا بیٹا اگر تم صاحب اولاد ہوتے تو اندازہ ہوتا کہ جوان بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل پر کیا گذرتی ہے ؟ .

ارباب عزا یہ مختصر سا موقع ہے مگر میں دو لفظیں گذارش کرنا چاہتا ہوں .

ایک بات یہ ہے کہ واقعہ کربلا میں علی اکبرؑ کا کتنا حصہ ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ امام حسینؑ نے اتمام حجت کے لیے کتنے راستے میدانِ کربلا میں اختیار کیے ہیں تاکہ روز قیامت کوئی انسان یہ نہ کہہ سکے کہ اگر ہمارے سامنے حقیقت آگئی ہوتی تو ہم راہِ حق و صداقت پر آگئے ہوتے .

ایک وسیلہ حسینؑ کے پاس اتمام حجت کا شبیہ پیغمبر علی اکبرؑ تھے اور دوسرا وسیلہ حسینؑ کے پاس چھ مہینے کا بچہ علی اصغرؑ تھا اس لیے کہ علی اکبرؑ کے مقابلے میں تو بہر حال یہ سوچا جاسکتا تھا کہ جوان ہیں جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں اور جب وقت مقابلہ آجائے گا یا تلوار چلائیں گے یا زخم لگائیں گے لیکن علی اصغرؑ کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ علی اصغرؑ جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں . لہٰذا حسینؑ نے آغاز جہاد میں اتمام حجت کا ذریعہ علی اکبرؑ کو بنایا اور آخری مرحلہ پر اتمام حجت کا ذریعہ علی اصغرؑ کو بنایا اور یہ دونوں شخصیتیں وہ ہیں کہ جنھوں نے اتمام حجت کے لیے پیغام حق بھی سنایا اور باپ کی مظلومیت کا بھی اعلان کیا . اور مظلومیت کو قیامت تک کے لیے مستند بنا دیا . علی اکبرؑ میدان سے پلٹ کر آئے تو باپ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا بابا اِنَّ العَطَشَ قَدْ قَتَلَنِی بابا پیاس مارے ڈال رہی ہے وَ ثِقْلُ الحَدِیدِ قَدْ اَجْھَدَنِی اور گرانی اسلحہ تھکائے ڈال رہی ہے فَھَلْ اِلیٰ شَرْبَۃٍ مِّنَ المَآءِ سَبِیلٌ بابا کیا ایک گھونٹ پانی کی کوئی سبیل ہے .

عزیزو! سوچو . اتمام حجت میں علی اکبرؑ کا کتنا حصہ ہے . بابا کیا ایک گھونٹ پانی کی کوئی سبیل ہو . اب تو ظالموں کو معلوم ہو گیا کہ خیام حسینؑ کا کیا عالم ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے کب سے پیاسے ہیں کہ باپ اپنے کڑیل جوان بیٹے کو ایک گھونٹ پانی نہیں دے سکتا ہے مگر میرا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ جوڑ کے گذارش کروں کہ اے سبیل کے لال آپ کی زبان پر ایک لفظ آگیا تھا

بابا کیا پانی کی کوئی سبیل ہے آج یہ غلام آپ کے نام پر ہر طرف سبیل لگائے ہوئے ہیں مگر افسوس کہ یہ پانی آپ کے کام نہ آسکا۔ اس کے بعد آخری مرحلہ پر یہی کام علی اصغرؑ نے انجام دیا جب اپنی سوکھی زبان کو خشک ہونٹوں پر پھرانا شروع کیا کہ ظالمو! دیکھ لو ہمارے خیمہ میں ایک قطرہ پانی نہیں ہے

امام حسینؑ نے یہ دو وسائل ایسے فراہم کر دئے جس کے بعد دنیا قیامت تک حسینؑ کی مظلومیت کا انکار نہیں کر سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں پیغام حسینی پہونچا کربلا کی کسی مصیبت نے اثر کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر بچوں کی پیاس نے دلوں کو ضرور تڑپا دیا اور کربلا والوں کی تشنگی کے ذکر نے ساری دنیا کے دلوں کو بے چین کر دیا۔ (ایک منظر شاید میں نے اس سے پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا ہو گا بہت سے افراد ایسے ہیں جنھوں نے نہیں سنا اور مجھے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔

رات جب میں مجلس پڑھنے کے لیے منبر پر آیا تو میرے ذہن کی کیفیت اچانک تبدیل ہو گئی جب میں نے دیکھا کہ تا حد نظر مجمع ہے اور ایک مرتبہ میرے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ آج جس کے اتنے چاہنے والے ہیں وہ کل اکیلا اپنے لال کو لئے کھڑا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ ظالمو! اسے ایک قطرہ پانی پلا دو اور کوئی رحم کھانے والا نہیں تھا۔ علی اصغرؑ کی اس پیاس نے بعض مسلمانوں پر اثر کیا ہو نہ کیا ہو غیر مسلم صاحبانِ دل بھی اس واقعہ کو سنکر لرز گئے ہیں۔ میں مسلمانوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ ہندوستان کا ایک مشہور شہر ہے کلکتہ جہاں مسلمانوں کی آبادی انتہائی مختصر ہے اور صاحبان ایمان کی آبادی تو شاید فیصد بھی نہ ہوگی مگر وہاں محرم کے زمانے میں جب جلوس عزا نکلتا ہے تو جلوس میں علم اور ذوالجناح کے ساتھ ہندو تو میں بھی زیارت کے واسطے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں راستے پر آکر کھڑی ہو جاتی ہیں کہ اس طرف سے امام صاحب کا گھوڑا گذرنے والا ہے۔ میں نے اس علاقہ کے رہنے والے مومنین میں مختلف لوگوں سے دریافت کیا کہ آخر ان کے درمیان یہ شعور کہاں سے آیا اور انھیں یہ اطلاع کیسے ہو گئی یہ تو ہماری زبان بھی نہیں جانتے ہیں۔ ان کی زبان الگ ہے ہماری زبان الگ ہے۔ ان کی تہذیب الگ ہے ہماری تہذیب الگ ہے۔ ان کا مذہب الگ ہے ہمارا مذہب الگ ہے اگر یہ خالی تماشائی ہیں تو یہ کوئی منظر بھی ایسا نہیں ہے

جس کے لیے مجمع اکٹھا ہو جائے بہر حال ایک زمانہ تھا جب ہندوستان پاکستان اور بنگلا دیش کا معرکہ چل رہا تھا اور ماحول میں کشیدگی کچھ زیادہ ہی تھی اس وقت بھی جب جلوس عزا گذر رہا تھا تو ایک عورت اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے ہوئے آئی اور ایک برتن میں تھوڑا سا دودھ لے کر آئی اس نے کہا کہ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ امام صاحب کا گھوڑا ہے میں اس کے پیروں کو اس دودھ سے دھلاؤں۔ لوگوں نے منع کیا کہ نہیں آپ قریب نہ جائیں کہ کہیں خدانخواستہ اگر کوئی ٹھوکر لگ جائے، کوئی پریشانی پیدا ہو جائے تو ہندو مسلم ٹینشن پیدا ہو جائے گا اور بڑی مصیبت پیدا ہو جائے گی۔ تھوڑے سے افراد ہیں ان سب کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ منتظمین برابر منع کر رہے تھے مگر اس کا اصرار تھا کہ یہ میری منت ہے۔ پولیس والے بھی روک رہے تھے کہ نہیں اس کے قریب کوئی نہیں جا سکتا ہے ہم کسی کو نہیں جانے دیں گے مگر اس کا اصرار بڑھتا رہا۔ بالآخر مومنین نے مقامی انتظامیہ سے درخواست کی کہ اگر آپ اپنی ذمہ داری پر اس کو قریب جانے دیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہوگا کہ خدانخواستہ اگر کوئی بات ہو گئی تو ہم مومنین یا مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ پولیس والوں نے کہا کہ جب اصرار زیادہ ہے تو آنے دو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ عورت آگے بڑھی ذوالجناح کے پیروں کے پاس گئی اور اس کے بعد اپنے ہاتھ سے اس کے پیروں پر دودھ ڈالنا شروع کیا اور اپنے بالوں سے پیروں کو دھونا شروع کیا۔ ذوالجناح نہایت ہی سکون کے ساتھ یوں ہی کھڑا رہا۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی کے پیروں کو یا ہاتھ کو بال لگ جائے تو انسان بھی پریشان ہو جاتا ہے مگر وہ سکون سے کھڑا رہا اس نے سارا دودھ ڈال دیا اور اس کے پیروں کو دھلا دیا اور اس کے بعد جو دودھ زمین پر بہہ گیا اس دودھ کو زمین سے لیکر اپنے بچے کے پورے بدن پر ملنا شروع کر دیا اور اس کے بعد بچے کو اٹھایا اور لیکر چلی گئی۔ کسی نے بڑھ کر پوچھا کہ آخر یہ منت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ امام صاحب کے لشکر میں کوئی بچہ تھا جس کو دودھ نہیں ملا تھا۔

عزیزو! ایک غیر قوم کی عورت نے یہ سن لیا کہ ایک بچے کو ماں کا دودھ تک نہیں ملا تھا

[illegible]

جب تک یہ تذکرے دنیا میں باقی رہیں گے کوئی غم حسینؑ کو مٹا نہیں سکتا ہے۔ پروردگار نے اپنے حسینؑ سے وعدہ کیا ہے۔ پیغمبرؐ نے اپنی بیٹی زہراؑ سے وعدہ کیا ہے کہ ایسی قومیں پیدا ہوتی رہیں گی اور غم حسینؑ زندہ رہے گا۔ اتنا بڑا مجمع جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے یہ بھی انسان ہیں انھیں بھی رات کو نیند آتی ہے۔ آخر سال بھر رات کو آرام ہی کرتے ہیں مگر ساری رات گذرنے کو آگئی ہنگام فجر قریب آگیا مگر صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جاگ رہے ہیں۔ ماتم بھی کر رہے ہیں آنسو بھی بہا رہے ہیں مگر عزیزو! یہ سارے آنسو بھی اگر جمع کر لئے جائیں تو اس مظلومیت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہیں۔ ایک مادر حسینؑ کا گریان سب پر بھاری ہے کوئی صف عزا بچھی کوئی دوسرا اس پر جائے نہ جائے فاطمہ زہراؑ اس پر موجود ہیں۔ دست دعا اٹھائے ہوئے ہیں۔ پروردگاران آوازوں پر رحم کرنا، پروردگاران آنسوؤں پر رحم کرنا۔ یہ آنسو ضائع نہ ہونے پائیں گے۔ یہ رومال کس دن کے واسطے ہے اَجْرُکُمْ عَلَی اللّٰہِ خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غم آل محمدؐ کے۔ بس یہ دو فقرے اور گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح پیغمبر اسلامؐ ہر معرکہ سے پہلے دعوت اسلام دیا کرتے تھے کربلا میں حسینؑ نے بھی شبیہ پیغمبرؐ کا انتخاب کیا کہ اس کے ذریعہ اتمام حجت ہو جائے۔ ذرا سوچئے کہ علیؑ اکبر کی حیثیت کربلا میں کیا ہے؟ بیبیوں کے درمیان کیا ہے؟ مردوں کے درمیان کیا ہے مفصل تذکرہ کا موقع نہیں ہے صرف ایک واقعہ آپ کو یاد دلادوں اور بات تمام ہو جائے۔ کربلا کے واقعہ کے بعد اہل حرم کو قیدی بنایا گیا۔ گیارہویں محرم کو یہ لٹا ہوا قافلہ کربلا سے چلا۔ سب سے پہلے یہ قافلہ کربلا سے آگے بڑھنے کے بعد کوفہ میں داخل ہوا۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ یہ دستور ہوتا ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی جلوس گذر رہا ہے یا کوئی قافلہ جارہا ہے تو ایک اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے خواتین میں کہ پشت بام پر جا کر بیٹھ کر دیکھیں کہ کیسا قافلہ ہے اور کون لوگ ہیں۔ پھر اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی نے ہمارے امیر کے خلاف خروج کیا تھا اور وہ مارا گیا ہے اور امیر کی فتح کا اعلان ہو رہا ہے تو اشتیاق اور بھی بڑھ جاتا ہے چنانچہ کوفہ کی عورتیں پشت بام پر آکر بیٹھ گئیں اور آنے والے قافلے کو دیکھنا شروع کیا سب سے آگے سرہائے شہدا۔ اس کے بعد ایک ناقہ پر ایک منظر اور ان کے ساتھ ایک کمسن بچی خاتون

کی نگاہ پڑ گئی اس نے دیکھا کہا یہ تو بچی پیاسی معلوم ہوتی ہے دیکھو اس کے چہرے کا رنگ کیسا ہو گیا ہے اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے ہیں۔ بس جیسے ہی بچی نے یہ فقرہ سنا کہا پھوپھی اماں اگر آپ اجازت دیں تو ہم ان کو بتائیں کہ ہم کتنے پیاسے ہیں۔ ہم انھیں بتائیں کہ ہم کب سے پیاسے ہیں۔ خاتون نے کہا بی بی آپ کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے آپکی پیاس کا حال تو ہمیں معلوم ہے۔ دوڑ کر گئی پانی لے کر آئی اور پانی سامنے رکھ کر کہا اس پانی کو پی لیجئے مگر ہمارے حق میں دعا کیجئے گا۔ کہا بتایئے کیا دعا کرانا ہے؟ کہا پہلی دعا تو یہ کیجئے کہ خدا نہ کرے کہ کسی کے بچے اس طرح یتیم ہوں جیسے یتیمی کا دور آپ لوگوں کو دیکھنا پڑا ہے۔ اس کے بعد کہا اور کوئی دعا۔ کہا دوسری دعا یہ ہے کہ آپ دعا کر دیں کہ خدا ہمیں مدینہ پہنچا دے۔

کہا تمہارا مدینہ سے کیا تعلق ہے۔ تم مدینہ جا کر کیا کرو گی؟۔

اس خاتون نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مدینہ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے؟ مدینہ میں میرا شہزادہ حسینؑ رہتا ہے۔ مدینہ میں میری شہزادی زینبؑ رہتی ہیں۔ بس ثانی زہراؑ سے برداشت نہ ہو سکا۔ فرمایا تیرا حسینؑ اور زینبؑ سے کیا تعلق ہے۔ کہا میں اس گھر کی خادمہ ہوں آپ مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں۔

کہا حسینؑ کو دیکھے گی تو پہچان لے گی۔ کہا کیوں کیا میں احسان فراموش ہوں کیسے نہ پہچانوں گی۔ کہا مگر تو نے پہچانا نہیں۔ یہ سننا تھا کہ اس خاتون نے بے چین ہو کر کہا بی بی آپ کیا کہہ رہی ہیں میں نے پہچانا نہیں۔ فرمایا وہ دیکھ نوکِ نیزہ پر تیرا حسینؑ ہے اور پہچاننا چاہتی ہے تو پہچان لے یہ تیری زینبؑ ہے۔

ارے شہزادی یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں کہا میرا بھیا کربلا میں مارا گیا اور ہمیں قیدی بنا کے لایا گیا ہے۔ عورتیں بے چین ہو گئیں۔ ہر ایک کو اشتیاق ہے کہ یہ قافلہ کیسا ہے اس میں کون کون افراد ہیں۔ قافلہ گذر رہا تھا کہ ایک ایک عورت ایک ایک شہید کے سر کو دیکھ رہی ہے ارے ہم سے کہا گیا تھا کہ یہ خارجی ہیں۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ یہ باغی ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر تو سجدہ کے نشان ہیں۔ ان کے چہروں پر تو نور سا طلع ہے یہ باغی اور خارجی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس درمیان ایک

عورت کی نظر ایک جوان کے سر پر پڑ گئی، دل تڑپ گیا۔ کہنے لگی اے کاش جب یہ جوان مارا گیا ہو تو اسکی ماں زندہ نہ ہو کہ وہ اس منظر کو نہیں دیکھ سکتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک معظمہ نے یہ فقرہ سن لیا اور تڑپ کر کہا اے بی بی۔ وہ دکھیا ماں میں ہوں جس کا جوان کربلا میں مارا گیا اور اب یہ سر میرے آگے چل رہا ہے آگے آگے سر شبیہ پیغمبرؐ اور پیچھے پیچھے پشت ناقہ پر پالنے والی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

□□

مجلس ۱۲

مجلسِ شامِ غریباں

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُونَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ.

نٓ قسم ہے قلم اور تحریروں کی، پیغمبرؐ آپ اپنے رب کی نعمتوں کی بنیاد پر مجنون اور دیوانے نہیں آپ کے لیے وہ اجر ہے جس کا سلسلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور آپ بلند ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور یہ ظالم بھی دیکھ لیں گے کہ مجنون اور دیوانہ کون ہے۔

آغازِ محرّم کے ساتھ فضائل و رذائل کے عنوان سے اسلامی اخلاقیات سے متعلق جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ آج اس سلسلے کی یہ آخری مجلس ہے۔ "مجلسِ شامِ غریباں"

اسلام ایک اخلاق کا مکمّل پیغام لے کر آیا۔ رذائل میں گھرے ہوئے انسان کو منزلِ فضائل تک لے جانے کے لیے عظیم ترین نظام لے کر آیا۔ اس نے دنیا کو یہ سمجھانا چاہا کہ اخلاق انسانیت کی پہچان ہے۔ اخلاق بشریت کی جان ہے۔ اخلاق معاشرہ کے لیے باعثِ سکون و اطمینان ہے۔ اخلاق زندگی کے جس شعبہ میں داخل ہو جائے اس شعبہ کی اصلاح ہو جائے۔ اخلاق

جب انسان کی انفرادی زندگی میں داخل ہوتا ہو تو انسان کو منزل کمال تک پہنچا دیتا ہے اور جب اقتصادی دنیا میں آتا ہے تو مساوات کا سبق سکھاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اخلاق انسان کو حقوق کی پابندی کا سبق سکھاتا ہے اور سیاسی دنیا میں شریفانہ برتاؤ کا درس دیتا ہے۔

اخلاق انسانی زندگی کے تزکیہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کی اصلاح کے لیے اخلاقیات کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔

اسلام پیغام اخلاق تھا لہٰذا سرکار دو عالمؐ کی بعثت کا مقصد بھی مکارم اخلاق کی تکمیل تھا حضورؐ نے اپنی تعلیمات میں زندگی کے کسی شعبہ کو نظر انداز نہیں کیا اور انسان کو کمال اخلاق سے آشنا بنایا سرکار کی تعلیمات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی فضائل اور انسانی کمالات کس طرح حاصل کیے جا سکتے ہیں اور وہ کون سے کمالات ہیں جہاں تک جانے کے بعد انسان کامل انسان کہے جانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انسانی فکر کے کمال کا نام ہے یقین اور انسانی عقیدہ کے کمال کا نام ہے توحید۔

انسانی زبان کا کمال ہے صداقت اور انسانی نیت کا کمال ہے اخلاص۔

انسان کے دل کے کمال کو شجاعت کہا جاتا ہے اور انسانی اعضاء و جوارح سے ظاہر ہونے والے اخلاقیات کا نام ہے تواضع۔ اور اسلام انھیں ساری تعلیمات کے مجموعہ کا نام ہے اور اللہ نے اپنے حبیب کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ تلاوت آیات کے ذریعہ ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بنائیں اور یہ نفس اس وقت تک پاکیزہ نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس میں یقین نہ آجائے جب تک فکر کا جذبہ پیدا نہ ہو جائے۔

ان سارے تعلیمات کا پیغام لے کر سرکار دو عالمؐ اسی لیے آئے تھے کہ اس دور کا انسان رذائل میں ڈوبا ہوا تھا۔ عیوب اور نقائص اور برائیوں میں غرق تھا۔ یہ پیغمبرؐ کا جگر اور ان کا دل ہی جانتا ہے کہ آپ نے کس طرح جانوروں کو انسان، انسانوں کو مسلمان اور صاحب ایمان بنایا ہے کہ وہ لوگ جو جانوروں کے درمیان زندگی گذار رہے تھے انھیں بزم رسالت میں بیٹھنے کے قابل بنا دیا اور وہ لوگ جو غارت گری کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے انھیں راہ خدا میں جان

دینے کا حوصلہ دے دیا۔ دوسروں کو لوٹنے والوں کو اپنا گھر لٹانے کا سبق دے دیا اور انسانی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔

مگر باطل اور کفر و شرک کی طاقتیں وقت کا انتظار کر رہی تھیں کہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ جب انسانی زندگی میں اُدنی اخلاپیدا ہو جائے اور دوبارہ پھر رذائل کو بر سر کار لایا جاسکے۔

چنانچہ سرکار دو عالمؐ کے انتقال کے بعد بلا فاصلہ دنیا کو یہ موقع مل گیا اور کفر پھر دوبارہ سر اٹھانے لگا۔ باطل آگے بڑھنے لگا اور بد اخلاقی پھر منظر عام پر آگئی۔

رذائل اس منزل پر آگئے کہ سوتیلی ماں کے ساتھ بدکاری بھی خلافت کا شعار بن گئی۔ بے گناہ انسانوں کا خون بہانا بھی اقتدار کا کمال بن گیا اور بیت المال مسلمین کو لوٹنا اقتدار کا بہترین کمال قرار دیدیا گیا۔

اس وقت وہ دین جس کو پیغمبرؐ لے کر آئے تھے، وہ اسلام جس کو سرکارؐ دو عالم نے پیش کیا تھا اور وہ پیغام اخلاق جس کو معلم اخلاق حضور سرور کائنات نے پیش کیا تھا وہ حسرت سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ ہے کوئی جو مجھے بچالے، ہے کوئی جو مجھے سہارا دے دے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اقتدار کے سامنے کھڑے ہونے کا دم کسی میں نہیں تھا۔ کفر کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ مگر جس کے بارے میں نبیؐ خود کہہ گئے تھے حُسَینٌ مِنّی وَاَنَا مِن حُسَینٍ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اس نے جب نانا کے دین کا زوال دیکھا تو کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور آواز دی اے نانا کے دین! اے پیغام اخلاق و آگہی اے پیغام فضیلت انسانی! جب تک میں زندہ ہوں تجھے برباد نہ ہونے دوں گا۔

حسینؑ اس عزم کو لے کر اٹھے اور وہ سارے کمالات اپنے ساتھ لے کر اٹھے جو دنیائے اخلاق کے عظیم ترین کمالات تھے۔ کربلا درحقیقت انھیں فضائل و رذائل کا ایک معرکہ تھا جہاں ایک طرف اخلاق کی دنیا تھی اور دوسری طرف بد اخلاقی کا عالم تھا۔ اِدھر یقین کے مجسمے اُدھر شک کے پیکر۔ اِدھر وفا ہی وفا، اُدھر جفا ہی جفا۔ اِدھر صداقت والے اُدھر غلط بیانی کرنے والے۔ اِدھر اخلاص والے، اُدھر ریاکاری والے۔ اِدھر بہترین کمالات والے اُدھر بدترین صفات والے

حسینؑ ابن علیؑ اس چھوٹے سے قافلہ کو لے کر چلے جو فضائل کا مجسمہ تھا۔ اخلاقیاتِ اسلامی کا مرقع تھا۔ اسلامی تعلیمات کا نمونہ تھا اور آواز دی کہ اگر اب بھی اسلام کو پہچاننا ہو تو آؤ اور مجھے دیکھو میرے چاہنے والوں کو دیکھو اور حساب لگاؤ کہ اگر آج دنیا میں اسلام زندہ ہے، اخلاق باقی ہے فضیلت زندہ ہے تو میرے اور میرے اصحاب کے کردار میں زندہ ہے۔ تمہیں منزل یقین دیکھنا ہے تو ادھر آکے دیکھو یقین ان کے پاس نہ ملے گا تو کہاں ملے گا۔ جو جیتے جی اپنی منزلوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں دیکھو حبیب یہ تمہاری جگہ ہے، مسلم یہ تمہاری جگہ ہے، زہیر یہ تمہاری منزل ہے، بریر یہ تمہارا مقام ہے جس نے جیتے جی جنت میں اپنا مقام دیکھ لیا ہو اس سے زیادہ منزل یقین پر کون فائز ہو سکتا ہے اور اگر دنیا میں کسی کو یقین نہ پیدا ہو سکے تو کڑیل جوان بیٹے کے سرہانے آکے دیکھے کہ جب باپ سرہانے آیا تو علیؑ اکبر نے کہا کہ بابا آپ پریشان نہ ہوں دادا جام کوثر لے کر آگئے ہیں۔ یعنی دنیا کی نگاہ میں جام کوثر ایک عقیدہ بنا ہوا تھا۔ جنت کا خیال ایک عقیدہ بنا ہوا تھا علیؑ اکبر نے اس منزل یقین کا مشاہدہ کر لیا جہاں علم الیقین عین الیقین میں تبدیل ہو گیا۔

اب اگر توحید کا مرقع دیکھنا ہے تو کربلا کے میدان میں آکر دیکھو جہاں ساری دنیا ٹھکرائی جا رہی ہے مگر سجدۂ معبود نہیں چھوڑا جا رہا ہے۔

تَرَکْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِی هَوَاکَ وَاَیْتَمْتُ الْعِیَالَ لِکَیْ اَرَاکَ

پروردگار میں نے تیری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دیا میں نے بچوں کی یتیمی کو برداشت کر لیا کہ تیری بارگاہ میں حاضری دے کر تیرا جلوہ دیکھ لوں۔

فَلَوْ قَطَّعْتَنِیْ فِی الْحُبِّ اِرْبًا لَمَا حَنَّ الْفُؤَادُ اِلٰی سِوَاکَ

اے معبود اگر تیری محبت میں میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیے جائیں تو میرا دل تیرے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں جھک سکتا ہے۔ یہ ہیں توحید اور عقیدۂ توحید کے مرقع۔ ان کی وفا کو دیکھنا ہے تو اس انداز سے دیکھو کہ ایک سر کا وعدہ کیا تھا اور بہتر سر قربان کر دیے۔

ان کی صداقت لہجہ کو دیکھنا ہے تو یاد رکھو کہ زندگی کی آخری سانس میں جو فقرہ حسینؑ بن علیؑ کی زبان پر آیا تھا وہ فقرۂ صداقت تھا جب شمر خنجر لے کر سامنے آیا اور حسینؑ نے ایک مرتبہ شمر کو دیکھا

تو آواز دی صَدَقَ جَدّی رَسُولُ اللّٰہ میرے جد نے سچ کہا تھا۔
شمر نے کہا حسینؑ یہ تمہیں نانا کیوں یاد آ گئے۔ تم نے پیغمبرؐ کی صداقت کا کیوں اعلان کیا؟ فرمایا۔ میرے نانا نے میرے قاتل کی جو علامتیں بتائی تھیں وہ سب تیرے اندر پائی جاتی ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ نفس مطمئن اپنے رب کی بارگاہ میں چلا جائے۔

کربلا در حقیقت سارے فضائل اور سارے کمالات کا مرقع ہے کہ دنیا کا کوئی کمال ایسا نہیں ہے جو مجسم ہو کر سامنے نہ آ گیا ہو۔ یہاں کی شجاعت کو اگر دیکھنا ہو تو چاہے بزرگوں کو دیکھو، چاہے جوانوں کو دیکھو اور چاہے چھ مہینے کے بچہ کو دیکھو چاہے ان بے کس بیبیوں کو دیکھو جن کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا مگر ان کی ہمت قلب میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ کس بیبیاں ہیں مگر دربار ابن زیاد میں آ جائیں تو ابن زیاد کو ٹوکنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہوں۔ دربار یزید میں آ جائیں تو یزید کو ٹوکنے اور سر دربار تقریر کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہوں۔

ایسے مرقع کمالات کی دنیا میں کہاں ملیں گے۔ کربلا میں حسینؑ نے ان سارے مرقعوں کو جمع کر لیا تھا۔ اسی لیے حسینؑ ابن علیؑ کو حق تھا کہ یہ اعلان کریں کہ وَاللّٰہِ اِنّی لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفیٰ مِنْ اَصْحَابِی خدا کی قسم میرے علم میں میرے اصحاب سے زیادہ وفادار کسی کے اصحاب نہیں ہیں اور میرے اہل بیت سے زیادہ صاحبِ کردار کسی کے گھر والے نہیں ہیں۔ مگر یہ اعلان کل کی رات ہوا تھا۔ یہ اعلان حسینؑ نے عاشورہ کی رات کیا تھا جب سامنے مسلم تھے، حبیبؑ تھے زہیرؑ تھے بریرؑ تھے اور ایسے ایسے چاہنے والے تھے کہ جب حسینؑ خیمے کے اندر آئے اور بہن نے پوچھ لیا کہ بھیا کیا طے ہوا اور حسینؑ نے کہا کہ بہن یہ زندگی کی آخری رات ہے کل قربانیوں کا دن ہے۔ کل آل محمدؐ حق و صداقت کی راہ میں قربان ہو جائیں گے تو ایک مرتبہ بہن کی زبان پر فقرہ آ گیا بھیا کیا آپ نے اپنے ساتھیوں کو آزما لیا ہے؟ کیا آپ نے اپنے ساتھیوں کا امتحان لے لیا ہے ایسا نہ ہو کہ کل آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

چاہنے والا جو در خیمہ پر بیٹھا تھا اس نے بہن اور بھائی کی گفتگو کو سنا اور ایک مرتبہ بے قرار ہو کر خیمۂ اصحاب میں آیا۔ آ کے آواز دی حبیب زہیر بریر ہماری زندگی کا کیا فائدہ؟ اگر دختر زہراؑ کو

ہم پر اعتبار نہیں ہے جیب بے چین ہو گئے نافع کیا خبر؟ کہا میں در خیمہ پر بیٹھا ہی تھا کہ شہزادی زینبؑ ماںجائے سے گفتگو کر رہی تھیں۔ ایک مرتبہ فرمایا بھیا کیا آپ نے اپنے ساتھیوں کو آزما لیا ہے کہیں ایسا تو نہ ہو کہ آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ بس یہ سننا تھا کہ اصحاب نے نیاموں سے تلواریں نکال لیں۔ نیاموں کو توڑ توڑ کر پھینک دیا اور در خیمہ پر آ کر آواز دی۔ نبیؐ کے لال حسینؑ نے چاہنے والوں کی آواز سنی دوڑ کر در خیمہ پر آ گئے خیر تو ہے میرے چاہنے والو! یہ برہنہ تلواریں کیسی؟ یہ بیقراری کا عالم کیسا؟ کہا مولا۔ ہم نے سنا ہے کہ شہزادی کو ہماری وفا پر اعتبار نہیں ہے۔ آپ شہزادی تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ یا ہم غلاموں پر اعتبار کریں یا آپ ہم کو اجازت دے دیں۔ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی گردنیں کاٹ لیں گے۔ ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ دختر زہراؑ کو ہماری وفا پر اعتبار نہ ہو۔

حضرت امام حسینؑ نے فرمایا کہ چاہنے والو! اگر تمہارا اعتبار نہ ہو گا تو کس کا ہو گا اور اعتبار بھی کیسا اعتبار کہ دنیا میں ہر انسان کو اپنے چاہنے والوں کا اعتبار ان کی زندگی تک ہوتا ہے لیکن حسینؑ کو اپنے چاہنے والوں کا اتنا اعتبار تھا کہ جب سب سر کٹا کے سو گئے تو بھی در خیمہ پر آواز دے رہے تھے یَا اَبْطَالَ الصَّفَا وَیَا فُرْسَانَ الْهَیْجَا اے میرے شیرو! اے میرے جانبازو! یہ کیا ہو گیا ہے حسینؑ پکار رہا ہے اور کوئی لبیک نہیں کہہ رہا ہے میں تمہیں آواز دے رہا ہوں اور تم میری آواز پر آواز نہیں دے رہے ہو۔ عابدؑ بیمار فرماتے ہیں کہ جب بابا نے شہیدوں کی لاشوں کو آواز دی تو شہیدوں کے لاشے مقتل پر تڑپنے لگے اور کٹی ہوئی گردنوں سے آواز آئی۔ مولا اگر موت درمیان میں حائل نہ ہو گئی ہوتی تو ہم اب بھی جذبۂ قربانی رکھتے ہیں۔

اللہ یہ منظر وفا جس بہن نے دیکھا ہو اور اس شانِ وفا کا جس بہن نے مشاہدہ کیا ہو جب تھوڑی دیر کے بعد مقتل میں آواز گونجے اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا تو وہ کیسے آواز دے۔ اب تو کوئی مقتل سے آنے والا نہیں ہے۔ نہ قاسمؑ رہ گئے نہ عباسؑ رہ گئے نہ علی اکبرؑ۔ ایک بیمار بھتیجہ ہے جس کو حسینؑ بہن کے حوالے کر گئے ہیں۔ تڑپ کے خیمہ کے اندر آئیں۔ بیمار کا شانہ ہلایا۔ عابدؑ بیمار آنکھیں کھولو۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ کہا پھوپھی اماں

کیا خبر لے کر آئی ہیں۔ فرمایا بیٹا فضا میں ایک آواز گونج رہی ہے کہ زینبؑ بن بھائی کی ہوگئی۔ تم یتیم ہوگئے۔ کوئی کہتا ہے حسینؑ مارے گئے۔ میرا بچایا مارا گیا۔ کہا پھوپھی اماں ذرا خیمہ کا پردہ اٹھایئے میں دیکھوں کہ میرے بابا پر کیا گذر گئی۔ ثانی زہراؑ نے بڑھ کر خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ اب جو بیمار نے سنبھل کر دیکھا تو کیا دیکھا کہ نیزۂ طویل پر باپ کا سر۔ آواز دی السلام علیک یا ابا عبد اللہ

بابا یتیم بیٹے کا سلام لے لو بابا

یہ سلام پیش کر کے غش میں گر گئے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ پھر ثانی زہراؑ نے شانہ ہلایا۔ کہا پھوپھی اماں اب کیا خبر لے کر آئی ہیں۔ کہا بیٹا دیکھو خیموں میں آگ لگی ہوئی ہے خیمے جل رہے ہیں۔ اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کہا پھوپھی اماں آپ تو جانتی ہیں جان بچانا واجب ہے اب جلتے خیموں سے باہر نکلئے۔ عزادارو! سیدانیوں کے لیے خیموں سے باہر نکلنا کتنا سخت مرحلہ تھا۔ اس کا اندازہ مقتل کربلا کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ حسینؑ کے گھرانے کی ایک بچی مولا کے مقتل میں جانے کے بعد در خیمہ پر کھڑی انتظار کر رہی ہے کہ مولا پلٹ کر آئیں گے۔ یہ منظر دیکھا کہ کچھ ظالم ہیں جو شعلیں لے کر آرہے ہیں اور کچھ سوار ہیں جو خیموں کو جلانے کے لیے آرہے ہیں پھر ایک مرتبہ دیکھا کہ اچانک خیموں میں آگ لگ گئی اور ایک ظالم نیزہ لیے ہوئے اس بچی کی طرف بڑھا۔ بچیؑ نے ظالم کو نیزہ لے کر بڑھتے ہوئے دیکھا تو اب کس کی پناہ میں جائے۔ اب تو عباسؑ بھی نہیں ہیں کس کو پکارے۔ اب تو حسینؑ بھی نہیں ہیں۔ اب تو علیؑ اکبرؑ بھی نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ آواز دی پھوپھی اماں! ظالم آرہے ہیں۔ پھوپھی اماں مجھے بچاؤ۔ ابھی زینبؑ تک بچی نہ پہنچ سکی تھی کہ ظالم نے پشت میں اس زور سے نیزہ چبھویا کہ بچی غش کھا کر زمین پر گر پڑی اور جب خیموں سے بیبیوں کے نکلنے کا وقت آیا تو ایک مرتبہ ثانی زہراؑ نے فرمایا بیٹا اب یہ خیمے میں لیٹنے کا وقت نہیں ہے۔ خیمے جل رہے ہیں۔ چلو چلو خیموں سے باہر نکل چلیں۔ بچی نے آنکھ کھولی کہا پھوپھی اماں کیسے جاؤں سر پر چادر بھی نہیں ہے۔ اب جو سیدانیاں نکلیں ناشرات الشعور لاطمات الوجوہ سر کے بال بکھرے ہوئے منہ پر طمانچے مارتی ہوئی وامحمداہ واعلیاہ۔ ہائے کوئی پیغمبرؐ کے دل سے پوچھے جس کو نواسیاں پکار رہی ہیں کوئی حیدرؑ کرار کے دل سے پوچھے جس کو بیٹیاں آواز دے رہی ہیں۔

تو عزیزو! جلتے خیموں سے سیدانیاں باہر نکل آئیں مگر راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ شہزادی زینبؑ انہیں خیموں میں کبھی جاتی ہیں اور کبھی واپس آجاتی ہیں۔ بار بار انہیں جلتے ہوئے خیموں کے اندر جاتے اور پھر باہر آتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے کہا بی بی کیا آپ کا کوئی قیمتی سامان ان خیموں کے اندر رہ گیا ہے کہ آپ جلتے ہوئے خیموں کے اندر چلی جاتی ہیں کہا مال دنیا میں کچھ نہیں ہے میرے بھیا کی ایک امانت ہے۔ بھیا نے چلتے چلتے اپنے بیمار کو میرے حوالے کیا تھا۔

راوی کہتا ہے کہ اب جو میں نے دیکھا تو دیکھا کہ زینبؑ جلتے خیمے سے باہر آئیں اور ایک بیمار کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے آواز دے رہی ہیں کہ بھیا گواہ رہئے گا کہ میں آپ کے لال کو جلتے خیموں سے بچا کر لے آئی۔

شہزادی نے بی بیوں کو، بچوں کو، یتیموں کو، بیکسوں کو جلے ہوئے خیموں کی راکھ پر خاکستر پر بٹھا دیا۔

ایک مرتبہ فضہ دوڑتی ہوئی آئیں۔ بی بی بڑے غضب کی خبر لے کر آئی ہوں۔ ایک بڑے قیامت کی خبر لے کر آئی ہوں، ایک قیامت خیز خبر لے کر آئی ہوں۔ فرمایا۔ فضہ بتاؤ کیا خبر لے کر آئی ہو۔ کہا شہزادی ذرا دل کو سنبھالئے تو بتاؤں۔ فرمایا فضہ بتاؤ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اب میرے واسطے کوئی مصیبت مصیبت نہیں ہے۔ میں نے اکبر کا چھدا ہوا کلیجہ دیکھ لیا۔ میں نے اصغر کا گلا دیکھ لیا۔ قاسم کا پامال لاشہ دیکھ لیا۔ اپنے بھیا کا سر بھی نیزہ پر دیکھ لیا۔ جلتے خیمے بھی دیکھ لیے۔ اب میرے واسطے کوئی مصیبت مصیبت نہیں ہے بتاؤ کیا خبر لے کر آئی ہو۔ کہا بی بی۔ میں نے سنا ہے کہ ابن سعد کہہ رہا ہے کہ گھوڑوں کی نعل بندی کی جائے۔ کہا فضہ یہ کیا خبر لائی ہو۔ کہا بی بی ایسا لگتا ہے کہ اب میرے شہزادے کا لاشہ پامال کیا جائے گا۔ اب زینبؑ ہیں اور بے کسی۔ فرمایا فضہؑ اب میں کیا کروں۔ کہا بی بی مجھے معلوم ہے کہ اس جنگل میں ایک شیر رہتا ہے۔ میں جاتی ہوں، اور جا کر لمبے آواز دیتی ہوں۔ شاید وہ آڑے وقت میں کام آسکے۔ فضہ آگے بڑھیں صحرا کا رخ کیا۔ آواز دی۔ اے ابوالحارث بڑا نازک وقت آگیا ہے نبیؐ کے لال کا لاشہ پامال ہونے والا ہے۔ اب کوئی بچانے

والا نہیں ہے۔ ایک مرتبہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک شیر صحرا سے برآمد ہوا اور ایسے نازک وقت میں لاشِ حسینؑ کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ کس کی مجال کہ میرے مولا کے لاشہ کو پامال کرسکے ظالم بھاگے اور شیر مطمئن ہوکر پلٹ گیا لیکن جیسے ہی شیر واپس ہوا اور ظالموں نے دیکھا کہ لاشِ حسینؑ اکیلی رہ گئی ہر ایک مرتبہ سوار پلٹے اور اِدھر کے سوار اُدھر۔ اُدھر کے سوار اِدھر۔ زہراؑ کے لال کا لاشہ پامال ہو گیا زینب نے تڑپ کر آواز دی۔ نانا یہ آپ کا حسینؑ، اماں یہ آپ کا لال جسے آپ نے چکی پیس پیس کر پالا تھا۔ اس حسینؑ کا لاشہ صحرائے کربلا میں پامال ہو گیا۔

سَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ

□□

گناہ

(۱) بدترین گناہ وہ ہے جس کا انجام دہندہ اسے ہلکا سمجھے۔

(۲) ترک گناہ، طلب توبہ سے زیادہ آسان ہے۔

(۳) مجھے ایسے گناہ کی پرواہ نہیں جس کے بعد مجھے اتنی مہلت مل جائے کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں اور اللہ سے عافیت مانگ لوں۔

(۴) حرص و حسد اور تکبر گناہوں میں ڈوب جانے کے باعث ہوتے ہیں۔

(۵) دنیا میں صرف دو طرح کے لوگوں کی بھلائی ہے: ایک وہ جس نے گناہ تو کیا مگر توبہ کے ذریعے اس کا تدارک بھی کر لیا اور دوسرا وہ جس نے نیک کاموں میں جلدی کی۔

(۶) تم ایسے گناہ کی عذر خواہی سے بچو جسے ترک کرنے کا تمہارے پاس کوئی راستہ موجود ہو کیونکہ عذر خواہی کی سب سے اچھی حالت یہ ہے کہ تم اس کے بعد گناہوں سے سلامتی کی منزل پر پہنچ جاؤ۔

(۷) بڑے بڑے گناہوں کے کفاروں میں ستم زدہ کی فریاد رسی اور پریشان حال لوگوں کو آرام پہنچانا ہے۔

(۸) گناہ کے علاوہ دوسری چیزوں میں زیادہ سرزنش نہ کرو۔

(۹) کتنے ایسے ہیں جو برابر گناہ کرتے رہتے ہیں مگر آخر عمر میں انہیں توفیق توبہ حاصل ہو جاتی ہے۔

(۱۰) گناہ سے مایوس نہ ہو جبکہ باب توبہ کھلا ہوا ہے۔

(۱۱) اپنے پروردگار کے علاوہ کسی اور سے پرامید نہ ہو اور اپنے گناہوں کے

علاوہ کسی اور سے خوفزدہ نہ رہو۔

(۱۲) گناہگار کی کامیابی کیلئے بس یہی کافی ہے کہ اس کیلئے کوئی شفیع موجود ہے۔

(۱۳) معذرت کی تکرار گناہوں کی یاددہانی ہے۔

(۱۴) چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں، گناہ پر گناہ کئے جانا، احمق سے بحث اور کٹ حجتی کرنا، عورتوں سے زیادہ میل جول رکھنا اور مردوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا آپ سے پوچھا گیا" یہ مردے کون ہیں؟" تو آپ نے فرمایا" نعمتوں میں مست رہنے والا ہر بندہ۔"

(۱۵) چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو کیونکہ یہ چھوٹے گناہ ہی بڑے گناہوں کی طرف بلاتے ہیں۔

(۱۶) عاقل کی ساری کوشش ترک گناہ اور عیبوں کی اصلاح کرنے میں صرف ہوتی ہے۔

(۱۷) انسان کا اپنے عیوب سے لاعلم ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔

(۱۸) اے گناہ پر گناہ کئے جانے والے! تیرا باپ (جناب آدمؑ) صرف ایک گناہ کی وجہ سے جنت سے نکال دیا گیا تھا۔

(۱۹) کوئی بھی شخص رات میں گناہ نہیں کرتا جز یہ کہ صبح ہوتے ہی وہ رسوائی کا سامنا کرتا ہے۔

(۲۰) گناہوں کو چھوڑ دو قبل اس کے وہ تمہیں چھوڑ دیں۔

(۲۱) گناہگار کا شفیع اس کا اقرار اور اس کی توبہ اس کی عذر خواہی ہوتی ہے۔

(۲۲) اعتراف کے ساتھ کوئی گناہ نہیں ہے۔

(۲۳) قلت کلام عیوب کو چھپا دیتی ہے اور گناہوں کو کم کر دیتی ہے۔

(۲۴) آنسو صرف قساوت قلب کی وجہ سے خشک ہوتے ہیں اور قسی القلبی صرف گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔

(۲۵) گناہ تین طرح کے ہیں: بخش دیا جانے والا گناہ، نہ بخشا جانے والا گناہ اور ایک وہ گناہ جس کے لئے بخش دیئے جانے کی امید اور عذاب پانے کا خوف لاحق ہو۔ بخش دیئے جانے والے گناہ وہ ہیں جن کے لئے اللہ نے اپنے بندوں کو دنیا میں سزا دی ہو اور اللہ اس بات سے بہت بڑا ہے کہ ایک ہی گناہ کے لئے دو دفعہ سزا دے اور وہ گناہ جو ناقابل بخشش ہوتے ہیں وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہے اور تیسرا گناہ وہ ہے جسے اللہ نے مخلوقات سے پوشیدہ رکھ کر اس گناہ گار کو توفیق توبہ عطا کر دی ہو اس گناہگار کے شب روز امید و خوف کے عالم میں گزرتے ہیں اور ہم بھی اس گناہگار کے لئے اسی طرح ہیں، ہم بھی اس کی مغفرت کے امیدوار اور عقاب سے خائف ہیں۔

(۲۶) لوگوں کی گناہوں کے ذریعے موت، قضا و قدر کے باعث ہونے والی اموات سے زیادہ ہوتی ہے۔

(۲۷) گناہ کا اقرار کرنے والا تائب ہوتا ہے۔

(۲۸) گناہ ایک ایسا مرض ہے جس کی دوا استغفار ہے اور وہ اس گناہ کو نہ دہرانا اس کی شفا ہے۔

(۲۹) اللہ اس بندے پر رحم کرے جو اپنے گناہوں سے ہوشیار اور اپنے رب سے خائف رہتا ہے۔

(۳۰) (تباہی کے) گرداب میں پھنسانے والے اور (اللہ کو) غضبناک کرنے والے گناہوں سے پرہیز کرو۔

گمان

(۱) کسی ایسی بات میں سوء ظن نہ کرو جو کسی نے غلط کہا ہو مگر تم اس کے لئے کوئی اچھا احتمال پاتے رہے ہو۔

(۲) جو اپنے آپ کو تہمت کی جگہوں پر رکھتا ہے اسے سوء ظن کرنے والے کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔

(۳) گمان پر بھروسہ کر کے فیصلہ کر دینا عدل نہیں۔

(۴) مومنوں کے گمانوں سے ڈرو کیونکہ اللہ نے انکی زبانوں پر حق قرار دیا ہے۔

(۵) جس نے تم سے اچھائی کا گمان کیا تم اس کے گمان کو سچ کر دکھاؤ۔

(۶) کنجوسی، بزدلی، حرص مختلف طبیعتیں ہیں جنہیں اللہ سے بدگمانی یکجا کرتی ہے۔

(۷) تم پر بدگمانی ہرگز غالب نہ آنے پائے کیونکہ یہ تمہارے اور تمہارے دوست کے درمیان کبھی صلح نہیں رہنے دے گی۔

(۸) عاقل کا گمان، پیش گوئی ہوتا ہے۔

(۹) تمہارا گمان تمہارے کسی ایسے دوست کو خراب نہ کر دے جسے تمہارے یقین نے "تمہارا" بنایا ہو۔

(۱۰) ڈھکے چھپے کام پر گمانوں کی یلغار اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک تم خود اسے عیاں نہ کر دو۔

(۱۱) ان میں سے نہ ہونا جن پر ان کا نفس گمان والی اشیاء کے ذریعہ غالب ہو جاتا ہے اور وہ اس پر یقینی اشیاء کے ذریعہ غالب نہیں ہو پاتے۔

عذاب

(۱) اس امت کے اچھے لوگوں کو (بھی) عذاب سے امان میں ہر گز نہ سمجھنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اللہ کے مکر سے نقصان اٹھانے والی قوموں کے علاوہ اور کون (اپنے آپ کو) امان میں سمجھے گا۔"

(۲) اس آگ سے ڈرو جس کا تلا گہرا، گرمی شدید اور عذاب ہر روز بدلتا رہتا ہے جو ایسا ٹھکانہ جہاں رحمت کا وجود نہیں ہوگا اور نہ وہاں کسی کی پکار سنی جائے گی اور نہ ہی کسی کی تکلیف کو ختم کیا جائے گا۔

(۳) برا اخلاق دو عذابوں میں سے ایک عذاب ہے۔

(۴) اللہ کے عذاب سے خوف زدہ رہنا متقی کا وطیرہ ہے۔

(۵) مظلوم و مصیبت زدہ کی یاوری کے ذریعے تم عذاب خدا سے بچ جاؤ گے۔

(۶) اللہ کے گھر کی زیارت عذاب جہنم سے امان ہے۔

(۷) احمق کی صحبت روحانی عذاب ہے۔

(۸) طولانی قنوت و سجدے جہنم کے عذاب سے نجات دے دیتے ہیں۔

(۹) لوگوں پر ظلم کرنے والا روز قیامت اپنے ظلم کی وجہ سے اوندھے منہ پڑا عذاب سہہ رہا ہوگا۔

(۱۰) جھوٹی قسم کھانے میں جلدی کرنے والا بھلا کیسے عذاب الہیٰ سے بچ سکتا ہے؟

(۱۱) جو مدد چاہنے والے کو پناہ دیتا ہے اللہ اسے اپنے عذاب سے بچا لیتا ہے۔

(۱۲) وہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتا ہے جس کے شر سے لوگ نہ بچے ہوں۔

(۱۳) اپنے نفوس کو عذاب الہیٰ سے، اطاعت خدا میں مبادرت کرکے بچاؤ۔

(۱۴) جہنم میں وارد ہونے والے ہمیشہ معذب رہیں گے۔

(۱۵) بڑی بعید بات ہے کہ ظالم اللہ کے دردناک عذاب اور عظیم سطوت سے بچ جائے۔

عاقبت

(۱) ہر آدمی کی عاقبت ہے چاہے شیریں ہو یا تلخ۔

(۲) جو بلا سوچے سمجھے معاملات میں کود پڑتا ہے وہ اپنے آپ کو بڑی عظیم مصیبتوں کے لئے پیش کر دیتا ہے۔

(۳) جھوٹ کا نتیجہ مذمت ہے۔

(۴) جو بہت زیادہ نتائج کی فکر کرتا ہے وہ کبھی شجاع نہیں بن سکتا۔

(۵) جھوٹ کا نتیجہ سب سے برا نتیجہ ہے۔

(۶) دور اندیش محتاط وہ ہے جسے نعمتوں کی مستی آخرت کے لئے عمل کرنے سے نہ روک سکے۔

(۷) دور اندیش ترین آدمی وہ ہے۔ جس کا اوڑھنا بچھونا، صبر اور غور و فکر ہو۔

(۸) دانا ترین آدمی وہ ہے نتائج کی سب سے زیادہ فکر کرے۔

(۹) نتائج پر دھیان رکھو گے تو ہلاکت خیزیوں سے بچے رہو گے۔

(۱۰) جو نتائج کی فکر کرتا ہے وہ سالم رہتا ہے۔

(۱۱) جو نتائج پر غور کر لیتا ہے وہ بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

(۱۲) دوستی و مسالمت کے نتائج سے زیادہ محفوظ کوئی اور نتیجہ نہیں ہے۔

(۱۳) ایسا ناپسندیدہ کام جس کی عاقبت قابل ستائش ہو اس محبوب کام سے بہتر ہے جس کے نتیجہ میں مذمت ہو۔

عمل

(۱) بلاشبہ مال واولاد دنیا کی کھیتی ہیں اور عمل صالح آخرت کی کھیتی ہے۔

(۲) ریاکاری اور دکھاوے کے بغیر عمل کرو کیونکہ جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے عمل کرتا ہے تو اللہ اسے اسی کے سہارے چھوڑ دیتا ہے۔

(۳) باخبر ہو جاؤ کہ تم لوگ امیدوں کے دنوں میں ہو جس کے بعد اجل ہے لہذا جس نے اپنی امیدوں کے دنوں میں اجل سے پہلے عمل انجام دیا تو یقیناً اسے اس کا عمل فائدہ پہنچائے گا اور اسے اس کی اجل نقصان نہیں پہنچا سکتی اور جس نے اپنی امیدوں کے دنوں میں اجل کے آنے سے پہلے کوتاہی کی تو بلاشبہ اس کا عمل گھاٹے میں رہا اور اسے اس کی اجل نقصان پہنچائے گی۔

(۴) تم میں سے عمل کرنے والے کو مہلت کے دنوں میں موت کی رکاوٹ سے پہلے فرصت کے لمحات میں مشغولیت سے پہلے اور سانس لینے کے زمانے میں گلا گھٹ جانے سے پہلے، نیک اعمال انجام دے لینے چاہیئے تاکہ وہ اپنے نفس و جان کی جگہ کے لئے کچھ تیاری کرلے اور اس کے ذریعے کوچ کرنے والی جگہ سے ٹھہرنے کی جگہ کے لئے کچھ زاد راہ لے سکے۔

(۵) اس دن کے لئے عمل کرو جس دن کے لئے تمام ذخیرے جمع کئے جاتے ہیں اور جس دن اسرار عیاں ہوں گے۔